بانی پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

ماھنامہ

حکیمُ الاُمّت

سرینگر

اکتوبر، نومبر، دسمبر 2024ء جلد: 19 شمارہ: 3، 4، 5 قیمت: -/60

خصوصی شمارہ
مرزا بشیر احمد شاکر

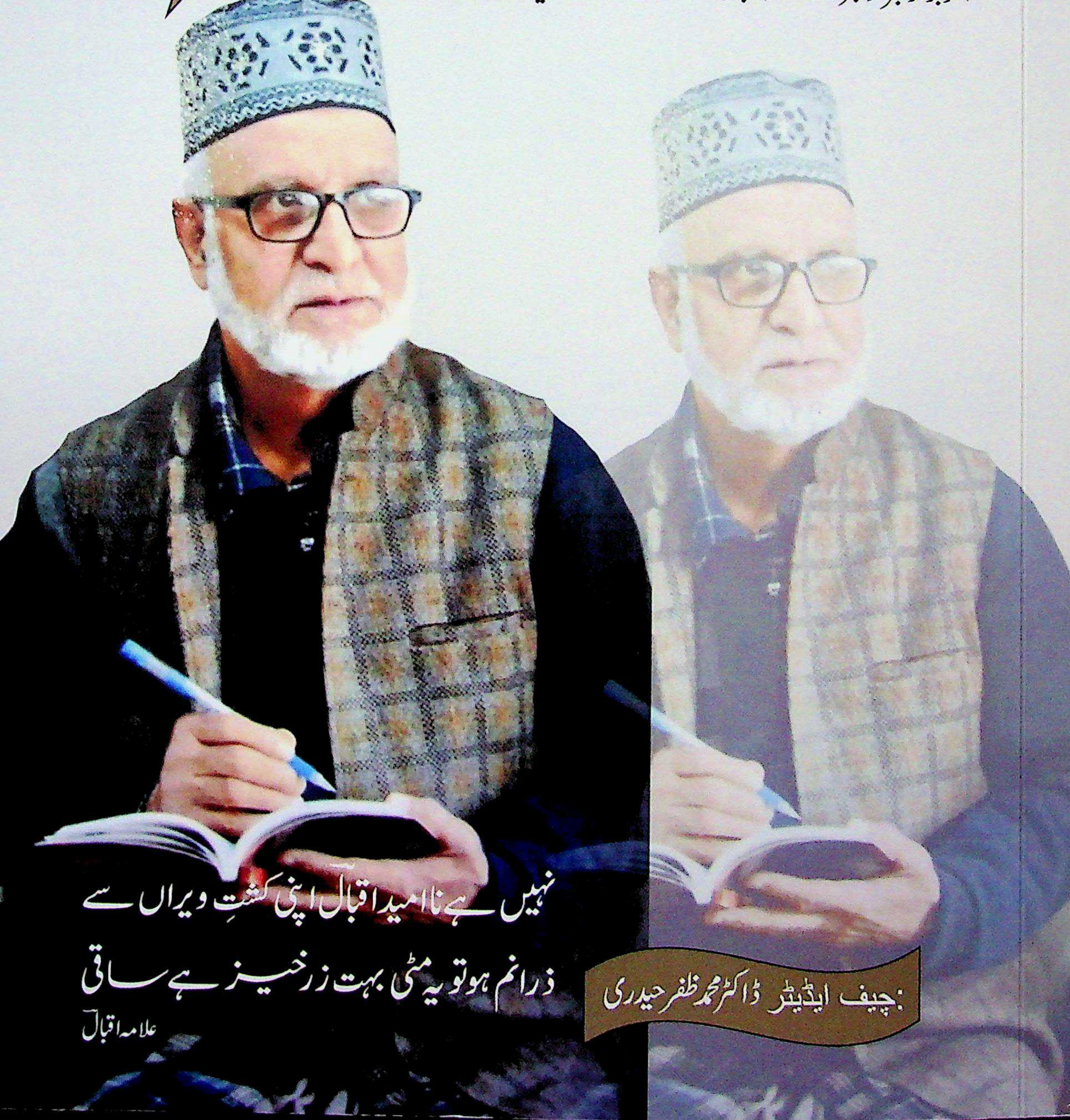

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

علامہ اقبالؔ

چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد ظفر حیدری

ماہنامہ

حکیم الامت

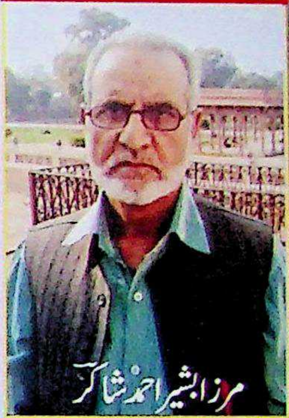

اکتوبر، نومبر، دسمبر 2024ء

ربیع الاول 1446ھ

جلد: 19 شمارہ: 3,4,5

بانی

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

ایڈیٹر

اونر، پرنٹر، پبلشر

ڈاکٹر محمد ظفر حیدری

کمپوزنگ

کہکشاں، افشاں، اظفر

ڈیزائن: ڈاکٹر محمد ظفر حیدری

مطبع: کراؤن پرنٹنگ پریس

مقام اشاعت وخط وکتابت کا پتہ

Hamdania Colony
Bemina, Srinagar.18
Kashmir India

فون: 9596267110

hakeemulummat72@gmail.com

قیمت -/60، لائبریری -/85

سالانہ -/Rs:600 (رجسٹری ڈاک)

پرنٹر، پبلشر، اونر، ایڈیٹر ڈاکٹر محمد ظفر حیدری نے حکیم الامت کراؤن پرنٹنگ پریس بیڈ مالو، سری نگر سے چھپوا کر ہمدانیہ کالونی، بمنہ سری نگر سے شائع کروایا۔

Bank Details

Hakeem ul Ummat 0372010100018782
J&K Bank Br Bemina Srinagar
Dr Zafar Hyderi A/c 20243789785
SBI Br Bemina Srinagar

Md Zafar Hyderi a/c 0293000100230075
PNB GB Marg Lucknow Ifsc PUNB0029300

محاضرات

★ خصوصی شمارہ مرزا بشیر احمد شاکر ---------- اداریہ ---------- 1

★ گفتنی ---------- مرزا بشیر احمد شاکر ---------- 3

مرزا بشیر احمد شاکر مشاہیر کی نظر میں

★ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ---5 ★ پروفیسر اکبر حیدری ---6 ★ پروفیسر بشیر احمد نحوی ---6

★ پروفیسر جی آر ملک ---6 ★ پروفیسر نذیر احمد ملک ---8 ★ پروفیسر نسیم رفیع آبادی ---9

★ دیپک بدگی ------ 11 ★ سلطان الحق شہیدی --- 12 ★ عبداللہ خاور ------ 13

★ ایم ایس رحمن شمس --- 13 ★ مولانا شوکت حسین کینگ 14 ★ رویندر روی ------ 15

★ ڈاکٹر الطاف انجم --- 16 ★ سبزار احمد بٹ ------ 20

مضامین مرزا بشیر احمد شاکر

★ آلِ اقبال کے ساتھ چند ساعتیں ------ 24 ★ پوسٹ کارڈ ------ 62

★ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی شخصیت ------ 28 ★ پروفیسر غلام نبی فراق ------ 65

★ پروفیسر اکبر حیدری: مردِ قرطاس وقلم --- 36 ★ حباب ------ 68

★ گلشن بکس کشمیر ------ 39 ★ ماہنامہ حکیم الامت سری نگر --- 71

★ کتب خانہ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری --- 41 ★ یاد یار مہرباں ہمی آید ------ 74

★ علی بخش: خادم علامہ اقبال ------ 46 ★ مرحوم نور محمد ------ 76

★ پونچھ کا دورہ ------ 55 ★ جب ڈاکیہ چٹھی لاتا تھا ------ 80

★ علامہ اقبال پر خصوصی ضمیمہ ------ 57 ★ ڈاکٹر تقی عابدی کلیات حالیؔ --- 83

★ تقی عابدی نمبر (ماہنامہ حکیم الامت) --- 59 ★ پروفیسر اکبر حیدری کی یاد میں --- 88

تبصرے وتاثرات از مرزا بشیر احمد شاکر

★ اقبال: نادر معلومات - 91 ★ معرکہ اسرار خودی - 92 ★ اقبال: احباب وآثار - 97

★ اقبالیات اور زمانہ کانپور - 103 ★ نعتِ رسول مقبول - 109 ★ نور محمد تاجر کتب - 113

★ منظوم کشمیری ترجمہ حالیؔ 116 ★ حیات میر شعبان - 117 ★ تحفہ علمدار کشمیر - 120

★ مکاتیب مسعود ------ 123 ★ اقبال اور مرزائیت 126 ★ آغا شاعر قزلباش - 128

مرزا بشیر احمد شاکر کی کتب پر تبصرے

★ گلرنگ (محمد ظفر حیدری) 129 ★ کتابیں ہم نشین میری (ریاض توحیدی) 133

★ گلرنگ (ایس معشوق احمد) 135 ★ گلرنگ (سبزار احمد بٹ) ------ 137

★ علامہ اقبال کے دیس میں (سہیل سالم) - 139 ★ گلرنگ (ڈاکٹر رخسانہ رحیم) 141

★ اقبال کے دیس میں (امتیاز احمد) - 142 ★ رنگ ریول (سلطان الحق شہیدی) 145

★ شاکر خطوط نویسی کی روشنی میں - 147 ★ دانشوران کے چند جوابی خطوط بنام شاکر 164

★ سفرنامے: فقیر احمد صاحب 176 لداخ 181 انور شاہ کشمیریؒ 188 پہلگام - 195

★ مرزا بشیر احمد شاکر اپنے منظوم کلام کے تناظر میں 203 قلمی چہرہ (خالق پرویز) 146

اہلِ قلم

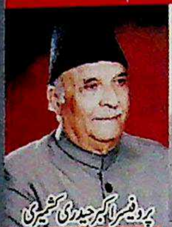

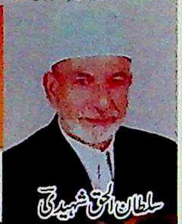

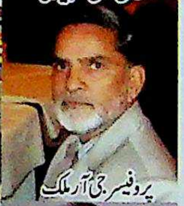

اداریہ

خصوصی شمارہ

مرزا بشیر احمد شاکر

ماہنامہ حکیم الامت سری نگر نے ماضی میں جن اہم شخصیات پر خصوصی شمارے شائع کئے ان میں پروفیسر اکبر حیدری کشمیری، ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا)، شمس الدین احمد (کیرلا)، اشفاق نجمی (ناگپور)، خطیب اکبر (لکھنو)، ڈاکٹر کلب صادق (لکھنو)، مولانا محمد عباس انصاری (کشمیر)، ڈاکٹر سید علی عباس (منڈی بہاؤدین) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

زیرِ نظر خصوصی شمارہ کشمیر کے معروف ادیب و شاعر مرزا بشیر احمد شاکر کی ادبی خدمات پر مشتمل ہے جس کی سند پروفیسر اکبر حیدری کشمیری، ڈاکٹر جاوید اقبال فرزند شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ، پروفیسر جی آر ملک، پروفیسر بشیر نحوی، پروفیسر نسیم رفیع آبادی جیسے محققین و ناقدین دے چکے ہیں۔ واضح رہے مرزا شاکر نہ تو کسی یونیورسٹی سے وابستہ رہے اور نہ ہی اردو کی روٹی کھاتے تھے۔اس کے باوجود ادب میں جو انہوں نے گرانقدر کام انجام دیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ فارسی زبان پر بھی انہیں خاصی دسترس حاصل ہے۔

مرزا بشیر شاکر محکمہ ڈاک و تار کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ یہ ایک ایسا محکمہ ہے جہاں صبح 9 بجے سے شام پانچ بجے تک دفتری کاموں کی مصروفیات کے باوجود شاکر صاحب کی ادب سے وابستگی نہ صرف حیران کن ہے بلکہ لائقِ تقلید بھی ہے۔ موصوف کو ادبی جنون اس قدر ہے کہ اپنی جیبِ خاص سے ایک کثیر رقم صرف کر کے مہنگی سے مہنگی کتاب خریدتے ہیں اور مطالعہ میں محو ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کتب بینی کے ساتھ ساتھ موصوف کو لکھنے کا شوق بھی رفتہ رفتہ پیدا ہو گیا۔ ان کی ذاتی لائبریری میں سینکڑوں کی تعداد میں کتب ہیں جو شاید ہی کسی کالج یا یونیورسٹی کے پروفیسر کے پاس ہوں۔ اس سلسلے میں پروفیسر اکبر حیدری کشمیری یوں رقمطراز ہیں: ’’شاکر صاحب علم دوست اور اقبالؔ کے عاشق ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی کے ڈاک خانے میں ملازم ہیں اور معمولی تنخواہ پاتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ جو لوگ اردو کے دعوے دار ہیں اور بڑی بڑی رقمیں تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کو کتاب تو درکنار ایک رسالہ خریدنے کی توفیق نہیں ہے۔ شاکر صاحب کا ظرف بلند، نظر وسیع اور مذاقِ علم تیز تر ہے۔‘‘

مرحوم سلطان الحق شہیدی صاحب نے بھی کچھ ایسی ہی باتوں کا اعتراف کیا ہے: ’’مرزا بشیر احمد شاکر صاحب کو میں ایک عرصہ سے جانتا ہوں۔ انہوں نے ایک غیر ادبی محکمہ میں ملازمت کرتے ہوئے بھی اردو ادب سے محبت کی ہے۔ ان کی ادب نوازی کا شروع سے قائل ہوں‘‘۔

بقول پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی (سابق ڈین اسکول آف سوشل سائنسز کشمیر یونیورسٹی) ’’مرزا بشیر احمد بیگ شاکر کشمیر کے ایک سنجیدہ اہلِ قلم اور صاحب فکر اقبال شناس اور ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔‘‘ (پیش لفظ گلرنگ)۔

بشیر احمد شاکر کے ادبی ذوق کے بارے میں پروفیسر بشیر احمد نحوی (سابق ڈائرکٹر اقبالؔ انسی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی) فرماتے ہیں کہ ’’شناسائی کے یومِ آغاز سے میں نے مرزا بشیر احمد شاکر کو علم دوستی اور ادب پروری کا ایک بے لوث پیکر پایا۔ اسلامیات، اقبالیات اور اردو ادبیات کے بغیر کوئی اور موضوعِ سخن انکی صابر و شاکر زبان پر نہیں دیکھا۔‘‘

پروفیسر جی آر ملک سابق صدر شعبہ انگریزی کشمیر یونیورسٹی شاکر صاحب کی کتاب ’’اقبال کے دیس میں‘‘ پر تبصرہ

کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ (زیرِ نظر کتاب) '' مرزا بشیر احمد شاکر صاحب کے پاکستان کے تین اسفار کی روئداد پر مشتمل ہے۔ یہ ناچیز اب تک بوجوہ سیاحتِ پاکستان سے محروم رہا ہے۔''

یہ محرومی کشمیر کے کئی ادبا اور شعرا کے حصے میں بھی آئی ہے۔ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری عمر بھر دورۂ پاکستان کے خواہاں تھے۔ 1980 میں جب انہیں نقوش ایوارڈ ملا تھا اور یہ ایوارڈ انہیں بدستِ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق لینا تھا تب بھی وہ اُس وقت کے ہند و پاک کے ابتر حالات کی وجہ سے پاکستان نہ جاسکے۔ اس لحاظ سے مرزا بشیر شاکر خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے تین مرتبہ پاکستان کا دورہ کیا اور وہاں کی کئی اہم شخصیات سے ملاقی ہوئے۔ غالباً شاکر صاحب پہلے کشمیری ہیں جنہوں نے فرزندِ علامہ اقبالؒ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال اور علامہ کی صاحبزادی منیرہ سے ان کے دولت کدے پر ملاقات کی۔

پروفیسر شیخ محمد اقبال شاکر صاحب کے دورۂ پاکستان کے بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

It is surprising that the duration of Mr. Shakir's regular stay lasted only 26 days. What he could gather from all the three visits is but the sum-total of his experiences, his interviews with men of consequence, besides his devotional presence in the historic Mosques and spiritual centers, and the blessings he received from the living pious in cities like Peshawar, Lahore, etc.

مولانا شوکت حسین کینگ (سابق پرنسپل حنفیہ عربک کالج سری نگر) بشیر احمد شاکر کے خاندان اور ادبی ذوق کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: '' آپ مشہور تاریخی، علمی و صاحب ثروت دینی خاندان جو خان بیگ خاندان کے نام کشمیر میں معروف و مشہور ہے اور یہ خاندان بھی ہمارے خاندان عالیشان کے اہلِ قرابت خانوادوں میں شامل ہے، کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ نہ صرف کشمیر بلکہ بیرون کشمیر بھی نام آور ہیں۔ آپ کی چند تخلیقات منظر عام پر آئی ہیں۔ حال ہی میں آپ کا سفرنامہ باصرہ نواز ہوا۔ جس سے پتہ چلا کہ علامہ اقبالؒ کے فرزند جلیل ڈاکٹر جاوید اقبال کے ساتھ بھی آپ کے علمی روابط رہے ہیں۔''

بشیر احمد شاکر نہ صرف علامہ اقبالؒ کے شیدائی ہیں بلکہ انہیں علامہ کے متعدد اردو اور فارسی اشعار نوکِ زباں ہیں۔ معروف براڈ کاسٹر رویندر روی کا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔ وہ کہتے ہیں '' شاعر مشرق کے ان گنت شیدائیوں اور مداحوں کی کہکشان جن میں مرزا بشیر احمد بیگ شاکر ایک ثاقب کی مانند جلوہ افروز ہیں۔ یہ حقیقت تب آشکار ہوتی ہے جب بسا اوقات آپکے دہانِ مبارک سے بے ساختہ علامہ کے سری وزریں اشعار کھل کر اپنی خوشبو سے قلب و ذہن کو محظوظ کرتے ہیں۔''

مرزا بشیر صاحب کی اب تک نو کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں: کتابیں ہم نشیں میری (اردو) یہ تصنیف کتابوں کی اہمیت وافادیت اور مطالعہ سے متعلق ایک دلچسپ کتاب۔ پوت آلو (کشمیری) یہ کتاب کشمیر کے گذشتہ نامساعد اور پُر آشوب حالات سے متاثر ہوکر مثنوی نما پراثر نظموں پر مشتمل ہے۔ علامہ اقبالؒ کے دیس میں (اردو) یہ تین پاکستانی سفرناموں پر مشتمل ایک دلآویز داستان ہے۔ لوہتی گلاب: یہ کتاب کشمیری مناجات اور نعتوں کا دلچسپ گلدستہ ہے۔ دیگر کتب میں مکاتیب و سفر نامے، آوازِ دل، خط و خیریت، گلرنگ، رنگہ ریول شامل ہیں۔

علاوہ ازیں شاکر صاحب کے اب تک متعدد تنقیدی و تحقیقی مضامین، غزلیں اور نظمیں ملک کے مشہور رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ ادارہ حکیم الامت کو فخر ہے کہ وہ بشیر احمد شاکر کی ادبی خدمات پر زیرِ نظر خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔

گفتنی

مرزا بشیر احمد شاکر

حضرت شیخ سعدی شیرازی نے اپنی لامثال فارسی تصنیف گلستان میں ایک منظوم حکایت اس طرح تحریر کی ہے۔

گلے خوشبوئے درحمام روزے — رسید از دستے محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از مستِ دلاویز تو مستم
بگفتا من گلے نا چیز بودم — ولے من مدتے با گل نشستم
جمالے ہم نشین درمن اثر کرد — وگر نہ من ہما خاکم کہ ہستم

ان فارسی اشعار کا مفہوم یہی ہے کہ جسطرح مٹی کے اندر گلاب کے پودے کے ساتھ ساتھ رہنے سے خوشبو کا اثر پیدا ہوتا ہے اسی طرح صالحین کی صحبت اختیار کرنے سے آدمی میں بھی اچھے آثار پیدا ہو سکتے ہیں اور اس کا مزاج بھی اپنے اندر کچھ نہ کچھ اچھائی جذب کر سکتا ہے۔

اپنے بارے میں قارئین کرام کی خدمت میں یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہی مثال مجھ پر بھی صادق آتی ہے۔ میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں کوئی بلند قامت ادیب یا قلمکار ہوں، یا کسی بڑی یونیورسٹی میں کوئی ہفت خواں رُستم طے کئے ہیں ہاں اتنا ہے کہ اپنا میٹرکولیشن پاس کر کے ایس پی کالج سرینگر میں داخلہ لیا تھا اور کوئی دو سال تک تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے بعد منقطع کرنا پڑا تھا اور اُس وقت کے بھارتی محکمہ ڈاک و تار میں ملازمت کی زنجیر میں بندھ گیا تھا اور چالیس سال سے زیادہ اس محکمہ میں اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتا رہا۔ بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق دامن گیر رہا۔ نصابی کتب کے ساتھ علمی وادبی رسالوں اور اخبارات کا مطالعہ میرا مشغلہ رہا۔ دوران ملازمت بھی دفتری بندشوں اور پابندیوں کے باوجود مختلف قسم کی کتابیں پڑھتا رہا۔ مطالعے کا زیادہ رجحان دینی کتابوں کی طرف تھا۔ اس طرح میں مسلسل قرآن اور تفاسیر قرآن کے علاوہ احادیث کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ سیرت مبارکہ پر لکھی گئی مستند کتابیں مثلاً سیرت النبیؐ از شبلی نعمانی وسید سلیمانی ندوی نقوش لاہور کا بارہ جلدوں پر مشتمل سیرت نمبر، مولانا ادریس کاندھلویؒ کی سیرت المصطفیٰ میرے زیر مطالعہ رہیں۔ اس کے علاوہ قدیم سیرتی کتابیں مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت حلبیہ جیسی اور کتابیں بھی میرے پاس موجود ہیں۔

میں برابر اردو ادب کی معیاری تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کے علاوہ شعر وشاعری اور دیگر اصناف سخن سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ اپنی مادری یعنی کشمیری زبان کی بہت بڑی اہم اور سود مند کتابوں کا بھی مجھے مطالعہ کرنے کا موقعہ میسر رہا۔ الغرض مطالعہ کتب، رسالہ جات اور اخبارات وغیرہ میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی حیات مستعار کے کئی لمحات کئی بزرگان دین، علمائے کرام، دانشوران اور ادیب و شعرا حضرات کی صحبتوں میں بھی گزارنے کے مواقع مجھے میسر ہوئے ہیں، اور شیخ سعدیؒ کے درج بالا اشعار کے تناظر میں مجھ کورے اور ہیچدان پر ایسے صالحین اور باذوق حضرات کی صحبتوں کا ایک خوشگوار اور بہت ہی اچھا اثر پڑ گیا اور بزرگان دین وعلمائے کرام کے علاوہ علم دوست حضرات کی کتابوں کے مطالعہ کی صورت میں میری کچھ دبی ہوئی صلاحیتیں ابھرنے لگیں اور دل کی پوشیدہ تمناؤں نے انگڑائیاں لینے کی شروعات کیں۔ نتیجتاً میں رفتہ رفتہ قلم تھامنے لگا اور شعر وشاعری اور مضمون نویسی کی طرف مائل ہو گیا۔ ان میں سے کچھ چیدہ چیدہ تحریریں اخبارات اور رسالہ جات میں چھپنے لگیں، جن میں سرینگر سے نکلنے والے اردو اور کشمیری میں کلچرل اکیڈیمی کے شیرازہ پروفیسر اکبر حیدری کا شائع کردہ حکیم الامت، شاہد بڈگامی کا ہر موکھ، پانپور سے نکلا پرانا رسالہ کونگہ پوش، لکھنو سے

میں جناب پروفیسر اکبر حیدری مرحوم کے لائق و فائق فرزند اور مرحوم کے مشن کو آگے بڑھانے والے ڈاکٹر ظفر حیدری کا نہایت شکر گزار ہوں کہ ان کو میری نگارشات پسند آگئی ہیں جو کہ وقتاً فوقتاً ان کے ماہنامہ رسالہ حکیم الامت میں بھی چھپتی رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میری کچھ ادبی کاوشات پر مشتمل حکیم الامت کے زیر نظر شمارہ کو زیور طباعت سے آراستہ کر کے منظر عام پر لایا ہے۔۔۔۔۔ بشیر احمد شاکر

نکلنے والا اطلاع اور مقامی اخبارات سے آفتاب، کشمیر عظمیٰ، تعمیل ارشاد، چٹان، ہفتہ وار اخبار رہبر، قومی وقار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بہر کیف دن گزرتے گئے اور مجھ ناچیز سے شناسائی رکھنے والے کچھ مخیر حضرات نے میری نگارشات کے بارے میں جانتے ہوئے مجھے اپنے نیک مشوروں سے نوازا اور مجھے شعر و شاعری مضامین اور خطوط نویسی پر مشتمل تحریری مواد کو کتابی صورت میں چھاپنے کا مشورہ دیا۔ میں سرینگر میں سن 2009، 2010ء میں تعینات اس وقت کے محکمۂ ڈاک کے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل جناب Y.P.S. Mohan کا نہایت شکر گزار ہوں جنہوں نے میری ملازمت سے سبکدوشی کے دن اپنی تقریر میں مجھے تلقین کی کہ میں اپنے مسودات کو ریٹائرمنٹ کے بعد کتابوں کی صورت میں منظر عام پر لاؤں۔ اسی طرح کئی اور مخیر دوستوں نے بھی اس بات پر مجھے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ کچھ سال گزارنے کے بعد اور اپنے ان بے ترتیب اور بکھرے ہوئے تحریری مسودات کی چھان پھٹک کرنے میں مصروف رہا اور بہت ساری محنت و مشقت اٹھانے کے بعد آج تک میں کوئی چھوٹی بڑی دس کتابوں کو زیور طباعت سے آراستہ کرنے اور منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوا ہوں۔ میری یہ کتابیں کشمیری اور اردو دونوں زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ یہ سبھی کتابیں شعر و شاعری، مضمون نویسی، خطوط نگاری، سفر ناموں، تبصروں اور تاثرات پر مشتمل ہیں۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہ کوئی بڑا کارنامہ ہے بلکہ اس کو اپنی ایک حقیر اور ادنیٰ ادبی خدمات سے تعبیر کرتا ہوں۔

یہ ان بلند قامت اور عالی ظرف رکھنے والے ادباء، شعرائے کرام اور دانشور حضرات کی فراخدلی کا ثبوت ہے کہ انہوں نے میری ان خدمات کو لائق تحسین سمجھ کر اپنے قلم سے میری نگارشات کو سراہا ہے۔ اپنے ان محسنین کیلئے دعا گو ہوں، ان میں پروفیسر اکبر حیدری مرحوم، پروفیسر شیخ محمد اقبال، معروف عالم دین مولانا شوکت حسین کینگ، پروفیسر غلام نبی فراق، پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر جی آر ملک، پروفیسر نذیر احمد ملک، پروفیسر بشیر احمد نحوی، مرحوم سلطان الحق شہیدی، سعید الرحمن شمس، جناب عبدالاحد فرہاد، پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی، جناب پران کشور، جناب رویندر روی، جناب آنجہانی پتامبر ناتھ فانی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی سے میرا قلمی سفر آگے بھی جاری رہے گا، انشاء اللہ۔

علمی و ادبی دنیا کے ان جھگمگاتے چاند ستاروں کی سراہنا سے میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میری مجھ پر یہ مثال بالکل صادق آتی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ: کلاہ دہقان بہ آفتاب رسید

مگر اپنی صلاحیتوں اور کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہنے میں بھی اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہوں

شاعر نہیں ہوں کوئی سخن داں نہیں ہوں میں
ہاں خرمنِ کمال کا اک خوشہ چیں ہوں میں
......شانتی سروپ بھٹناگر

مرزا بشیر احمد شاکر مشاہیر کی نظر میں

Mirza Bashir Ahmad Shakir's

'Allamah Iqbal Ke Deas Main'

1. Dr. Sheikh Mohammad Iqbal

This account of Mirza Bashir Ahmad Shakir's visits to 'Mamlakat-e-Khudadad' is so brief yet absorbing that the interested readers may finish it in three sittings only. The objective underlying them was to see the separated members of the families from this side of the Line of Control.

It is surprising that the duration of Mr. Shakir's regular stay lasted only 26 days. What he could gather from all the three visits is but the sum-total of his experiences, his interviews with men of consequence, besides his devotional presence in the historic Mosques and spiritual centers, and the blessings he received from the living pious in cities like Peshawar, Lahore, etc.

I am confident that readers will enjoy and appreciate this brief and beautiful Travelogue which is full of information with regard to Iqbal's Deas and its peoples' hospitality which enticed the author **(Mirza Bashir Ahmed Shakir)** to visit the country several times.Also,the photographs taken at different places especially with eminent personalities have further added to the significance and beauty of the book.Lastly,I am of the opinion that in spite of the hurdles in his way, the author has done well toward in identifying the vast field of study for the future generations. For that reason he deserves the gratitude of his present and prospective beneficiaries. It is my hope and expectation that he will, Insha-Allah, remain engaged, zealously promoting the genuine interests of Humanity as a whole.

مگر یہ بھی حق ہے کہ ان حضرات نے میری نگارشات کو دیکھ کر جو کچھ اخذ کیا ہے اوران کے فہم رسا کے مطابق جو اس کا نتیجہ نکلا ہے انہوں نے وہ زینتِ قرطاس وقلم بنایا ہے۔ میرا اپنا یہی برملا اعتراف ہے کہ یہ سب کچھ میری بس طالب علمانہ کاوشیں ہیں اور میں اس بات کا قائل ہوں کہ: من آنم کہ من دانم

ناچیز کہنہ مشق شاعر اور ادیب جناب خالقؔ پرویز بارہمولہ کا بھی سپاس گزار ہے کہ انہوں نے منظوم پیرائے میں میرا قلمی چہرہ لکھ کر محبتوں کا ثبوب دیا۔ ڈاکٹر رخسانہ رحیم، ڈاکٹر ریاض توحیدی، ایس معشوق احمد، عبدالاحد فرادؔ، سبزار احمد بٹ و دیگر حضرات کا بھی بہت بہت شکریہ۔

میں جناب پروفیسر اکبر حیدری مرحوم کے لائق و فائق فرزند اور مرحوم کے مشن کو آگے بڑھانے والے ڈاکٹر ظفر حیدری کا نہایت شکر گزار ہوں کہ ان کو میری نگارشات پسند آگئی ہیں جو کہ وقتاً فوقتاً ان کے ماہنامہ رسالہ حکیم الامت میں بھی چھپتی رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میری کچھ ادبی کاوشات پر مشتمل حکیم الامت کے زیر نظر شمارہ کو زیور طباعت سے آراستہ کر کے منظر عام پر لایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر ظفر حیدری کی ان پُرخلوص خدمات کو شرف قبولیت عطا کرے۔ ادارۂ ماہنامہ حکیم الامت میں کام کرنے والے دیگر اراکین کا بھی میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

قارئین سے میری مودبانہ التماس ہے کہ وہ زیر نظر شمارہ کو پڑھ کر اپنے تاثرات سے ایڈیٹر کو مطلع کریں، والسلام۔

2۔ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

میں چند برسوں سے جناب مرزا بشیر احمد صاحب شاکر سے غائبانہ طور پر واقف تھا۔ ایک مرتبہ میرا کوئی مضمون شیرازہ سری نگر مین شائع ہوا۔ شاکر صاحب کو وہ پسند آگیا اور فون پر مضمون کے بارے میں گفتگو کی۔ جب اقبال پر میری دو کتابوں کی رسم رونمائی ڈائرکٹوریٹ آف لائبریز کے زیرِ اہتمام تو انہوں نے شام کو مجھے ان کے بارے میں استفسار کیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر فون آیا کہ کتابیں کہاں سے دستیاب ہوسکتی ہیں؟ مجھ سے رہا نہ گیا اور کہا کہ دونوں کتابوں کی قیمت نوسو روپے ہے۔ مین نے ان کو کتابیں بھیجیں اور انہوں نے اسی وقت پوری رقم ادا کی۔

شاکر صاحب علم دوست اور اقبال کے عاشق ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی کے ڈاک خانے میں ملازم ہیں اور معمولی تنخواہ پاتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ جو لوگ اردو کے دعویدار ہیں اور بڑی بڑی رقمیں تنخواہ پاتے ہیں ان کو کتاب تو در کنار ایک رسالہ خریدنے کی توفیق نہیں ہے۔ شاکر صاحب کا ظرفِ بلند نظر وسیع اور مذاقِ علم تیز تر ہے۔ انہیں کتابیں اتنی پسند آئیں کہ مجھے دیکھنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ نوشہرہ سے زحمتیں اُٹھاتے میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور ایک کتاب پر تبصرہ کر کے میرے سپرد کیا جو حکیم الامت میں فخر کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

3۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی

(سابق ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی)

شناسائی کے یوم آغاز سے میں نے مرزا بشیر احمد شاکر کو علم دوستی اور ادب پروری کا ایک بے لوث پیکر پایا۔ اسلامیات، اقبالیات اور اردو ادبیات کے بغیر کوئی اور موضوعِ سخن انکی صابرو شاکر زبان پر نہیں دیکھا۔ شاکر صاحب کی کتابوں کے ساتھ ہم نشینی اور وارفتگی قابلِ داد ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ بشیر صاحب کو پوسٹ ماسٹر کے بجائے کسی اسکول یا کالج میں ''ماسٹر'' ہونا چاہیے تھا۔

''علامہ اقبال کے دیس میں'' شاکر صاحب کے ان اسفار پر مشتمل سفرنامہ کا خلاصہ ہے جو انہوں نے پاکستان میں اپنے عزیز و اقارب سے ملاقات کے لئے وقتاً فوقتاً کئے ہیں۔ یہ سفرنامے ان کے گہرے مشاہدے اور مملکتِ پاکستان میں نامور شخصیات کے مزارات پر اُن کی حاضری سے پیدا شدہ کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ حضرت سید علی ہجویریؒ اور علامہ اقبالؒ کے مقابر پر حاضر ہوکر جن جذبات کا شاکر صاحب نے اظہار کیا ہے اس سے ان عظیم المرتبت شخصیات سے عقیدت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے۔ چند شہروں کے سفر سے پورے ملک کے جغرافیہ، مزاج اور حالات کی عکاسی شاکر صاحب نے بڑی دِقتِ نظر سے کی ہے اور اس کو پڑھ کر مجھے مولانا تقی عثمانی کے ''جہانِ دیدہ'' کے سفرنامے لوحِ ذہن پر تازہ ہوگیے۔

سفرناموں کی فہرست میں اس کتاب سے ایک نیا اضافہ ہوگا اور اس میں ملک وملت کی موجودہ صورت حال کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ شاکر صاحب کے دردِ دل کی غمازی کرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔(ص 202 بھی ملاحظہ کیجئے)

4۔ پروفیسر جی آر ملک

(سابق صدر شعبہ انگریزی کشمیر یونیورسٹی)

''اقبال کے دیس میں'' مرزا بشیر احمد شاکر صاحب کے پاکستان کے تین اسفار کی روئداد پر مشتمل ہے۔ یہ ناچیز اب تک بوجوہ سیاحتِ پاکستان سے محروم رہا ہے۔ محرومی کے اس احساس میں تسلی حاصل کرنے کے لئے اقبال ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

عالمِ سوز وساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ طلب کی لذّت مرگِ آرزو کی تلخی سے بہر کیف بہتر ہے۔ میری لذّت طلب کو عقیدت و دردمندی

سے لبریز شاکر صاحب کی روئیدادِ سفر نے دوبالا کردیا ہے۔

سفر نامہ ہمیشہ سے انسان کی تہذیبی روایت کا ایک جاندار حصہ رہا ہے۔ ٹیکنالوجی کے موجودہ دور میں سمعی، بصری اور کثیر الجہتی وسائلِ ترسیل نے یہ بات ممکن بنادی ہے کہ انسان گھر بیٹھے ہی دنیا بھر کی سیر کرسکے بلکہ ایسی سیر وسیاحت کا سامان بآسانی اپنی جیب میں لئے پھر سکے۔ اس کے باوجود سفرنامے کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اسلئے کہ سفرنامہ ہماری آنکھوں کے سامنے محض ایک معروضی منظرنامہ نہیں لاتا بلکہ اس میں سفرنامہ تحریر کرنے والے کے جذبات واحساسات اور اس کی مخصوص بصیرت کی آمیزش ہوتی ہے اور قدم قدم پر اُسکے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ ایک کشمیری کے سفرِ پاکستان پر یہ بات بالخصوص صادق آتی ہے۔ مولانا عبدلماجد دریابادیؔ نے ایک عام مسلمان کے سفر پاکستان پر جو بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے اور جو شاکر صاحب کی پہلی روئیدادِ سفر کا نقطہ آغاز ہے وہ خاص طور پر ایک کشمیری مسلمان کے سفر پر راست آتا ہے۔ اُسکی روئیدادِ سفر میں کچلی ہوئی آرزؤں اور سسکتے ہوئے ارمانوں کی صدائیں سنائی دیتی ہیں اور اس کا بین السطور حافظ کے الفاظ میں بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

کحل الجواہری بہ من آر اے نسیمِ صبح
زاں کویِ نیک بخت کہ شد رہگذار دوست

یہ جذباتی لگاؤ اور عقیدت واحترام شاکر صاحب کے سفرنامے کا طرّہ امتیاز ہے اور اسکی سطر سطر میں اس کا عکس نظر آتا ہے۔

یہ عقیدت ومحبت دراصل ایک آئیڈیل (نصب العین) کے ساتھ والہانہ وابستگی کی نمائندگی کرتی ہے۔ لیکن ''اقبال کے دیس میں'' جیسے سفرناموں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ اہم سوال ابھر کے سامنے آتا ہے کہ خود اس آئیڈیل پر تقسیم برّصغیر کس طرح اثر انداز ہوئی ہے۔ شاکر صاحب نے مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے بزگانِ دین کی قیام پاکستان کے بارے میں پیشگوئیوں اور بشارتوں کا تذکرہ کیا ہے جو حرف بحرف پوری ہوئیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے قیامِ پاکستان سے ایک سال پہلے اعتکافِ رمضان کے بعد اپنے عقیدت مندوں سے کہا تھا کہ عالمِ کن فیکون میں پاکستان کا وجود میں آنا مقدر ہوچکا ہے۔ اور جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ یہ آپ کہہ رہیں جو اصولاً تقسیم کے مخالف ہیں تو ان کا جواب یہ تھا کہ خدائی فیصلوں کی منطق تو حتمی طور پر وہی قادرِ مطلق جانتا ہے۔ لیکن یہ پریشان کن سوال اپنی جگہ پر قائم ہے کہ جس نصب العین کی خاطر پاکستان وجود میں آیا تھا اسے کس حد تک سرحد کے اُس پار عملی جامہ پہنایا جاسکا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت ظلم وستم، قتل وغارتگری اور تمدّنی یلغار سے محفوظ ہوگئی ہے اور آزادی اور عزّت کے ساتھ جی رہی ہے لیکن کیا یہ بھی ایک حقیقت نہیں ہے کہ پاکستان اسلام کی تجربہ گاہ نہیں بن پایا ہے۔ اقبال نے حسین احمد مدنی پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

اس شعر میں جس منزلِ مقصود کی نشاندہی کی گئی ہے پاکستان اس منزل تک پہنچنے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہم سب پر روشن ہے۔ اور کیا یہ بھی ایک تلخ اور المناک سچائی نہیں کہ تقسیم صرف مسلمانوں کی ہوئی ہے جو اب تک تین ٹکڑوں میں بٹ چکے ہیں۔ کیا مولانا آزاد مرحوم ومغفور نے انہی خدشات کے پیشِ نظر تقسیمِ ملک کی مخالفت کی تھی یا اس کے پیچھے کچھ گہرے نظریاتی دواعی تھے؟

اور سرحد کے اِس پار تقسیم نے جو قیامت ڈھائی ہے وہ تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ خونچکاں فرقہ دارانہ فسادات، تمدّنی تاخت اور تاریخ کو مٹانے اور مسخ کرنے کا جو

عمل تقسیم کے ساتھ شروع ہوا تھا اب اپنے پورے شباب پر ہے۔اور مستقبل مخدوش نظر آتا ہے۔

شاکر صاحب نے اپنے سفر نامے میں اُس انسانی المیہ کو بھی ابھارنے کی کوشش کی ہے جو تقسیم برِّ صغیر کا سب سے زیادہ درد انگیز پہلو ہے۔ایک ہی جسم کے ٹکڑے کئے گئے اور دونوں کو تڑپتا چھوڑ دیا گیا۔انسانی اخوت و محبت اور اس رشتے سے منسلک تمام لطیف جذبات و احساسات کو گویا بے رحمی کے ساتھ کند چھری سے ذبح کیا گیا۔شاکر صاحب کے الفاظ میں:

''دانش مندوں اور خرد مندوں کے نزدیک ایک ہی بدن کے دو ٹکڑے کردیے گئے تھے اور انسانی سینوں اور دلوں کے درمیان ایک خونی لکیر کھینچی گئی ہے۔بھائی بھائی سے جدا ہو گیا ہے۔باپ بیٹے سے اور ماں بیٹی سے اس درد و فراق کی بھی عجیب کہانی ہے۔آج بھی ہزاروں لوگ ایک دوسرے کی ملاقات کے لئے تڑپتے ہیں اور بہت سارے گذشتہ دہائیوں میں یہی درد و کرب لئے مٹی کے آغوش میں چلے گئے۔''

یہ دردمندانہ لہجہ اور اس کی تہہ میں کارفرما ایک آئیڈیل کے ساتھ جذباتی وابستگی اس سفر نامے کی اہم خصوصیات ہیں۔مواد و اسلوب کے اعتبار سے یہ جیسا کچھ ہے وہ قارئین انشاء اللہ خود دیکھ لیں گے۔میں شاکر صاب کا ممنوں ہوں جنھوں نے مجھے اس خامہ فرسائی کے لئے موقعہ عنایت فرمایا۔

5۔پروفیسر نذیر احمد ملک

سابق صدر شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی

مرزا بشیر احمد شاکر کی زیر اشاعت کتاب ''مکاتیب و سفر نامے'' کو اس پس منظر میں دیکھا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں شامل بیشتر مکاتیب مشاہیر کے نام ہیں۔ان میں رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر سعید اختر درانی، پروفیسر شمس الدین احمد، پروفیسر اکبر حیدری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان خطوط میں بہت ہی مفید اور کارآمد باتیں موجود ہیں۔شاکر صاحب محکمہ ڈاک میں بطور پوسٹ ماسٹر کام کر چکے ہیں اور مختلف علاقوں میں اپنے سرکاری فرائض انجام دے چکے ہیں۔انہیں اپنے اس پیشے کی بدولت خطوط کی ترسیل کی اہمیت کا گہرا احساس ہے۔ترسیل کے طریقے اب بدل چکے ہیں، ان میں انقلابی نوعیت کی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔پوسٹ کارڈ سے لیکر ٹیلیگرام، اسپیڈ پوسٹ اور ای۔میل پیغام رسانی کے اہم ذرائع سامنے آچکے ہیں۔شاکر صاحب ترسیل کے اس پورے سفر کا از خود مشاہدہ کرچکے ہیں، تاہم وہ ان تمام تر تبدیلیوں کے باوجود روایتی طریقۂ ترسیل کی اہمیت اور افادیت کو اہم گردانتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ ان مکاتیب کی اشاعت وطباعت کا اہتمام کررہے ہیں۔روایتی خط و کتابت کے امتیازات سے آج بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس عجلت پسند اور مصروف ترین زمانے میں پیغام رسانی کے جدید طریقوں نے فاصلوں کو ختم کردیا ہے۔پلک جھپکنے کی دیر ہے کہ ہزاروں میل کی دوریوں سے پیغامات کی ترسیل مکمل ہوجاتی ہے۔لیکن مکاتیب محبت، خلوص اور گرم جوشی کے جن جذبات سے مامور ہوتے ہیں وہ مشینی طریقوں میں کہاں ممکن ہوسکتے ہیں۔روایتی خطوط نگاری کے چند امتیازات کی طرف اشارہ کرنا یہاں بے محل نہ ہوگا:

۱: مکاتیب کسی مشین، آلہ یا کل پرزے کے محتاج نہیں ہیں۔صرف پوسٹل ایڈرس شرط لازم ہے۔

۲: ای۔میل کی کمزوری یہ ہے کہ اس کو بعض اوقات پڑھا بھی نہیں جاتا ہے، ایسے ہی نظر انداز کیا جاتا ہے۔ای۔میلز کی بھرمار سے طبیعت اُکتا جاتی ہے، ان میں وہ کشش نہیں ہوتی ہے جو انسان کی اندرونی شخصیت کو مس کر سکے۔اس کے برعکس خط دیکھ کر انسان کے اندر ایک عجیب انبساط انگیز کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس کو پڑھے بنا قرار نہیں آتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں

کہ بعض خطوط رسمی ہوتے ہیں تاہم رسمی خطوط میں بھی ایک انسانی جذبہ یا پہلو شامل ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ان خطوط کو یادگار کے طور پر محفوظ کیا جاتا ہے کہ فلاں شخصیت کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یا لکھا ہوا خط۔

۳: ای-میل جب کچھ دنوں بعد اس کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے، ڈیلیٹ کیا جاتا ہے لیکن خطوط کی نگہداشت کی جاتی ہے اور بڑی مشکل سے اس کو کاٹ دیا جاتا ہے۔

۴: خطوط میں بعض اوقات ایسی باتیں ہوتی ہیں جو ثبوت اور دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض معاملات میں آج بھی ای-میل کے بجائے خط نگاری کو ترجیح دی جاتی ہے۔

۵: خط لکھتے وقت مکتوب نگار کئی بار سوچتا ہے کہ خط میں لکھوں، کسے مخاطب کروں، جملوں کی ترتیب کیا ہونی چاہئے، کسی بات کو اشاروں، کنایوں میں لکھوں اور کہاں وضاحت کی ضرورت ہے۔ ای-میل کی زبان رسمی اور متعین ہوتی ہے، اس میں غیر انسانی پہلو زیادہ حاوی رہتا ہے۔

۶: ای -میل غیر محفوظ ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ذاتی اور شخصی اسباب کے باعث آج بھی مکاتیب سے کام لیا جاتا ہے۔ ان نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے شاکر صاحب کے ان مکاتیب سے ایک اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ انہیں علامہ اقبال کی شخصیت سے بے حد عقیدت ہے اور ان پر کئے گئے تحقیقی کام سے خاص لگاؤ ہے۔ چنانچہ ان کی خط و کتابت زیادہ تر ان مشاہیر سے رہی ہے جنہوں نے اقبال پر ادبی، علمی اور تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی خط و کتابت اقبال کے فرزند جاوید اقبال سے بھی رہی ہے۔ 'حکیم الامت' کے مدیر پروفیسر اکبر حیدری کے نام خطوط بھی اسی بات کو ظاہر کرتے ہیں۔

شاکر صاحب کے ان خطوط میں بعض ایسی باتیں ہیں جو طالب علموں اور ریسرچ اسکالرس کیلئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ خود علامہ فقید المثال نابغہ دانشور، شاعر اور سیاسی مفکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ خطوط تحقیقی حوالوں کیلئے مستند مواد فراہم کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ شاکر صاحب ان کو منظر عام پر لائیں گے۔ اگر یہ پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں پھر بھی ان کو دوبارہ شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

6۔ پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی

(سابق ڈین اسکول آف سوشل سائنسز کشمیر یونیورسٹی)

مرزا بشیر احمد بیگ شاکر کشمیر کے ایک سنجیدہ اہل قلم اور صاحب فکر اقبال شناس اور ادبی شخصیت کے مالک ہیں پہلے ہی کئی ایک علمی کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب ''گلرنگ'' کے نام سے ادبی اور علمی مضامین کا مجموعہ تیار کیا ہے جو شائع کرنے جا رہے ہیں جس میں علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ بعض انشائیہ ادب کی نمایاں تحریریں بھی شامل ہیں۔

کشمیر کے مایہ ناز مصنفین صحافیوں اور شعراء پر بہت اچھے مضامین اس مجموعے کی زینت ہیں اقبال کے خادم خاص علی بخش اور جسٹس جاوید اقبال مرحومین کو بھی نہیں بھولے ہیں اور آل اقبال کے ساتھ اپنی ان قیمتی یادوں کو قارئین کے ساتھ شیئر کرنے میں پیچھے نہیں رہے جو ان کے دورہ پاکستان کی خوب صورت یادگاریں کہی جا سکتی ہیں۔

مسدس حالی کا جو منظوم ترجمہ شائع ہوا ہے اس پر اچھا تبصرہ سامنے لایا ہے کتابیں ہم نشین میری اقبال نادر معلومات چند بہت ہی قیمتی تحریریں اس مجموعے میں شامل کی ہیں۔ مرحوم اکبر حیدری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اب اردو زبان و ادب کا یہ شہسوار منوں مٹی کے نیچے سو گیا ہے اور تا صبح قیامت برابر سوتا ہی رہے گا۔ مگر اس نے اپنے پیچھے علم و ادب کا گرانقدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ اس سے اردو کے

شیدائی فیض پاتے رہیں گے۔ تحقیق کے میدان میں جناب حیدری صاحب کی اپنی الگ پہچان ہے''۔

ایک گمنام شیدائی اقبال کے پی شمس الدین ترور کارڈ جو کیرلا سے تعلق رکھتے ہیں کے بارے میں ایک نادر تحریر کو سامنے لایا ہے جو دراصل حکیم الامت کے رسالے میں مرحوم اکبر حیدری صاحب نے شائع کیا تھا اور لکھا ہے: ''اردو کی بستیوں سے دور اور الگ تھلگ کیرلا کی سرزمین میں بھی شمس الدین ترور کارڈ جیسے ادیب نظر آتے ہیں جنھوں نے ہندوستان کے اس جنوبی علاقے کو اقبال کی شخصیت، فکروفن اور ان کے کارناموں سے شائقین اردو ادب کو اردو کے اس بلند قامت اور عظیم شاعر سے روشناس کرایا ہے''۔

کشمیر کے بہت سارے کتب خانوں کا تذکرہ کرنے کے بعد پروفیسر اکبر حیدری کے کتب خانہ واقع ہمدانیہ کالونی بمنہ کا ذکر کیا ہے:

''کتب خانہ کیا ہے؟ ایک گنج گرانمایہ اور علم وادب کا ایک عطر بیز ہواؤں کا لہلہاتا گلشن ہے۔ مخطوطات، اخبارات، رسالے یہاں موجود ہیں۔ قدیم وقتوں کے رسالے جیسے مخزن لاہور، صوفی پنڈی بہاؤالدین، زمانہ کانپور، خدنگِ نظر وغیرہ رسالے اس گنجینہ ادب میں موجود ہیں''۔

یہاں ۱۹۵۰ء سے جمع کردہ کتابیں ۵۰۰۰ سے زیادہ، رسائل وقدیم اخبارات موجود ہیں۔ اقبالیات پر ۲۰۰ کے قریب کتابیں ہیں جن میں خود پروفیسر حیدری صاحب کی درجن بھر کتابیں بھی شامل ہیں۔ غالبیات پر تقریباً ۱۵۰ کتابیں ہیں جن میں حیدری صاحب کی درجن بھر کتابیں بھی موجود ہیں۔ میریات پر ۱۰۰ سے زائد کتابیں ہیں جن میں اکبر حیدری صاحب مرحوم کی ۴ کتب شامل ہیں مراثی پر تقریباً ۳۳۰ کتب شامل ہیں جن میں مرحوم حیدری صاحب کی درجنوں کتابیں بھی شامل ہیں۔

شاکر صاحب نے علامہ اقبالؔ کے فرزند ارجمند جسٹس جاوید اقبال سے اپنی ملاقات کا ذکر بڑے پُرعقیدت انداز میں کیا ہے۔ بہت ساری تفصیلات بتانے کے بعد لکھا ہے کہ جاوید اقبال نے ''موجودہ یورپی قوموں کی ترقی اور مسلمانوں کی پستی کے بارے میں کہا۔ تقلید اور اجتہاد کے بارے میں اپنے زریں خیالات سے آگاہ کیا۔ آخر ان کی شخصیت ایک بین الاقوامی شخصیت تصور کی جاتی ہے۔ پھر کوئی گھنٹہ بھر طویل ملاقات کے بعد ہم رخصت ہونے لگے''۔

جاوید اقبال کی وفات پر مضمون پڑھ کر میں اشکبار ہوا اور اقبال کے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سادگی کا عالم معلوم ہوا اور وہ کس طرح اپنے بچوں کو سادگی کی زندگی اپنانے اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار ہونے کا بار بار درس دیتے تھے اور قرآن اور اسلام سے ان کی وابستگی اور جفاکشی اور محنت کی زندگی سے ان کو آشنا کرنے کے درپے تھے اسی طرح حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مقبرے پر اقبال کی حاضری کا حال پڑھ کر رِقعت طاری ہوئی کیونکہ کل ہی میں بھی وہاں فاتحہ پڑھ کر آیا تھا اور عجیب قسم کی روحانی واقعات کی حادثاتی ہم آہنگی سے متاثر ہو رہا تھا۔ اپنے فرزند دلبند جاوید کے بارے میں حضرت علامہ نے لکھا تھا:

ہمی یک آرزو دارم کہ جاوید
ز عشق تو بگیرد رنگ و بوئے
دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

عشق ومحبت کی یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے جاوید نامہ میں ایک سو چھبیس اشعار پر مشتمل ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے خطاب بہ جاوید (سخنے بہ نژادِ نو)۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ شاکر صاحب اور ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی صاحب کو علامہ اقبالؔ کے فرزند جناب جاوید اقبال کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ بھی رہا ہے اور یہ کسی سعادت سے کم نہیں شاکر صاحب نے اقبال کی بیٹی منیرہ کی طرف سے اپنے نام مکتوب کا بھی ذکر کیا ہے۔

اقبالؔ کے خادم جس نے تقریباً پینتالیس سال تک علامہ کی اور ان کے خاندان کی اعلیٰ خدمت انجام دی پر جو مضمون شاکر صاحب نے تحریر کیا ہے، بہت ہی نادر معلومات کا خزانہ ہے اور یہ مضمون پڑھ کر اقبالؔ کی معنوی اور روحانی تگ وتاز اور روحانی سوز وگداز کا ایک ایسا منظر سامنے آتا ہے کہ مولانا رومی اور مرزا غالب کی زیارت اقبال کرتے نظر آتے ہیں۔

اس مجموعہ میں ڈاک خانہ اور اسی طرح کے دوسرے دلچسپ موضوعات پر مضامین موجود ہیں اور ہر جگہ شاکر صاحب کے احساس مسٔولیت اور فرض شناسی کے علاوہ ان کی اقبال اور اسلام سے محبت کا بار بار اظہار کسی نہ کسی پیرائے میں ضرور سامنے آتا ہے اس طرح یہ مجموعہ مفید معلومات سے پر ہونے کے ساتھ ساتھ بعض انوکھے عنوانات پر مشتمل ہے اس لیے اس کو انشاء اللہ شوق سے پڑھا جائے گا۔

والسلام علی من اتبع الھدی

والسلام علی رسول اللہؐ

7۔ دیپک بدکی (سابق پوسٹ ماسٹر جنرل جموں وکشمیر)

کوئی تیس سال قبل کشمیر کی تاریخ نے ایسی کروٹ لی کہ ایک خونین باب اس کے ساتھ ہمیشہ کیلئے جڑ گیا۔ کشمیر کا مسئلہ تقسیمِ وطن کے ساتھ ہی پیدا ہو چکا تھا مگر کسی کو گمان نہ تھا کہ نصف صدی گزر جانے کے بعد یہ ایسی شدت اختیار کرلے گا۔ اس مسئلے پر یہاں روشنی ڈالنے کا محل نہیں ہے البتہ اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۹۹۰ کے بعد کشمیری عوام ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی اپنی اپنی چکی میں پسے جا رہے ہیں۔ جو وادی میں اقامت پذیر ہیں انہیں مسلسل عدم تحفظ، تلاشیوں، گولیوں اور بم دھماکوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اور جو وادی چھوڑ کر اجنبی شہروں میں بکھر چکے ہیں انہیں بے زمینی، بے گھری اور موسم کی مار ہر دم ستاتی ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ آپس میں مل جل کر گزارا تھا اور ایک دوسرے کی خلا کو پر کرتے رہے تھے، جدائی ان کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ کشمیری پنڈتوں کی مخصوص پوشاک، صبح سویرے بزرگوں سے علیک سلیک، پنڈت اساتذہ کی کھنکار، پنڈت دوستوں کے ساتھ کھیلنا کودنا، دوشیزاؤں کی اٹکھیلیاں، بادام کے شگوفوں تلے ایک ساتھ بیٹھ کر خوشیاں منانا، نشاط وشالیمار کے میلے اور مٹن، ویری ناگ وئیل ناگ چشموں کا طواف موجودہ نسل کی یاداشت کا لاینفک جزو بن چکے ہیں۔ البتہ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ نئی نسل جن کو مہاجر کشمیری پنڈتوں کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رہا ہے وہ ان کو ٹورسٹ کے علاوہ کوئی اور درجہ دینے کیلئے تیار نہیں۔

مرزا بشیر احمد شاکر نے اپنی کشمیری نظم 'پوت آلو' (باز طلبی Recall) میں اسی کرب کو صفحۂ قرطاس پر انڈیلنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نظم کا عنوان 'باز طلبی' یا 'واپس بلانا' استعارہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کو پڑھ کر مجھے کیفی اعظمی کی ایک نظم میں یہ سوچ کر اس در سے چلا تھا کہ آواز دے کر بلا لے گی مجھ کو...... یاد آئی۔ آج کشمیری پنڈت قوم غربت میں وجود کی کشمکش سے نبرد آزما ہے۔ ان کے کان صرف یہ سننے کیلئے ترس رہے ہیں کہ کوئی پیچھے سے ان کا نام پکارے اور کہے ''آ جاؤ، اپنی دھرتی تمہیں واپس بلا رہی ہے، چلے آؤ!''۔ ادھر کشمیری مسلم خود کو پنڈتوں کے بغیر آدھا ادھورا محسوس کر رہے ہیں اور گاہے بہ گاہے ان کی واپسی کے خواب دیکھتے ہیں۔ شاکر اسی خواب کی ترجمانی اپنی نظم میں کرتا ہے۔

نظم کے چند اشعار ے

چھنس روچھمت بہ کو چھ منز، کتہِ سو کچہِ مال؟
سو گیہِ کوت پر وَتن لج کس وَنو اس

بہ دَپہ ہس وولہ ژ ہے اسہِ موج اسکھ
وطن مالئین پزیا مشرُن وَنو اس
سُہ نابد، ڈوٗنی، بادم، الہ مُشکاہ
پرشادا محبتُک رچھ رچھ تھوَو اس

شاکر اپنے دوستوں، ہمجولیوں اور رفیق کاروں کو بلاتا ہے اور اس دور کی یاد کو تازہ کرتا ہے جب نشاط وشالیمار میں نغمے گونجتے تھے۔ ڈل جھیل اور شکاریوں میں سیریں ہوتی تھیں، تیوہاروں پر شیرینی، الائچی و بادام بطور پرساد بٹتے تھے اور بہار آتے ہی بادام واری میں میلے لگ جاتے تھے۔ کشمیر جو ریشیوں اور صوفیوں کی دھرتی ہے، وہاں ریشی پیر اور مخدومؒ صاحب کے دربار میں منت مانگنے جایا کرتے تھے۔ شاعر کو افسوس ہے کہ آج پنڈتوں کی بستیوں حبہ کدل اور فتح کدل کی رونق غائب ہو چکی ہے۔ کیونکہ وہاں کے لوگ گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ پنڈتوں کے منادر تولہ مولہ (کھیر بھوانی کا مندر)، ہاری پربت (شاریکا مندر) اور گنپت یار (گنیش مندر) عابدوں کے بغیر سونے سونے لگ رہے ہیں اور وہاں کونوں کھدروں میں مکڑی کے جالے نظر آرہے ہیں۔

وُچھان تہہ کُن چھُ تُلہ مُل تہ ہارِ پربت
دیان یِی تو تہ بیہہ لولاہ برَو اسی
یہِ ٹھوکر کُٹھ زلرء زالو چھ وولُمت
یہِ انہِ گوٹ کیُتھ اتھ زوٗلاہ کرو اسی

نظم میں شاعر نے کشمیر کے مناظر کی تجسیم کی ہے جو اپنے مکینوں کو واپس بلا رہے ہیں۔ اس نظم میں ان ہستیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے ادب، مصوری، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ میں اپنا یوگدان دیا ہے۔ ان کی پراگندگی کا یہ عالم ہے کہ شاعر کو اب یہ بھی معلوم نہیں کہ کون کس جگہ پر سکونت پذیر ہے۔ اس حالت میں وہ صرف اندازہ لگا سکتا ہے کہ جب سورج سوا نیزے پر کھڑا ہوتا ہوگا اور انگارے برسا رہا ہوگا، وہ لوگ کیسے پھٹے پرانے قنات اور خیموں میں سرپوں اور ناگنوں کے بیچ سانسیں لے رہے ہونگے۔

آخر میں شاعر خواب کے طلسم سے نکل کر زمینی حقیقت سے روبرو ہو جاتا ہے۔ اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ زمانہ بدل گیا ہے، وقت نے ایسی کروٹ لی ہے کہ اب کشمیری پنڈت کیلئے وادی میں لوٹ آنا مشکل ہے۔ کشمیر کا ماحول مکمل طور پر اس کیلئے اجنبی بن چکا ہے۔ مشکل میں ہی سہی مگر اس نے اب اپنی کشتی حیات کو موجودہ حالات کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ جہاں رہتا ہے وہیں پر اس نے اپنا مکان بنایا ہے اور وہ اب اسی کو اپنی دھرتی تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اس کے بال بچے وادی کے باہر برسر روزگار ہیں اور جو کمسن ہیں، وہ اسکولوں وکالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ الغرض اس نے وہاں کی بود وباش اختیار کی ہے۔ اس کیلئے شاید اس کو پھر سے سب کچھ چھوڑ کر واپس آنا ممکن نہ ہو۔ اس کے باوجود شاکر خدا سے دعا مانگتا ہے کہ کشمیر کا ماحول سازگار ہو جائے، وادی میں پھر سے اجالا پھیل جائے اور دونوں فرقوں میں آپس میں پھر وہی میل جول نظر آئے۔

ییو نا باغ پھلہ ہن ہیِ بیہہ دِلن ہند
شمع شولن تہ زن زوٗلاہ کرو اسی
دُعا شاکرؔ منگان گٹہ زوٗل گژھن دوٗر
سنگر نُو رکی پھولن اتھی گتھ کرو اسی

8۔ سلطان الحق شہیدی (اردو)

مرزا بشیر احمد شاکر صاحب ذی فہم بھی ہیں اور ادیب بھی۔ آپ نے اپنی ساری زندگی انسان دوستی میں صرف کی۔ شکر ہے کہ خدا دوستی ان کا وظیفہ حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بصورت اشعار انہوں نے اپنا خراج ادا کیا ہے اور محبتوں کا یہ اظہار قابل تعریف ہے۔ ہماری

دعا ہے کہ رب العالمین اس نذرانۂ محبت وخلوص کو قبول فرمائے اور اس کا فیض و برکت ایسے تمام محبان کرام تک جا پہنچے جو اس کلام کو محبتوں سے نوازیں۔

سلطان الحق شہیدی (کشمیری)

مرزا بشیر احمد شاکر صاب چھِ گنمات تہِ ادیب تہِ۔ یمو کرسارے زندگی انسان دوستی منز صرف، شکر چھ زِ خدا دوستی چھُ یہُند وظیفہ حیات۔ اللہ تعالیٰ سندِس حبیبسؐ چھُ یموتہِ شعرن منز خراج عقیدت نعت وَنتھ ادا کورمُت، یہ لولہ باوتھ چھے تعریفن لایق۔ سون دُعا چھُ زِ یہ لولچ ڈال کرِن رب العالمین قبول تہ امیک فیض واتِن تمام لولہ والین یم اتھ کلامس لول برن۔

9۔ عبداللہ خاور

(سابق لائبریرین، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر)

مرزا بشیر احمد شاکر صاحب کو میں ایک عرصہ سے جانتا ہوں۔ انہوں نے ایک غیر ادبی محکمہ میں ملازمت کرتے ہوئے بھی اردو ادب سے محبت کی ہے۔ ان کی ادب نوازی کا شروع سے قائل ہوں۔ اس کا بین ثبوت ان کی ترتیب دی ہوئی کتاب...... ''کتابیں ہم نشیں میری'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں انہوں نے کتب خانہ اور کتب بینی سے متعلق قریب تیس مضامین جمع کئے ہیں۔ مختلف ذرائع سے انہیں ڈھونڈ کر مرتب کرنا آسان کام نہیں۔ میں نے ان مضامین کو جستہ جستہ پڑھا ہے۔ یہ مضامین تحقیقی بھی ہیں اور معلوماتی بھی۔ یہ مضامین ان اصحاب کیلئے چشم کشا ہیں جو دور حاضر کی ٹیکنالوجی سے مرعوب ہیں اور کتب بینی کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ اپنی نظم ''کتابیں'' میں معروف فلمی شاعر گلزار نے کتاب کے متعلق کہا ہے کہ آج کتاب کو کمپیوٹر کے پردے میں چھپایا گیا ہے، بالکل صحیح ہے۔ یہ کتاب ان قارئین کیلئے وجہ انبساط ہوگی جنہیں اب بھی کتب بینی سے عشق ہے اور ایسے عاشقوں کی اب بھی کمی نہیں۔ مضامین کے آخر میں شاکر صاحب کی ایک نظم بعنوان ''کتابیں ہم نشیں میری'' بھی موجود ہے، جو فکر وفن کے لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے۔ مجھے امید ہے ہ اس کتاب کی معیت میں قارئین کا وقت خوشگوار گزرے گا۔

10۔ ایم ایس رحمٰن شمس

(مدیر نصرۃ الاسلام، وسیکریٹری متحدہ مجلس علماء جموں وکشمیر)

مرزا بشیر احمد شاکر دنیائے علم وادب میں ایک قابل احترام نام ہے، جنہوں نے اپنی علم دوستی اور ادب نوازی کے سفر میں اب تک متعدد فکر انگیز کتابیں اردو، کشمیری میں لکھ کر صاحب علم وفکر حضرات کے نزدیک اپنا ایک منفرد نام اور شناخت بنائی ہے۔

راقم کے کشمیر آمد کے ساتھ ہی ۱۹۹۰ء کے دہائی میں جناب شاکر سے مرکز علم وفن میر واعظ منزل سرینگر میں اپنے ایک محب وکرم فرما جناب مرحوم ماسٹر غلام رسول مخلص (جو فی الحقیقت میرے لئے ایک مخلص شخصیت کے حامل انسان تھے) ملاقاتوں کا سلسلہ ہوا اور تادم تحریر حالات کے نشیب وفراز جموں وکشمیر میں سیاسی انقلابی صورتحال کے باوجود برابر جاری ہے۔ جناب مرزا صاحب کا تعلق کشمیر کے نامور دینی گھرانے سے ہے اور جن کی صدیوں پر محیط کشمیر کے معرکتہ الآرا میر واعظ خاندان کے ساتھ عقیدت ومحبت کے رشتے استوار رہے ہیں اور جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کی تعلیم وتربیت ایک خاص دین دار اور مہذب گھرانے میں ہوئی۔ گو کہ شاکر صاحب جو پوری زندگی بظاہر محکمہ ڈاک سے وابستہ رہے لیکن مجھے محترم بشیر نحوی کی اس بات سے سو فیصد اتفاق ہے کہ:

''انہیں پوسٹ ماسٹر کے بجائے کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر یا پھر کسی کالج کا لیکچرار یا استاد ہونا چاہئے تھا''۔

عمر اور بزرگی کے ساتھ ساتھ جناب بشیر شاکر کی تحریروں اور تجربات میں مزید پختگی اور گہرائی پیدا ہو رہی ہے، اور

عمر کی رفتار کے ساتھ ساتھ قلمی اور علمی سفر بھی برابر جاری ہے۔ مقام اطمینان ہے کہ موصوف نے ملازمت سے فراغت کے بعد اپنی زندگی کو مثبت اور تعمیری سرگرمیوں میں صرف کرنے کا عزم کر رکھا ہے، جو بہر حال قابل اطمینان اور دوسروں کیلئے قابل تقلید ہے۔

جناب بشیر احمد شاکر نثر و نظم دونوں صنف میں یکساں صلاحیت کے مالک اور اس پر قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ موصوف کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں پہلی کتاب ''کتابیں ہم نشیں میری'' دوسری کتاب ، اسفارِ پاکستان پر مشتمل بعنوان ''علامہ اقبال کے دیس میں'' اور تیسری کشمیری زبان میں مناجات، نعت اور منقبت کا گلدستہ ''لوہتی گلاب'' ہے۔ ان کتابوں میں بطور پیش لفظ اور تعارف و تاثر کے نامور محقق اور مورخ جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، شاعر توحید جناب پروفیسر مرغوب بانہالی ، ماہر اقبالیات جناب پروفیسر بشیر احمد نحوی، انگریزی زبان و ادب کے مستند اسکالر جناب پروفیسر جی آر ملک ، معروف عالم دین جناب مولانا شوکت حسین کینگ ، نامور نقاد جناب ڈاکٹر شاد رمضان کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے جناب ڈاکٹر الطاف انجم نے اپنے اپنے انداز سے ان کتابوں پر اور صاحب کتاب کے حوالے سے تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اور اپنی قیمتی آرا پیش کی ہیں اور ان کتابوں کے محاسن اور خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔

ظاہر ہے جناب شاکر صاحب کی کتابوں پر وادیٔ کشمیر کے ہمارے نامور اسکالرز، علماء اور دانشوروں نے قیمتی آرا اور مثبت تاثرات کا اظہار کیا ہے ان سے موصوف کی جملہ کتابوں کی اہمیت، افادیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس مرحلے پر راقم مذکورہ کتابوں پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے اسلیئے بھی گریز کر رہا ہے کیونکہ آج کے فکر و عمل کے زوال اور آرام طلبی کے دور میں کتابوں کے مطالعہ کے ذوق میں آئے روز شدت سے کمی محسوس کی جارہی ہے۔ اس لیے محض اشارہ کرتے ہوئے ان کتابوں کے مطالعے کی ذمہ داری باذوق اور ادب نواز افراد اور شخصیتوں پر چھوڑ رہا ہے تاکہ وہ خود ان کتابوں کو پڑھ کر اپنے دل و دماغ کو روشن کریں اور معلومات میں اضافہ بھی۔

آیئے موجودہ عالم گیر قہر انگیز کورونا وائرس کی وجہ سے چونکہ لاک ڈاؤن کا عمل جاری ہے اور بیشتر اوقات لوگوں کا قیام گھروں میں ہی رہتا ہے اس لئے جناب مرزا صاحب نے خون جگر سے جو اپنی نگارشات اور تخلیقات اور نوادرات پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان سے حتی المقدور فائدہ اٹھانے کی سعی کی جائے۔ یہ تینوں کتابیں بے حد نفیس، عمدہ اور دور حاضر کے بین الاقوامی معیار کے مطابق چھاپ کر منظر عام پر لائی گئی ہیں۔

میری دعا ہے حضرت حق جل مجدہٗ مرزا صاحب کی عمر میں علم میں اور وقت میں مزید خیر و برکت پیدا فرمائے اور ان کا علمی فکری اور قلمی سفر رواں دواں رہے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

نیک خواہشات کے ساتھ

11۔ مولانا شوکت حسین کینگ

(سابق پرنسپل حنفیہ عربک کالج، سرپرست اعلیٰ انجمن جماعت اسلام)

میں برادرِ مکرم فاضل عصر، ادیب وقت، جناب مرزا بشیر احمد بیگ صاحب شاکرؔ کے بزبانِ کشمیری 'لوہتی گلاب' کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں، جو سراپا عشق و درد و سوز و محبت کا ہے اور بلحاظِ زبان، رسم الخط اور فن عروض بھی معیاری ہے۔

آپ مشہور تاریخی، علمی و صاحب ثروت دینی خاندان جو خان بیگ خاندان کے نام کشمیر میں معروف و مشہور ہے اور یہ خاندان بھی ہمارے خاندان عالیشان کے اہلِ قرابت خانوادوں میں شامل ہے، کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ نہ صرف کشمیر بلکہ

بیرون کشمیر بھی نام آور ہیں۔آپ کی چند تخلیقات منظر عام پر آئی ہیں۔حال ہی میں آپ کا سفرنامہ باصرہ نواز ہوا۔جس سے پتہ چلا کہ علامہ اقبالؒ کے فرزند جلیل ڈاکٹر جاوید اقبال کے ساتھ بھی آپ کے علمی روابط رہے ہیں۔

راقم الحروف نے کوشش کی کہ اس پیش لفظ میں چند بیت الغزل ادبیات کا انتخاب کروں۔مگر قاصر رہا کیونکہ ہر ایک نعتیہ شعر بے بہا ہے۔البتہ مناقب میں یہ معیار برقرار نہیں رہا اور پھر یہ لغزش علمی وشعری کہ محسن کشمیر حضرت شاہ ہمدانؒ کے شان میں منقبت مفقود۔کبوترانِ مدینہ کا موضوع وجدید شعراء کا من پسند موضوع عشق رہا ہے۔علامہ اقبالؒ سے منسوب واقعہ بھی اور پھر مرثیہ، شہادت کبوتر مدینہ تاریخ نعت میں مثبت ہے۔میں موصوف کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ کے کلام میں نعتیہ کلام نے اہم مقام لیا ہے۔اگر غزلیات وغیرہ کو چھوڑ کر آپ اسی میدان میں پیش قدمی کریں گے تو زہے سعادت انشااللہ عنقریب بقعہ، جات مساجد، کانفرنسوں اور محافل میلاد میں یہ کلام اور آئندہ کلام نعتیہ پڑھا جائے گا۔

12۔رویندر روی

(براڈ کاسٹر آل انڈیا ریڈیو)

شاعر مشرق کے ان گنت شیدائیوں اور مداحوں کی کہکشان جن میں مرزا بشیر احمد بیگ شاکر ایک ثاقب کی مانند جلوہ افروز ہیں۔یہ حقیقت تب آشکار ہوتی ہے جب بسا اوقات آپکے دہانِ مبارک سے بے ساختہ علامہ کے سری وزریں اشعار کھل کر اپنی خوشبو سے قلب وذہن کو محظوظ کرتے ہیں۔نا میں بسیار گو کہوں اور نا ہی کم گو کہ زمان ومکان کی قیود میں آپ کا متکلم توجہ مبذول کرانے میں صدقِ دلی کا اظہار کرتا ہے اور یہ اس میں کامیاب رہتا ہے۔غیر ضروری ابہام سے احتراز روزمرہ کے محاورات سے آراستہ متون ایک منفرد اسلوب کا احساس کراتے ہیں، جس سے قاری قطعاً مجہولیت محسوس نہیں کرتا۔تنوع اور شگفتگی آپکے محاورے کو اور بھی متحرک اور فعال بناتے ہیں۔باریک بینی اور ان کہی باتوں کی کھوج مع غیر مانوس موضوعات کی طرف میلان آپکے تخلیقی شعور کی آئینہ داری کرتے ہیں۔فکری افزودگی اور تجربے سے مالامال آپ کا قلم دلچسپ واقعات، تجربات، صورت حال، حکایات، مشاہدات کو براہِ راست من وعن زینت قرطاس بناتا ہے۔

یہ بغیر مبالغہ ایک تخلیقی ملکہ ہے۔یہی ان کے گلرنگ مجموعہ کی خاصیت ہے۔اپنی فکر وبصر کو مقید نہ کر کے فضا کی وسعتوں کو عبور کرنے کی امنگ اختراعی تجسس اور استطاعت آپکا شیوہ ہے۔تشنگی ان صاحب فکر انشا پرواز کی ذات وشخصیت سے خوب جھلکتی ہے۔تشنہ لب شاکر قلزم واسود کی گہرائیاں ناپنے سے بھی دریغ نہیں کرتے دِکھ سکیں گے۔جو ٹھان لیتے ہیں روبہ عمل لاکر ہی دم لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے آپ ایک نہیں تین بار ارض پاک کا دورہ کر کے لوٹ آتے ہیں اور وہاں شاعر مشرق کی درگاہ کی زیارت کر کے فیضیاب ہوئے اور سعادت پائی۔یہ انبساط آپ کو دوسری بار بھی سرزمین پاک کے دورے پر لے گئی اور مرقد پیامبر خودی ومرد قلندر کی زیارت کرائی۔

خود ہی فرماتے ہیں: ”یہ عشق اقبال کا پرکشش جذبہ ہی ہے جو مجھے کھینچ کر اس زیارت گاہ پر لے آیا“۔اپنی بات کرتے ہوئے دل کی بات کہہ جاتے ہیں۔”کتابیں دیکھنے، ڈھونڈنے اور پڑھنے کا سلسلہ برابر میرے ساتھ لگا رہا اور میں مطالعہ کتب کی اطمینان بخش خوشیوں سے محظوظ ہوتا رہا اور کتابی صحبت سے دانشور حضرات اور اہل دل اور اہل فکر کی سبق آموز باتیں میرے دل ودماغ پر اثرانداز ہوتی رہیں“۔

ارتباط شاکر کا ایک ایسا وصف ہے جو ان کے تکلم میں ایک جمالیاتی کیفیت پیدا کرتا ہے۔عجلت سے ہماری سبک رفتار

یہ کثیر جہتی واثر انگیز قلمکار اپنے سیاق وسباق متون کی بدولت اپنے تجرِ علمی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اپنی دلاویز علمی وقلمی جولانی گلرنگ کو چار چاند لگا دیتی ہے اور اپنی تخلیقی لیاقت وذہانت کا لوہا منوانے میں کامیاب رہتی ہے۔ قاری گلرنگ کے دلفریب عکس رو سے جو نورانی جلا حاصل کرتا ہے وہ ایک دائمی فرحت کا احساس بھی کراتا ہے۔ گلرنگ کی خاصیت اسکا اپنا منفرد وممتاز نثری اسلوب ہے جس کا اعتراف نکتہ داں حضرات بلاتکلف کر سکتے ہیں۔

گلرنگ میں آفاقیت اور تنوع کی بدولت اس باغ رضواں کا بھی احساس ہوتا ہے جہاں کی سیر کرنے کے بعد ایسی میٹھی اور انمٹ یادیں روح وقلب میں گھر کر جاتی ہیں جو اور نئے خیالات اور جذبات کو جنم دیتی تصنع اور عضوعیت سے صاف و پاک ڈکشن (diction) اور نحو آپ کی نثر کا ایک نمایاں وصف ہے۔ اپنے فطری خیالات ومحسوسات دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں اور یہ زبان اپنی ایک منفرد شناخت بناتی ہے۔ بیانیہ اسلوب، گلرنگ کو اور بھی دیدہ زیب بناتا ہے۔ گلرنگ کے جمالیات کا ایک عکس:

''کتابیں بلند خیالات اور سنہری جذبات کی دستاویزی یادگاریں ہوتی ہیں۔ کتابیں بحر حیات کی سیپیاں ہیں، جن میں پر اسرار موتی بند ہیں۔ کتابیں معلومات کے ثمر دار درختوں کے باغ ہیں، گزرے ہوئے بزرگوں کے دھڑکتے دل ہیں۔ حسن وجمال کے آئینے ہیں اور وقت کی گزری ہوئی بہاروں کے عکس ہیں۔ کتابیں لافانی بلبلیں ہیں جو زندگی کے پھولوں پر سرمدی سرمدی نغمے گاتی ہیں''۔ (صفحہ نمبر ۵۱، گلرنگ)

'گلرنگ' سے آپکے تخلیقی شعور، فکری وسعت و گہرائی اور تجر علمی کا پختہ ثبوت ملتا ہے۔ قوس وقزح کی مانند مختلف اقسام کے گل رنگی موضوعات بے باکی اور راست بازی کے ساتھ تجربات ومشاہدات بیان کرتے ہیں۔ بات جو کرنا چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں، کسی بھی قسم کے سمجھوتے سے اجتناب کرتے دکھ رہے ہیں اور اپنی بات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ گل رنگی مضامین پڑھ کر مرزا بشیر احمد بیگ شاکر کی تخلیقی واجمالی معنوعیت کی نئی سمتیں متعین ہوتی ہیں۔

آپ کے اختراعی، فکر انگیز، تحقیقی وچشم کشا مقالات نہ صرف آپ کی فکری نظر اور تخلیقی گہرائی کا ثبوت پیش کرتے ہیں بلکہ یہ ایک گراں قدر ادبی سرمایہ بھی ہیں جو زبان وادب کے شیدائیوں کیلئے **reference material** کا بھی کام دیں گے اور مشعل راہ بھی ثابت ہونگے۔ گلرنگ دلکش ودیدہ زیب بھی ہے۔

13۔ ڈاکٹر الطاف انجم

(کشمیر یونیورسٹی سری نگر)

اُردو زبان کے ایک متحرک قلم کار مرزا بشیر احمد شاکر کا سفر نامہ ''علامہ اقبال کے دیس میں'' تین اسفار پر مشتمل ہے جو سفر نامہ نگار نے تین مختلف اوقات میں انجام دئے ہیں۔ آئے ان اسفار کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں:

<u>سفر پاکستان (اول)</u>

سفر نامہ نگار اپریل ۲۰۱۲ء کو پہلی بار پُرجوش اور جذبات واحساسات کے سائے تلے دہلی سے بذریعہ بس واگہہ سرحد سے لاہور پاکستان تشریف لے گئے۔ اس دوران انہوں نے نہایت ہی دلسوزی سے دوملکوں کے تقسیم اور اس تقسیم کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے جن الفاظ کا اظہار کیا ہے وہ ایک درد مند دل رکھنے والے انسان کے ذریعہ ہی ادا ہو سکتے ہیں:

''سرحد کے پار پہنچ کر باضابطہ محسوس ہوتا ہے کہ کس طرح ایک ہی ملک دو حصوں میں بٹ گیا ہے اور کس طرح انسانوں کے سینوں پر گویا خونی لکیر کھینچی گئی ہے۔ ایک حساس آدمی کی طبیعت پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے''

اس سفر کے دوران مصنف نے لاہور میں قیام کرنے

کے بعد معروف صوفی بزرگ حضرت سید علی ہجویری کی درگاہ پر زیارت کا بھی جذباتی انداز میں بیان درج ہے۔اسی دوران ان کا بادشاہی مسجد کا دورہ اور علامہ اقبالؒ کے مزار کی زیارت کا ذکر بھی کیا ہے۔اقبال کے مزار پر اربابِ علم و دانش کی حاضری انہی کے درج ذیل شعر کی علمی صورت ہے۔

زیات گاہِ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

اس کتاب کا مصنف خواہش اور آرزو کو لے کر متعدد آلائشوں اور مصائب کا سینہ چیر کر سرحد پار پہنچتا ہے اور پاک سرزمین میں آسودہٗ خاک حکیم الامت اور ابوالاثر حفیظ جالندھری کے مزارات پر فاتحہ خوانی کر کے ان کی روح کے لیے مغفرت اور بلندیٔ درجات کی دعاؤں میں محو ہو جاتا ہے۔ برصغیر کے ایک عام مسلمان کی طرح مرزا بشیر احمد شاکر پاکستان کے ساتھ کچھ امیدیں وابستہ کر بیٹھا ہے۔حفیظ جالندھری کے ''ترانۂ پاکستان'' پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے شاکر صاحب لکھتے ہیں:

''اس ترانے میں وہ اہلِ پاکستان کو یاد دلا رہے ہیں کہ تم جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے رول ماڈل ہو،تم ایک زندہ دل قوم ہو،مکہ کے سطوت وجلال کے امانت دار ہو اور مدینے کی بادِ بہاری کے رہینِ منت ہو،تمہیں دنیا کو دکھانا ہے کہ مسلمان کس طرح دنیائے آب و گل میں اخوت ومحبت،عدل و انصاف اور امن وآشتی کی مشعلیں فروزاں کر کے باہم دگر شیر و شکر ہوتے ہیں۔لیکن آہ!''

''لیکن آہ!'' کے دو الفاظ ایسے آتشیں اور دل شکن ہیں کہ ان میں اس ملکِ پاکستان کی ناقدری اور ناگفتہ بہہ حالات،مسلکی اختلافات،علاقائی منافرت اور خود ملکی لٹیروں کی تمام تر بیہودگیوں کا اثر محسوس کیا جا سکتا ہے۔پروین شاکر نے ایک بار ''یومِ پاکستان'' کے سلسلے میں منعقد کی گئی تقریب پر پاکستان کی ابتر صورتِ حال پر طنزیہ انداز میں کہا کہ۔

اے مری گل زمیں تجھے چاہ تھی اک کتاب کی
اہل ِکتاب نے مگر کیا تیرا حال کر دیا

اس پہلے سفر کے دوران انہوں نے لاہور اور راول پنڈی کے سفر کی روئیداد جس دل شکن انداز میں رقم کی ہے اس سے بہر صورت یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ جس اشتیاق اور گرم جوشی کے ساتھ مصنف نے رختِ سفر باندھا تھا لیکن ویزا جاری کرنے والے اہلکاروں اور دوسرے متعلقہ حکام کی سردمہری نے انہیں اسی درجہ مایوس کیا۔

سفرِ پاکستان (دوم)

مرزا بشیر احمد شاکر کی آرزوئیں جب پہلے سفرِ پاکستان کے دوران پوری نہ ہوئیں تو ان کے شوقِ دیدارِ مملکتِ خداداد نے جاندار کروٹیں لیں اور اس طرح وہ سال ۲۰۱۴ء میں دوسری مرتبہ پاکستان کا رخت سفر باندھنے پر آمادہ ہوئے۔ اس دوسرے سفر کی روئیداد انہوں نے ''لیلائے تمنّا کی آغوش میں'' کے عنوان سے قلم بند کی جس کا ذیلی عنوان ''پشاور و لاہور کا سفر'' درج ہے۔سفر نامہ نگار نے پشاور کے ضمن میں ویزا کے حوالے سے برتی جا رہی سختیوں اور سنجیدگیوں کا جس انداز سے تذکرہ کیا ہے اس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ ہند و پاک کے درمیان جغرافیائی،تہذیبی،ثقافتی اور لسانی مماثلت کے باوجود سیاسی اور سفارتی سطح پر کتنی اجنبیت اور رسہ کشی دیکھنے کو ملتی ہے۔شاکر صاحب کو پاسپورٹ پر پشاور جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن وہ اس سے غیر دانستہ طور پر صرفِ نظر کر کے پشاور پہنچ گئے جہاں اپنی آمد کی اطلاع دینے پر وہ پولیس تھانہ میں یہ سن کر چونک گئے کہ پاسپورٹ میں انہیں صرف لاہور جانے کی اجازت درج ہے۔اب انہیں بادلِ ناخواستہ پشاور کو خیر باد کہنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔یہی وہ حالات ہیں جہاں ایک عام انسان

ناکردہ سیاسی گناہوں کے بوجھ تلے دب جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سفرنامہ نگار مرزا بشیر احمد شاکر کو پاکستان کے پولیس عملہ کے ساتھ جہاں بھی واسطہ پڑا وہ ان کے حق میں رطب اللسان ہی نظر آئے۔ ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ پولیس کا عملہ کسی سے داد و دہش بٹورے۔ اس کتاب سے شاکر صاحب کا یہ اقتباس پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا:

''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر کس بناء پر ایسے نیک اطوار لوگوں کی ہمارے ہاں نکتہ چینی کی جاتی ہے اور بلا وجہ ان کی عیب جوئی کر کے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کیا جاتا ہے۔ میری یہی گواہی ہے کہ مجھے جہاں بھی جانا پڑا اور جن لوگوں سے بھی واسطہ پڑا۔ معدودے چند وہ نہایت ہمدردی اور شریفانہ رویہ کے ساتھ پیش آگئے۔ اگر ہمیں وہاں پولیس کے اہل کاروں اور محافظہ دروں اور فوجی آدمیوں سے بھی کچھ کہنے یا پوچھنے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے السلام علیکم یا وعلیکم السلام کہہ کے ہماری بہت خندہ پیشانی کے ساتھ عزت و توقیر کی۔''

محکمہ پولیس کے اہل کاروں کے تعلق سے مصنف کا مذکورہ بالا بیان ایک معنی خیز بات ہے۔ اس عملہ کی نیک نامی میں خود مصنف کے مخلص ہونے کو بھی برابر عمل دخل ہے۔

لاہور کئی اعتبار سے ایک اہم شہر واقع ہوا ہے جس کی خاک میں کئی لعل و گہر پوشیدہ اور پیوست ہیں۔ انہی جواہر میں حضرت داتا گنج بخش اور شاعرِ مشرق حکیم الامت علامہ محمد اقبال نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ مصنف کی بار بار پاکستان کی جانب مراجعت کی اہم وجہ بھی یہی ہے کہ اس کے شہرِ لاہور میں امتِ مسلمہ کے ایک اہم غم خوار آسودۂ خاک ہیں۔ علامہ اقبال امتِ مسلمہ کے ہر ایک ذی ہوش فرد کے لیے ایک غیر معمولی شخصیت ہے:

دیا اقبالؔ نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

مصنف نے اقبال کے مرقد کی زیارت کے حوالے سے جو تعارف کرایا وہ ان کی اقبال فہمی پر دال ہے:

''آج مجھے اس بات پر فخر تھا کہ میں اُسی اقبال کے روضے پر کھڑا ہوں جنہوں نے عمر بھر راتوں کی نیند حرام کر کے عالمِ اسلام کو بیدار رہنے کا پیغام دیا۔ ذرے کو آفتاب بن کر چمکنے کی تعلیم دی، خودی اور خود شناسی کا درس دیا، کمزور اور ناتواں پرندے کو شاہین صفت بننے کا درس دیا جو خود فنا فی الرسول ﷺ اور فنا فی القرآن تھے۔ یہ اس شاعرِ مشرق کا مرقد ہے جس کو آج عرب و عجم کے اہلِ دانش سلام کہتے ہیں۔ جس کو مغرب کے مفکروں اور دانشوروں نے اپنا خراج پیش کیا ہے۔ ان کے فکری انقلاب نے زنگ خوردہ ذہنوں کو جھنجھوڑا جس پر نئی نئی تحقیق کے دروازے کھول دیے گئے ہیں اور آئندہ بھی صدیوں تک ان کی انقلابی فکر اور ابدی پیغام سے فیض ملتا رہے گا۔''

شاکر صاحب نے نہایت ہی گہری فکری بصیرت اور دانشمندانہ طور پر علامہ اقبال کا تعارف کرایا ہے جس میں عالمانہ انداز کے ساتھ ساتھ فکرِ اقبال کے ساتھ مصنف کی وابستگی بھی محسوس ہو رہی ہے۔ دراصل علامہ اقبال ایک ایسے وقت میں منصۂ شہود پر نمودار ہوئے جب عالمِ اسلام نے ایک طویل نیند کے بعد خلافتِ عثمانیہ کی تنزلی کے وقت کروٹ بدلی اور اُس وقت کے ذی حس مسلمانوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر انہیں جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔

علامہ خود سلطنتِ عثمانیہ کے انحطاط سے غم زدہ تھے۔

اگر عثمانیوں پہ کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

سفرِ مملکتِ خداداد کے دوران اس مسافر نے جہاں علامہ اقبالؔ کے مرقد پر حاضری دے کر اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق فاتحہ خوانی کی وہیں پاس میں موجود ترانۂ پاکستان اور

شاہنامۂ اسلام کے خالق جناب حفیظ جالندھری کے مزار پر بھی پیش ہوکر اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔ مصنف نے اس ضمن میں ان شعرا کے علاوہ جستہ جستہ دوسرے شعرا کے اشعار بھی نقل کیے ہیں جو ان صاحبانِ علم ودانش کی قبور کے آس پاس مرقوم ہیں۔ حفیظ جالندھری کے مزار پر ان کے اشعار نقل کر کے مصنف نے اپنے بیان کو موثر بنانے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں اپنی تصنیف میں بڑے اہتمام سے درج کیا ہے۔

امتحان رکھے گئے ہیں جن کی راہوں کے لیے
جلوہ خود بیتاب ہے ان کی نگاہوں کے لیے
نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سائے میں
نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں
تشکیل وتکمیلِ فن میں جو بھی حفیظؔ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں
خدا کے نام سے خوابیدہ بختوں کے جگانے کو
ہوا میں لب کشا افسانۂ ماضی سنانے کو

شاکر صاحب نے دورۂ لاہور کے دوران کشمیر کے اس محسن کی فاتحہ خوانی میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور یوں اپنی قلبی وابستگی اور فکری میلان کا اظہار کیا۔ ان کے مطابق حکومتِ پاکستان نے ان کے مرقد کی تزئین اور تہذیب میں کوئی بھی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا بلکہ نہایت ہی انتظام و انصرام اور تزک و احتشام کے ساتھ اسے قابلِ دید بنایا۔

یہ سفر نامہ یوں تو مصنف کے تہذیبی اور تفکیری رویّوں کا اعلامیہ تو ہے ہی ساتھ ہی ان کے قوتِ مشاہدہ اور ژرف نگاہی کا بھی بین ثبوت پیش کرتا ہے۔ یہ ایک عام انسان کی طرح آنکھیں بند کر کے نہیں چلتے بلکہ میرؔ کی طرح 'ہر جا جہانِ دیگر'' کی دریافت میں مگن رہتے ہیں۔ وہ منزل کی جانب نہایت مستعدی کے ساتھ رواں دواں تو رہتے ہیں۔

جس دن سے چلا ہوں، مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

مگر راستوں کے نشیب و فراز سے کشاں کشاں گزرتے ہوئے انہوں نے ہر مقام کو نہایت باریک بینی اور سنجیدگی سے دیکھا۔ ہر پست چیز کی پستی کے ذمہ دار عناصر کی تلاش کی اور ہر بلند و بالا اور اعلیٰ شان والانشان بھی اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ دیکھا۔ موصوف نے مینارِ پاکستان پر پہنچ کر جس توجہ سے اس کی جزئیات کا بیان کیا وہ ہمارے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش ہوسکتا ہے:

''مینارِ پاکستان کے نچلے حصوں میں سنگِ مرمر پر اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ کندہ ہیں جو کہ عربی زبان میں ہیں اور نظروں کو سرور بخشتے ہیں۔ دوسرے حصے میں اسی طرح بزبانِ انگریزی، اُردو اور ہندی فرمو داتِ قائدِ اعظم درج ہیں۔ ایک اور جگہ حضرتِ علامہ اقبال کی نظم خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ نظر نواز ہوکر دل کے نازک شیشے کو چھوتی ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر ترانۂ پاکستان ''پاک سرزمین شاد باد'' نگاہوں کو لبھاتا ہے۔۔۔''

اس طرح کی مثالیں اس کتاب میں جستہ جستہ دیکھی جاسکتی ہیں جہاں مصنف نے جزئیات نگاری کے تحت ایک موثر اور پُرقوت بیانیہ ترتیب دیا ہے۔

پاکستان کے اس دوسرے دورے کے دوران موصوف نے علامہ اقبالؒ کے فرزندِ ارجمند جاوید اقبال سے ملاقات کا ذکر مناسب تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور علامہ کی صاحبزادی منیرہ سے عدمِ ملاقات کی حسرت کا بھی خوب تذکرہ چھیڑا ہے۔ مصنف چوں کہ خود محکمہ ڈاک سے وابستہ رہے ہیں اس لیے اپنے دورے کے دوران اس محکمہ کے دفاتر کی سیاحت کی اور ان کے کام کاج کا جائزہ بھی لیا۔ علاوہ ازیں جامعہ اشرفیہ لاہور کی زیارت کا بیان بھی اس کتاب کی زینت بڑھانے میں

معاون ومددگار ثابت ہو رہا ہے۔

سفر پاکستان (سوم)

مرزا بشیر شاکر بنیادی طور پر ایک متجسس انسان کا نام ہے جو علمی اور ادبی حالات و واقعات اور ان کی صحت و عدم صحت کے بارے میں ہمیشہ سرگرداں رہتے ہیں۔ اسی تلاش وجستجو اور تحیر و تعاقب نے انہیں تیسری بار پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھنے پر مجبور کیا۔ کتاب میں اس تیسرے دورے کا تذکرہ ''ہمیں بھی یاد کرلینا!!'' کے عنوان سے موجود ہے جو انہوں نے ۱۲/فروری ۲۰۱۶ سے ۲۴/فروری ۲۰۱۶ء تک انجام دیا ہے اس دورہ کے دوران انہوں نے پاکستان کے ایک شہر ایبٹ آباد اور آزاد کشمیر کے مظفر آباد کی سیر وسیاحت کی ہے۔ دراصل ان کے کئی رشتہ دار تقسیمِ برصغیر کے وقت اُس پار رہ گئے تھے جن سے ملنے اور زیارت کی خواہش فطری طور پر ان کے قلب و ذہن کا ایک اہم جز بن گئی۔ اس باب میں انہوں نے تقسیم سے پیدا شدہ مسائل و بحران کا نہایت ہی دل سوزی کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ کس طرح ایک ہی گھر کے افراد بٹ گئے اور کس طرح ان کے درمیان خلیج ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید گہری ہوتی گئی۔ مظفر آباد کے دورے کا تذکرہ نہایت ہی وضاحت وصراحت کے ساتھ درج کیا گیا ہے جس سے اس شہر کے ساتھ مصنف کی ذہنی و جذباتی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ چوں کہ مظفر آباد اِس کشمیر کا ہی ایک نامیاتی حصہ ہے جو ناعاقبت اندیش سیاست دانوں اور ناہنجار راہ نماؤں کی کارستانیوں کی وجہ سے منقسم ہوا ہے اور جسے ایک خونی لکیر نے اپنے اصل سے ایک فاصلے پر رکھا ہے۔

میں ذاتی طور مصنف کو اس سفر نامہ کی اشاعت کے لیے دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب میں علمی سفر کرنے کی آرزوئیں اور امنگیں پیدا کرے تاکہ ہم بھی نابغۂ روزگار شخصیات کے علمی و ادبی کمالات سے بھرپور واقفیت حاصل کر کے ایک صالح معاشرے کی تعمیر وتشکیل میں اپنا اپنا حصہ ادا کرسکیں۔

14۔ سبزار احمد بٹ

کشمیر کے جتنے شعرا، ادبا، اور قلمکاروں نے اردو اور کشمیری زبان وادب کی خدمت کی ہے اور ان زبانوں کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے ان میں مرزا بشیر احمد شاکر کا نام قابل قدر ہے۔ مرزا بشیر احمد شاکر 8 مئی 1950 کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کا نام مرزا غلام محی الدین بیگ تھا۔ کم عمری میں ہی اپنی لیاقت اور ذہانت کی بدولت محکمہ ڈاک میں بطورِ پوسٹ ماسٹر تعینات ہوئے۔ جس وجہ سے ان کی تعلیم اثر انداز ہوئی۔ لیکن ایس پی کالج سرینگر سے فراغت کے بعد نجی طور پر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ مرزا بشیر احمد شاکر نے اردو اور کشمیری زبان میں اپنے قلم سے ایسے جوہر دکھائے ہیں جو بہت ہی کم لوگ دکھا پاتے ہیں۔ انہوں نے کتابوں کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ چند روز قبل مرزا بشیر احمد شاکر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ بشیر صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر انسان دھنگ رہ جاتا ہے۔ ہر طرف سے کتابیں ہی کتابیں ہیں۔ ادبی کتابوں کے ساتھ ساتھ اسلامی کتابوں اور تفاسیر قرآن کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ موجودزمانے میں ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں جو مرزا بشیر شاکر کی طرح کتابوں سے اس قدر محبت کرتے ہوں اسی کتاب دوستی کا نتیجہ ہے کہ اب تک مرزا بشیر احمد شاکر کی آٹھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں ''آوازِ دل'' اور ''لوہتی گلاب'' کشمیری زبان میں تخلیق کی گئی کتابیں ہیں۔ یہ دونوں کتابیں مرزا بشیر احمد شاکر کی اسلام کے تئیں رغبت ومحبت کا بین ثبوت ہے۔ دونوں کتابیں نعت، مناجات اور منقبت پر مبنی ہیں'' آوازِ دل'' کی تقریظ پروفیسر نذیر احمد ملک نے لکھا ہے۔ جب کہ لوہتی گلاب'' نامی کتاب پر سلطان الحق شہیدی، پروفیسر بشیر احمد

نحوی، مولانا شوکت احمد کینگ، پروفیسر مرغوب بانہالی، اور ڈاکٹر شاد رمضان جیسے مستند قلمکاروں نے حوصلہ افزا تبصرے کئے ہیں۔ دونوں کتابوں کے نعوت، مناقب اور مناجات پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے۔ روح کو سکون ملتا ہے مرزا بشیر احمد شاکر نے خط وخیریت نام کی ایک کتاب بھی کشمیری زبان میں تخلیق کی ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ اس کتاب پر عبدالاحد فرہاد نے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں اس کتاب میں مصنف نے وہ تمام خط نقل کئے ہیں جو انہوں نے وقت کے نامور ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں کے نام لکھے ہیں اور وہ سب بھی جو جواباً ان ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں سے موصول ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں مرزا غلام حسن بیگ عارف، پروفیسر مرغوب بانہالی، ارجن دیو مجبور، محمد یوسف ٹینگ، غلام نبی خیال، نشاط انصاری، غلام نبی آتش، پروفیسر شاد رمضان، عزیز حاجنی، پیارے ہتاش، گلشن بدرنی، شاہد بڈگامی، اور متعدد لوگوں کو لکھے گئے خطوط اور ان کے جوابی خطوط شامل کئے گئے ہیں۔ اب اگر چہ خط لکھنے کا زمانہ نہیں رہا یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خط لکھنے کا رواج معدوم ہو گیا ہے لیکن مرزا بشیر شاکر کے خط پڑھ کر انسان ایک عجیب احساس سے لطف اندوز ہو جاتا ہے۔ اور یہ احساس بھی جاگ جاتا ہے کہ افسوس ہم کس اہم اور دل سے جڑی ہوئی صنف سے دور ہو گئے ہیں اور قاری کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ کیوں نہ پھر سے خط وکتابت کے اس عمل کو شروع کیا جائے۔ کیونکہ جو لطف خط لکھنے میں ہے وہ ٹیلی فون پر بات کرنے میں نہیں ہے اگر چہ ٹیلیفون کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا بشیر احمد شاکر نے کشمیری زبان میں ”خط وخیریت“ نام کی ایک کتاب لکھ کر نہ صرف کشمیری زبان پر بلکہ نئی نسل پر احسان کیا ہے۔ خطوط کے ایک ایک لفظ سے چاشنی اور مٹھاس ٹپکتی ہے۔ مصنف کی علمی، ادبی مضامین وتاثرات پر مبنی ”گلرنگ“ نام کی کتاب بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ جس میں مصنف نے کتب خانہ اکبر حیدری کشمیری، جسٹس جاوید اقبال سے ایک یادگار ملاقات، آل اقبال کے ساتھ چند ساعتیں، ہسپتال عبرت کی جگہ جیسے علمی مضامین کے ساتھ ساتھ چند اہم تبصرے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ مصنف نے ”کتابیں ہم نشیں میری“ نام کی دلچسپ کتاب بھی لکھی ہے جس میں بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ کتابوں کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر جتنی بات کی جائے، جتنا کچھ لکھا جائے اتنا کم ہے کیونکہ نئی نسل کتابوں سے بھاگتی جا رہی ہے۔ اگر چہ نئی کتابیں لکھی جا رہی ہیں تاہم اگر نئی نسل کو مطالعہ کی جانب راغب نہیں کیا گیا تو کتاب لکھنے کا مقصد خود بہ خود فوت ہو جائے گا۔ کیونکہ اگر قاری ہی نہیں رہے گا تو لکھنے والا اپنی موت آپ مرے گا۔ مصنف نے ”پوت آلو“ نام کی بھی کتاب لکھی ہے جس میں کشمیر کے نامساعد حالات سے متاثر ہو کر مثنوی نما نظمیں درج ہیں جس سے کشمیر کے حالات ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کشمیری نظموں اور غزلوں پر مبنی ان کی کتاب ”رنگہ ریول“ بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ مصنف نے ”خطوط وسفر نامے“ لکھ کر سفر نامہ کی صنف میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

مرزا بشیر احمد شاکر کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی کتاب ”علامہ اقبالؒ کے دیس میں“ ہے یہ کتاب سفرناموں پر مبنی ہے۔ مصنف کو اولیاء اللہ کی زیارت گاہوں پر جانے کا شوق بہت پہلے سے رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں مصنف نے بہت ساری زیارت گاہوں پر حاضری دی ہے۔ زیارت گاہوں کا شوق اور علامہ اقبال سے عقیدت کے نتیجے میں مصنف تین بار پاکستان جا چکے ہیں تینوں سفرناموں کو الگ الگ ناموں سے قلمبند کیا ہے۔ پہلے سفرنامے کو ”علامہ اقبالؒ کے دیس میں“ دوسرے سفرنامے کو ”لیلائے تمنا کی آغوش میں“ اور تیسرے سفرنامے کو ”ہمیں بھی یاد کر لینا“ کے نام محظوظ کر لیا۔ مصنف نے ان اسفار کے دوران

علامہ اقبال کی زیارت گاہ کے ساتھ ساتھ حفیظ جالندھری کی زیارت گاہ پر بھی حاضری دی۔ مصنف نے اسفار پاکستان کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے اور اقبال کی زیارت گاہ پر تلاوت بھی کی ہے اور تصویریں بھی لی ہیں۔ مصنف علامہ اقبال کے فرزند ارجمند جسٹس جاوید اقبال سے بھی مل چکے ہیں اور ان کی صاحبزادی محترمہ منیرہ سے بھی ملاقات کی ہے اس وقت محترمہ کی عمر 75 سال تھی۔ اس حوالے سے مرزا بشیر شاکر لکھتے ہیں کہ۔" چند ثانیوں کے بعد ہی محترمہ منیرہ اپنی نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ میں احتراماً کھڑا ہوا اور فرط مسرت سے ان کے ماتھے کو بوسہ دیا۔ ایک نہیں دو بار۔ محترمہ بیٹھ گئیں۔ کبرسنی، سر کے بال بالکل سفید، عمدہ لباس زیب تن، خوش رو، میانہ قد، سبحان اللہ" مرزا بشیر احمد نے جسٹس جاوید اقبال اور محترمہ منیرہ کے ساتھ تصویریں بھی لی ہیں۔ یاد رہے کہ ان دنوں تصویر لینا اتنا آسان نہ تھا۔ کیونکہ کیمرے اتنے عام نہ تھے۔ مصنف کو کیمرہ حاصل کرنے کے لیے سخت مشقت کرنی پڑی۔

علامہ اقبال کی صاحبزادی نے مصنف کو ایک شال بھی اوڑھا ہے جو مصنف نے بڑی محبت اور عقیدت سے سنبھال کے رکھا ہے۔ جو ان کی اقبال دوستی بلکہ اقبال شناسی کا بین ثبوت ہے۔ مرزا بشیر احمد شاکر نے اس پلنگ کی بھی تصور لی ہے جس پر حکیم الامت جناب علامہ اقبال نے آخری سانسیں لی ہیں۔ اور علامہ اقبال کی نوادرات کے ساتھ بھی تصویر لی ہے۔

مرزا بشیر احمد شاکر اس حوالے سے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں" کہ علامہ اقبال کی ابدی خواب گاہ سنگ مرمر کی بنی ہے جس پر یہ عبارت کندہ ہے

اِنَ مِن الشعر لحکمۃ
وَ اِن من البیان لجرا
نہ افغانیم ونہ ترک و تاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو برما حرام است
کہ ما پروردہ یک نو بہاریم

اس لوح مزار پر فارسی میں ایک عبارت بھی درج ہے۔ مقبرۂ اقبال کے فرش پر سنگ مرمر کی خوبصورت تختیاں تزئین کاری کا عمدہ نمونہ ہیں اور دیواروں کے چاروں طرف علامہ اقبال کے دلنشین اشعار کندہ کرائے گئے ہیں"۔

علامہ اقبال نے اپنے وقت میں کہا تھا کہ

زیارت گاہِ اہل عظم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

مرزا بشیر احمد شاکر خود لکھتے ہیں کہ یہ اولیا اللہ کی زیارت گاہوں کا شوق اور علامہ اقبال سے میری عقیدت ہے جو مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ اور میرا یہ سفر محض ایک ادبی سفر تھا۔

مرزا بشیر شاکر نے" کتابیں ہم نشین میری" نام کی ایک نظم بھی تخلیق کی ہے جو مختلف اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار یوں ہیں۔

کتابوں سے مجھے اپنی کہوں کیا؟ کیسی الفت ہے
یہ میرا وہ اثاثہ ہیں جو سچ مچ بیش قیمت ہے
کتابیں رہنما ہوتی ہیں جو رستہ دکھاتی ہیں
کہاں جانا ہے کیا کرنا ہے یہ ہم کو سکھاتی ہیں
کتابوں کے مطالعہ سے میرا دل شاد رہتا ہے
اور اک گو نہطراوت اور فرحت یہ بخشتا ہے

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرزا بشیر احمد شاکر کو نظم ونثر پر یکساں عبور حاصل ہے۔ بارہ مولہ کے ایک معروف قلمکار خالق پرویز نے مرزا بشیر احمد کی ادبی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ایک خوبصورت نظم لکھ کر ان کا قلمی چہرہ پیش کیا۔ جو کہ مرزا بشیر احمد شاکر کے لیے کسی بڑے تحفے سے کم نہیں ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

ادھر پاس رہتا ہے مرزا بشیر
وہ ہے دوست میرا بڑا بے نظیر
قلمکار، شاعر، وہ سیار ہے
وہ شوقِ سفر کا بھی دلدار ہے
سفر کر چکا ہے وہ اکثر دیار
گیا ہے وہ ویزا پہ سرحد کے پار
لحد پر وہ اقبال کے بھی گیا
ملاقات بیٹی سے انکی کیا
کھلے دل وہاں سب نے تعظیم کی
اسے شال دے کر تعظیم کی
نظم اور نثر کا بھی استاد ہے
کھرے اور کھوٹے کا نقاد ہے

بشیر نحوی صاحب مرزا بشیر احمد شاکر کی شخصیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''انہیں پوسٹ ماسٹر کے بجائے کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر یا پھر کسی کالج کا لیکچرر یا استاد ہونا چاہئے تھا'' مرزا بشیر احمد شاکر آج بھی بڑے آب و تاب سے ادبی سرگرمیاں انجام دے رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان میں کچھ کرنے کی لگن ہو، کچھ کرنے کا جذبہ اور پختہ ارادہ ہو تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے بلکہ پھر پوری دنیا اسے اپنے مقصد میں کامیابی دلانے کی سازش میں لگ جاتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ مرزا بشیر احمد شاکر کے ادبی کارناموں پر اس مختصر سے مضمون میں مکمل طور پر بات نہیں ہو سکتی ہے نہ ہی اس مختصر سے مضمون میں ان کے تخلیقی کارناموں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے اللہ کرے کہ ایسے بے لوص، ہمدر اور ملنسار، علم دوست قلمکاروں کا سایہ اردو اور کشمیری ادب پر بنا رہے۔

اک روشنی سی رہتی ہے ہر وقت آس پاس
تاروں کا شہر گھوم کے آئے ہوئے ہیں ہم

علامہ اقبال اور مرزائیت (ص 127 سے آگے)

اپنی بصیرت افروز کتاب یعنی علامہ اقبال اور مرزائیت میں ڈاکٹر اشرف آثاری علامہ اقبال کے خلاف لگائے گئے بے ہودہ الزامات کا بھرپور جواب دیتے نظر آتے ہیں کہ وہ کیسے اور کس طرح مرزائیت سے متاثر ہوئے تھے اور کس طرح حالات کے تناظر میں اپنے بیانات دیئے تھے۔ پھر یکا یک علمائے اسلام کی وضاحتوں اور مرزائے قادیانیت کے کھلم کھلا دعویٰ نبوت سے مرزائیت کی تردید کی تھی اور برابر ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو بھی اپنے دلائل اور حقیقت مرزائیت سے باخبر کر کے مطمئن کیا تھا۔

راقم کی نظر میں یہ کتاب بہت ہی اہم ہے اور علامہ کے تئیں ڈاکٹر صاحب کی طرف سے بہترین نذرانہ ہے اور مرزائیت کی کمزور بنیادوں والی عمارت کو گرانے اور زمین بوس کرنے کے لیے بہترین آلہ ہے۔

میری رائے میں اگر ڈاکٹر آثاری صاحب علامہ انور شاہ صاحب اور اُن کے مرزائیت کے خلاف جہاد کے حوالہ سے (مقدمہٗ بہاوٗلپور) ایک اور باب کا اضافہ کر دیتے تو اس طرح کتاب کی اہمیت اور افادیت میں چار چاند لگ سکتے تھے۔ یوں بھی موصوف وسیع المطالعہ نظر آتے ہیں اور اسلامیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں آگے محققوں کو اس موضوع پر کام کرنے کے لیے ڈاکٹر آثاری کی کتاب رہنما کا کام دے سکتی ہے اور وہ اس سے بہت استفادہ کر سکتے ہیں۔ ایسی کتاب کے لیے معیاری چھپائی کی ضرورت تھی مگر کتاب کی سیاہی غیر معیاری لگتی ہے۔ یہ کتاب کے ٹائٹل پر حضرت علامہ کی قلمی تصویر بہت ہی جاذب نظر ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی علمی کاوشیں آئندہ بھی جاری رکھیں گے اور اس طرح کی کتابیں اپنے قارئین کی خدمت میں بطور سوغات پیش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آثاری صاحب کو سلامت رکھیں، خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

مضامینِ شاکر

یہ باب مرزا بشیر احمد شاکر کے منتخب مضامین پر مشتمل ۔۔۔ ایڈیٹر

آلِ اقبالؔ کے ساتھ چند ساعتیں

خانوادہ شاعر مشرق کا ہے رشکِ جہاں

شہر نگاراں لاہور شہر کی مختصر سیاحت کے بارے میں اپنے ناچیز تاثرات قلمبند کرنے سے پیش تر یہ لکھنا مناسب سمجھتا ہوں کہ مجھے اس سے قبل بھی دو دفعہ اس شہر میں گھومنے پھرنے کا موقع میسر ہوا۔ اس شہر کی اپنی ایک شاندار تاریخ ہے۔ یہ صدیوں سے تہذیب و تمدن اور علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے شہر لاہور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ زندہ دلوں کا شہر کہلاتا ہے۔ یہ پرانی اور نئی اقدار اور روایات کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ یہاں بہت ساری نامور شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ لاہور کی تاریخی تہذیبی علمی اور ثقافتی زندگی پر اسکالروں' سیاحوں اور مصنفین نے بے شمار کتابیں تحریر کی ہیں۔ اس عظیم شہر کو ایک شرف و امتیاز یہ ہے کہ یکتائے زمانہ لعل بدخشاں اور گوہر نایاب کشمیری الاصل علامہ شیخ محمد اقبال کا مسکن و ابدی آرام گاہ دونوں یہیں پر موجود ہیں۔ محسن قوم وملت اور شاعر ذیشان علامہ اقبالؔ کی محبت مجھے تینوں بار لاہور کھینچ کے لے گئی تھی۔ اپنے اسفار کے دوران ہر بار مجھ خطا کار کو یہاں گنج بخش حضرت سید علی ہجویریؒ کے روضے اور حضرت علامہ اقبالؔ کے مرقد پر حاضری نصیب ہوتی رہی۔ اسی کے ساتھ بادشاہی مسجد لاہور میں موجود دیگر تبرکات اور آثار کی زیارت سے بھی مشرف ہوا۔ تاریخی شاہی مسجد کی دیوار کے سایہ میں حضرت اقبالؔ اپنی تمنا کے مطابق محوخواب ہیں اور آپ نے بجا طور پر یہ فرمایا۔

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

زندہ دلان لاہور کے اس شہر میں دوسری بار جانے کے موقع پر مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ عظیم المرتبت شاعر مشرق کے فرزند جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ آپ نے اکرام مسلم اور مہمان نوازی کے طور پر مجھے خوش آمدید کہا' تحفتاً اپنی کتاب ''زندہ رود'' کی تلخیص کا ایک نسخہ بھی مرحمت فرمایا۔ میرے سفرنامہ لاہور کی روداد ''کشمیر عظمیٰ'' میں پہلے ہی شائع ہو چکی ہے۔ ان سطور میں ایک دن کا مختصر سفر لاہور پیش خدمت ہے۔ ایبٹ آباد سے واپسی کا اجازت نامہ ہاتھ میں لیے میں اپنے عزیز و اقارب سے گلے ملا اور رات کو بذریعہ نیازی بس سروس سفر کر کے صبح ٹھیک پانچ بجے لاہور کے تاریخی اور تمدنی شہر میں پہنچا۔ ابھی صبح کاذب ہی تھی۔ یہاں طے شدہ پروگرام کے مطابق میرے میزبان محترم ذوالفقار علی صاحب کوئی آدھے گھنٹہ بعد گاڑی میں میرے سامنے کھڑے ہوئے' علیک سلیک

کی گرم جوشی سے بغل گیر ہو گئے، گاڑی میں بٹھا کر اپنے دولت خانہ واقع نیو مسلم ٹاؤن لاہور لے آئے۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد ناشتہ کیا اور میزبانی کے پورے آداب کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ سلمیٰ صاحبہ مجھ سے ہم کلام ہوئیں اور خیر و عافیت دریافت کی۔ موصوفہ پاکستان میں محتاج تعارف نہیں۔ وہ کئی بہترین کتابوں کی مصنفہ ہیں، کئی بے مثال ناول تحریر کئے ہیں، سفرنامے لکھے ہیں اور غالباً بحیثیت پرنسپل تدریسی خدمات بھی انجام دے رہی ہیں۔ ان ہی کے مشورے پر میں نے لاہور میں دن بھر کا پروگرام ترتیب دیا۔ یہ محترمہ کی مہمان نوازی اور علم دوستی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ انہوں نے ذاتی طور پر فون کر کے مجھے ان حضرات سے ملایا جن سے ملاقات کی شدید خواہش تھی۔ اس طرح ایک دن کا یہ مختصر قیام میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ دونوں میاں بیوی نے از راہ شفقت و محبت اپنے ڈرائیور کو گاڑی دے کر میرے ہمراہ رکھا۔ ڈرائیور عبدالحمید بڑا خوش اخلاق اور مہذب شخص ہے اور عمر کے لحاظ سے میرے بیٹے کے برابر ہے۔ آپ نے پورے ادب و احترام کے ساتھ میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ حسب خواہش اپنے عشقِ حضرت اقبالؔ کی لاج رکھتے ہوئے سب سے پہلے میں نے اقبالؔ صلاح الدین (محترمہ منیرہ صلاح الدین یعنی علامہ اقبالؔ کی صاحبزادی کے فرزند اور دانائے راز کے نواسے) کے گھر کی راہ لی۔

مجھے مہمان خانے میں بٹھایا گیا اور افرادِ خانہ خندہ پیشانی سے میرے ساتھ محو گفتگو ہوئے۔ میں نے جناب اقبال صلاح الدین سے گذارش کی کہ جسٹس مرحوم ڈاکٹر جاوید اقبال (فرزند اقبال) کے مقبرے پر فاتحہ خوانی کی بے حد خواہش ہے۔ موصوف نے بلا تاخیر اپنے ایک ملازم محمد خان کو ہمارے ساتھ چلنے کا حکم دیا جو کہ گاڑی میں بیٹھ کر مقبرے تک لے گئے۔ چونکہ سفر طویل تھا اور سڑکیں تعمیری پلان کی وجہ سے اُکھڑ گئی تھیں اس لیے کوئی ایک گھنٹہ بعد بیگم پورہ لاہور پہنچ گئے۔ بیگم پورہ میں ایک دینی بزرگ حضرت ایشان کا آستانہ ہے۔ اسی کے ملحق ایک قبرستان ہے جو چاروں جانب سے دیوار بند ہے۔ یہاں کچھ قبریں ہیں جن کے اوپر خوبصورت لوحِ مزار نصب ہیں، ان میں مرحومین کے نام، تاریخ وفات اور کچھ قرآنی آیات یا اشعار کندہ ہیں۔ راقم کو چند ماہ قبل وفات یافتہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی قبر کی تلاش تھی۔ یہ قبر خالص مٹی سے ابھاری گئی ہے اس کے اوپر سبز رنگ سے آراستہ چادر بچھی ہوئی تھی جس پر قرآنی آیات درج ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قبر کی پختہ تعمیر اور اسے بطور یادگار بنانا مرحومہ کی اہلیہ محترمہ جسٹس ناصرہ اقبال (ریٹائرڈ) کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کس نقش پر اپنے شوہر نامدار اور شاعر مشرق کے لاڈلے کی مقبرے کی تعمیر چاہتی ہیں۔ جاوید اقبال صاحب ۱۳/ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو ۹۱ سال سے زائد عمر میں وفات پا گئے۔ مرحوم ڈاکٹر جاوید کی قبر کے ساتھ ان کے والد نسبتی ڈاکٹر عبدالوحید الصدق الحاج مولوی فیروز الدین بانی چیئر مین فیروز سنز لیبارٹریز لمیٹیڈ فرزند اقبال کی خوش دامن مرحومہ بیگم سعیدہ او ران کے برادر نسبتی الحاج وحید حلف الصدق ڈاکٹر عبدالوحید کی پختہ قبریں موجود ہیں۔ ان کے اوپر خوب صورت لوحِ مزار نصب ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی وصیت کے مطابق ان کو اپنے والد نسبتی اور خوش دامن کے پاؤں کے زیریں دفنایا گیا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت مرحومین کی قبور کو اپنے انوارات سے منور کرے اور ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین۔

قبرستان بیگم پورہ سے واپس ہو کے اقبال صلاح الدین صاحب کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ آپ نے اپنے ملازم کے ہمراہ مجھے اپنے نئے قائم شدہ ادارے ”دبستان اقبال“ بھیجا جو کہ اقبالیات اور علامہ کے فکر و فن اور پیغام کو عام کرنے کی غرض

سے قائم کیا گیا ہے۔یہ عمارت بھی دیدہ زیب ہے' چار پانچ کمروں پر مشتمل یہ دبستان پوری آن بان اور شان وشوکت کے ساتھ موجود ہے۔ایک کمرے کی دیواروں پر مفکرِ اعظم ڈاکٹر علامہ اقبال کی عمدہ تصویریں اوران کے بہت سارے ہم عصر ادیبوں اور دیگر دانش وروں کی اچھی تصویریں آویزاں ہیں۔فریم بند شیشوں میں رکھی گئیں سنہری سیاہی سے مرقوم علامہ کی نظمیں اور بے شمار اردو/ فارسی اشعار دیواروں پر منقش ہیں۔اقبال اور اقبالیات سے متعلق بہت ساری معیاری کتابیں یہاں موجود ہیں۔ادارے کی طرف سے مجھے انگریزی زبان کی دوعدد کتابیں فرحمت کی گئیں۔میں عمدہ تاثرات اور نیک جذبات کے ساتھ ''دبستان اقبال'' سے رخصت ہوکر پہلے سے ہی طے شدہ ملاقات کے لیے شاعرِ مشرق کی صاحبزادی محترمہ منیرہ صلاح الدین کے گھر حاضر ہوا۔یہاں مجھے مہمان خانے میں بٹھایا گیا۔چند ثانیوں کے بعد محترمہ منیرہ اپنی نرس و خادمہ کے ساتھ تشریف آور ہوئیں۔میں احتراماً کھڑا ہوگیا اور سلام کر کے ان کا محبتوں سے استقبال کیا کہ شاید الفاظ کے قالب میں وہ جذبات ڈھل نہیں سکتے۔محترمہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔کبرسنی کا عالم' علامہ اقبال کی یہ لاڈلی شرافت ونجابت کی علامت' سر کے بال برف جیسے سفید' عمدہ لباس زیب تن' خوش رو' میانہ قد' سبحان اللہ۔محترمہ نے خیریت پوچھی اور کچھ تعارف بھی ہوا۔ سرینگر سے شائع ہونے والے میں نے ''حکیم الامت'' کا ایک شمارہ اپنے ساتھ رکھا تھا' وہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔اس میں ان کے مرحوم برادر جسٹس جاوید اقبال سے متعلق میرا مضمون شامل اشاعت تھا اور سرورق پر ان کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے میری تصویر تھی۔انہوں نے بخوشی رسالے کو لیا۔میرے لیے مشروب کا ایک گلاس منگوایا۔اس دوران کچھ باتیں ہوئیں۔محترمہ نے اپنی بیماری کا کچھ تذکرہ کیا' تلاوت قرآن کی بات چھیڑی۔

دوران گفتگو منیرہ صاحبہ نے فرمایا کہ علامہ کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف سات سال تھی' بولیں کہ ہاں اتنا یاد ہے کہ ایک دفعہ دن کو ان کے یعنی علامہ کے بستر ے میں سوئی ہوئی تھی اتنے میں پنڈت جواہر لعل نہرو علامہ کی خدمت میں آئے مگر علامہ کے احترام میں کرسی کے بجائے فرش پر بیٹھ گئے۔فرمایا اس وقت علی بخش گھریلو خادم نے مجھے ابو کے بسترے سے اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے ضد کر کے اٹھنے سے انکار کیا۔پھر علامہ نے مجھے اپنے بسترے سے اٹھانے سے منع کیا۔

محترمہ منیرہ صاحبہ سے ملاقات جتنی طوالت کھینچتی اتنا مفید تھا مگر ان کی مشغولیات اور اپنی مجبوریاں بیچ میں حائل تھیں۔اب ان سے اجازت لی' ان کے دولت خانہ سے رخصت ہوکر اپنے میزبان محترم ذوالفقار علی صاحب کے گھر آکر کچھ دیر محو استراحت ہوا۔ کچھ دیر ذرا ستانے کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق مجھے معروف اقبال شناس پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے گھر منصورہ جانا تھا۔ میزبان کے ارشاد کے مطابق میرے ساتھ ان کا دوسرا ڈرائیور عقیل گاڑی لے کر چل نکلا۔ہم شاہراؤں اور بازاروں کو چیرتے ہوئے کوئی پانچ بجے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے گھر پہنچ گئے' موصوف میری آمد کے منتظر تھے۔اس چیز کو بھانپ کر کچھ ندامت بھی ہوئی کہ اتنے عظیم دانش ور' ماہر اقبالیات' بہت ساری کتابوں کے مصنف اور اس قدر مہمان نواز اور بااخلاق! پروفیسر صاحب اپنی شفقت اور محبتوں کے ڈونگرے برساتے رہے' یہاں چائے نوشی کی۔ موصوف نے تحفتاً کچھ کتابیں اپنے دستخطوں کے ساتھ مرحمت فرمائیں' رخصت لی تو کتابوں کا بنڈل خود اٹھانے لگے جو کہ میں نے احتراماً ان کے ہاتھ سے چھین لیا اور وہ باہر تک ساتھ آئے۔ منصورہ بھی لاہور میں ایک مشہور و معروف جگہ ہے' جہاں جماعت اسلامی کا مرکزی دفتر ہے۔ یہاں ایک عالی شان مسجد

اور جماعت کے دیگر دفاتر واقع ہیں۔دیر ہونے کی وجہ سے میں یہاں نہ رک سکا' بس ادھر ادھر ایک سرسری نگاہ دوڑائی۔راستے میں سجے سجائے دوکانوں' شاپنگ مالوں اور دفاتر کی بھیڑ بھاڑ دیکھتے رہے۔ چاروں طرف دکانوں' دفاتر اور مساجد کے سائین بورڈ اردو کے جلی حروف میں لکھے ہوئے نظر آئے اگرچہ انگریزی کا بھی یہاں چلن ہے۔یہاں سے واپس لوٹتے ہوئے میں نے گاڑی میں ہی اپنے ڈرائیور کے ذریعہ میڈم منیرہ کے ساتھ بذریعہ فون رابطہ کیا اور اُن کے ساتھ چند ایک فوٹو گراف لینے کی اجازت مانگی۔آپ نے میری دلی مراد کو شرف قبولیت سے نوازا۔یوں دوبارہ ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔اس وقت بھی آپ نے مسکراہٹوں کے ساتھ استقبال کیا' ان کی خاص خادمہ ان کے ہمراہ تھیں۔مہمان خانے میں داخل ہوتے ہی محترمہ منیرہ صاحبہ نے اپنے ہاتھوں سے تحفہ کے طور پر میرے کندھوں پر پشمینہ کا ایک دوشالہ ڈال دیا۔سبحان اللہ ! یہ اکرام اور عزت افزائی! چائے سے فراغت کے بعد چند تصویریں لیں۔اس احترام اور اکرام کے لیے محترمہ منیرہ صاحبہ کا شکر گذار ہوں۔شام ڈھلنے سے دیر تک عالمی شہرت یافتہ شاعر و مفکر اعظم اور محسن قوم وملت علامہ اقبالؒ کی صاحبزادی کے گھر رُکا رہا۔اس دوران ان کے لائق فرزند جناب اقبال صلاح الدین صاحب دوبارہ میرے پاس آگئے۔انہوں نے اور باتوں کے علاوہ بتایا کہ آنٹی ڈورس جو کہ خود حضرت علامہ نے اپنے فرزند جاوید اقبال اور بیٹی منیرہ کی نگہداشت اور پرورش کے لیے یورپ سے لائی تھیں۔اقبال صلاح الدین نے اسے بڑھاپے کی حالت میں یورپ کے اولڈ ایج ہوم سے لاہور لایا جہاں ان کا بعد میں انتقال ہوا۔گفت وشنید کے اخیر پر ان سے بغل گیر ہو کر اجازت چاہی' انہوں نے نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا۔میں اپنے میزبانوں کے گھر نیو مسلم ٹاون لاہور واپس لوٹا۔دل میں خوشیوں اور روحانی مسرتوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔رات وہاں آرام کیا اور صبح ناشتے کے بعد گھر میں موجود بیٹیوں سے رخصت لے لی اور عزیز القدر حمید نے گاڑی میں بٹھا کر واہگہ سرحد پر رخصت کیا۔قانونی لوازمات سے فارغ ہو کر اور سرحدوں کو چھوڑ کر براستہ امرتسر کشمیر کی راہ لی۔لاہور کے اس ایک دن کے قیام کو میں اپنی حیاتِ مستعار کا اہم ترین یادگار دن سمجھتا ہوں کہ میرا یہ سارا دن علامہ اقبالؒ کے اہل خانہ کے ساتھ گذر گیا۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط المستقیم پر گامزن فرمائے اور اقبالی خوابوں کے اینٹ گارے سے تعمیر مملکتِ خداداد کو امن وامان کا گہوارہ بنائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہان آمین آباد

تقی عابدی خصوصی شمارہ

(ص 61 سے آگے)

بھی صد مبارک باد کے مستحق ٹھہرتے ہیں کہ جنھوں نے تقی عابدی کے اعزاز میں ''حکیم الامت'' کا یہ شاندار اور جاندار نمبر نکال کر ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ایسے ہی باہمت افراد کے لیے کہا گیا ہے۔

ایں کار از تو آید و مردان چنیں کنند

میں کوئی ڈگری یافتہ اسکالر یا ادیب نہیں ہوں' حکیم الامت کے اس عمدہ ترین شمارے کی رنگینی اور معنوی رعنائیوں سے متاثر ہو کر جو کچھ بھی میرے دل میں القا ہوا بے کم وکاست اس کو ورطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی۔باریک بینی سے پڑھنا اور درستی ونادرستی کا بھرپور جائزہ لینا سرزمین پنجاب سے تعلق رکھنے والے دانشور جناب کرشن بھاؤک کا کام ہے۔اللہ ان کو بھی سلامت رکھے۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی شخصیت

شیخ الحدیث مولانا محمد انظر شاہ کشمیری ثم دیو بندی مرحوم نے لکھا ہے کہ:

''اس فانی کائنات کو کیا کہیے؟ فنا اس کی تقدیر، ہر چیز کے لیے فنا مقدر، باقی رہنے والا صرف ایک یعنی خدائے دوجہاں، کچھ اور چیزوں کے لیے بقا کی اطلاع مگر آخر کار ان کے لیے بھی ایک وقت پر فنا، یا جسے ہم اور آپ قیادت کہتے ہیں۔ اس وقت تک باقی پھر فنا کا سناٹا، انبیاء (علیہم السلام) اُٹھ گئے۔ مقدس رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس تیرہ و تاریک دنیا سے اپنا جسد اطہر لے کر رخصت ہوئے۔ خیر القرون کی صف لپیٹ دی گئی اور اس سے متصل ادوار کی ہزار ہا ہزار علماء پیوندِ خاک قطار اندر قطار دانشور زیر خاک نمناک، بہادر اور جیالے تو دہ زمین کے نیچے جنہوں نے اپنی جنگجوئی سے بڑے بڑے معرکے سر کیے، ان کا جیالا پن موت کے سامنے عاجز، آہنی پنجے موڑنے والے موت کے پنجے سے خود کو رستگاری نہ دلا سکے۔ تدبیر ناکام، تدبر فرو ماندہ سیاسی داؤ پیچ، اس ناگزیر مرحلہ میں ششدر''۔

درج بالا حقائق اور پُر مغز و بصیرت افزا کلمات کا ذہن و دل میں عکس لیے جب راقم السطور نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر ظفر حیدری مدیر ''حکیم الامت'' سرینگر کی زبان سے بذریعہ ٹیلی فون یہ جانکاہ خبر سن لی کہ بیسویں صدی کے عظیم مسلم دانشور، مفکر اور شاعر حضرت علامہ اقبال کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال نے انتقال کیا ہے، تو بے ساختہ راقم کی زبان عاجز بیان پر قرآن شریف کی یہی موت کو یاد دلانے والی آیہ شریف جاری ہوگئی یعنی اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ راجعُون۔ یہ خبر سن کر کچھ ثانیوں کے لیے مجھ پر کچھ سکتہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے گجرات، لاہور اور لدھیانہ کے گھرانوں میں تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی بیرسٹر آفتاب اقبال کی والدہ تھیں جن کا انتقال مارچ ۱۹۴۷ء میں ہوا اور دوسری بیوی نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ تیسری بیوی لاہور کی تھیں۔ ان کے بطن سے جاوید اقبال اور منیرہ پیدا ہوئے۔ اُن کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء میں ہوا تو جاوید سلمہٗ کی عمر گیارہ سال اور منیرہ کی عمر پانچ برس کی تھی۔ جاوید اور منیرہ عمر میں چھ سال کی چھوٹائی بڑائی ہے۔ جاوید ۱۹۲۴ء میں اور منیرہ ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئی۔

(بحوالہ روزگار فقیر جلد اول)

ڈاکٹر جاوید اقبال جن کو اب مرحوم لکھتے ہوئے میرا قلم کانپ رہا ہے اور زبان گنگ سی ہوگئی ہے، اپنے بچپن کے واقعات اور اپنے والد گرامی جناب ڈاکٹر اقبال کی شفقت پدری کا یوں اظہار کرتے ہیں:

''والدین اپنے بچوں کو اکثر پیار سے بھینچا کرتے ہیں۔ انہیں گلے سے لگاتے ہیں انہیں چومتے ہیں مگر مجھے ان کے (علامہ اقبال) خدوخال سے کبھی اس قسم کی شفقت پدری کا احساس نہیں ہوا۔ بظاہر وہ کم گو اور سرد مہر سے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے منہ اٹھائے کبھی ادھر ادھر بھاگتے دیکھ کر مسکراتے تو مربیانہ انداز سے عجیب مخدومانہ التفات کی شان سے، گویا کوئی انہیں مجبوراً مسکرانے کو کہہ رہا ہو اور بعض اوقات تو میں انہیں اپنی آرام کرسی یا چارپائی پر آنکھیں بند کیے اپنے خیالات میں مستغرق پاتا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انہیں مجھ سے محبت نہ تھی، سراسر غلط

ہے اُن کی محبت کے اظہار میں ایک اپنے طرز کی خاموشی تھی جس میں عنفوانِ شباب کے وقتی ہیجان کا فقدان تھا۔اس محبت کی نوعیت فکری یا تخیل تھی جس تک پہنچنے کی اہلیت میرا ذہن نارسانہ رکھتا تھا۔شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میں ان کے بڑھاپے کی اولا دتھا۔ بہر حال جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ان سے محبت کرنے کے بجائے خوف زیادہ کھاتا تھا۔ مجھے اپنے خاندان کے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ میری پیدائش سے کئی سال پیشتر ابا جان حضرت مجددؒ (مجدد الف ثانی) کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دعا کی کہ اللہ انہیں ایک بیٹا کرے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے اپنے ساتھ لے کر دوبارہ سرہند شریف پہنچے۔اس سفر کے دھندلے سے تصورات میری نگاہوں کے سامنے ابھرتے ہیں۔

میں اُن کے ہمراہ اُن کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہو رہا ہوں۔گنبد کے تیرہ وتار مگر پُر وقار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت سی طاری کر رکھی ہے۔پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے چاروں طرف گھور رہا ہوں، جیسے میں اس مقام کی خاموش ویرانی سے کچھ شناسا ہوں۔ابا جان نے مجھے اپنے قریب بٹھایا، پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ منگوایا اور دیر تک پڑھتے رہے۔اس وقت صرف ہم دوہی مقبرے میں موجود تھے۔گنبد کی خاموش اور تاریک فضا میں ان کی آواز کی گونج ایک ہولناک ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔میں نے دیکھا ان کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔خیر دو ایک روز وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم گھر واپس آ گئے۔لیکن مجھ پر اس راز کا انکشاف نہ ہوا کہ آخر اس مزار پر جانے کا مقصد کیا تھا اور وہ آنسو کیوں؟ مجھے یاد ہے میں بچپن میں اکثر یہی سوچا کرتا''۔

اسی طرح اپنی ماں کے انتقال کرنے پر یہ لائق فرزند یوں لکھتا ہے:

''اماں جان کے انتقال کے بعد ہم دونوں بچے ابا جان کے زیادہ قریب آ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جس وقت اماں جان فوت ہوئیں تو ہم دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے روتے روتے ابا جان کے کمرے کی طرف گئے وہ حسب معمول اپنی چار پائی پر نیم دراز تھے کیونکہ ان دنوں خود بھی بیمار رہتے تھے۔گلا بیٹھ چکا تھا صاف نہ بول سکتے تھے۔میں اور منیرہ اُن کے دروازے تک پہنچ کر ٹھٹھک سے گئے۔یوں روتے کھڑا دیکھ کر انہوں نے انگلی کے اشارے سے ہمیں قریب آنے کو کہا اور جب ان کے قریب پہنچ گئے تو اپنے ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھالیا پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر خفگی سے مجھ سے یوں گویا ہوئے۔ ''تمہیں یوں نہ رونا چاہیے یادرکھو تم مرد ہو مرد کبھی نہیں رویا کرتے۔''

جسٹس جاوید اقبال اپنے ماضی کے دریچوں سے جھانکتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں۔

''ابا جان کے عقیدت مندوں میں سے ایک حجازی عرب بھی تھا جو کبھی کبھار انہیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ اس عرب کی آواز بڑی پیاری تھی۔جب اس سے قرآن مجید سنتے تو مجھے بلا بھیجا کرتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ایک بار اس نے سورۃ مزمل پڑھی اور آپ اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔جب وہ ختم کر چکا تو آپ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے ''تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیے'' اسی طرح مجھے ایک مرتبہ مسدس حالی پڑھنے کو کہا اور خاص طور پر وہ نظم جب کسی قریب بیٹھے ہوئے نے کہہ دیا'' وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' تو آپ آبدیدہ ہو گئے۔میں نے اماں جان کی موت پر انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا۔

مگر قرآن مجید سنتے وقت یا اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام کسی کی نوکِ زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں''۔

جناب خالد نظیر صوفی اپنی کتاب ''اقبال درونِ خانہ'' میں ڈاکٹر جاوید کے بارے میں درج کرتے ہیں کہ:

''جاوید کو بچپن میں 'ببّا' کہہ کر پکارتے تھے اور اس کے کھیلنے کے لیے بکری کا ایک بچہ بھی رکھ لیا گیا تھا۔ جسے وہ بعض اوقات کے لیے پھراتا تھا۔ ایک روز جاوید بکری کے بچے سے کھیل رہا تھا حضرت مرحوم زنانے میں گئے تو ایک چار پائی پر بیٹھ کر جاوید کا کھیلنا بھی دیکھ رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ والدۂ جاوید کو خدا جانے یکا یک کیا خیال آیا کہ حضرت مرحوم سے مخاطب ہو کر کہا آپ نے بے شمار شعر کہے لیکن جاوید کے متعلق کبھی کچھ نہ کہا۔ حضرت نے فرمایا یہ کون سا مشکل کام ہے لو ابھی کہہ دیتے ہیں۔

پنجابی میں چند شعر کہے

اک سی ببّا بکری والا ہتھ وچ رکھ دا ڈنڈا
نانی جو اوہنوں پھڑن لگی نسیا مار پچھنڈا
کھاندا بھابی ببّا بکری والا
نالے توس تے انڈا نالے کھاندا حلوہ منڈا
بھابی ببّا بکری والا

ڈاکٹر جاوید اقبال اپنے بچپن کے تعلق سے یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''ابا جان کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ دبے پاؤں زنانہ میں آیا کرتے اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پاتی۔ بہر حال جب بھی اماں جان مجھے کھانا کھلا رہی ہوتیں ان کا دھیان باہر ہی رہتا اور جونہی وہ ابا جان کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ بھی سنتیں تو اپنا ہاتھ پھرتی سے علیٰحدہ کر کے چمچہ میرے آگے رکھ دیتیں اور میں خود کھانا کھانے میں مشغول ہو جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ ابا جان کئی مرتبہ اس کا سراغ لگا چکے تھے لیکن وہ اپنی مخصوص ہنسی کے بعد چلے جایا کرتے۔

ابا جان کو انگریزی لباس سے سخت نفرت تھی۔ مجھے ہمیشہ شلوار اور اچکن پہننے کی تلقین کیا کرتے اور اگر میں بھی غلطی سے اپنی قمیضوں یا شلواروں کا کپڑا بڑھیا قسم کا خرید لاتا تو بہت خفا ہوتے۔ کہتے تم اپنے آپ کو کسی رئیس کا بیٹا سمجھتے ہو۔ تمہاری طبیعت میں امارت کی بو آتی ہے اور اگر تم نے اپنے یہ انداز نہ چھوڑے تو میں تمہیں کھدر کے کپڑے پہنا دوں گا۔ میرے لیے بارہ آنے سے زائد قیمت کا کپڑا خریدنا یا آٹھ روپے سے زائد کے بوٹ خریدنا جرم تھا۔ جب کہ سزا کافی کڑی تھی۔ ویسے انہیں اگر کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ میں آج پلنگ پر سونے کے بجائے فرش پر سویا ہوں تو بڑے خوش ہوا کرتے''۔

غرض حیات جاوید سے متعلق یہ چند واقعات بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کیے گئے تا کہ ۹۲ سال کی عمر پا کر دنیا سے اٹھنے والے عظیم باپ کے عظیم بیٹے کے بارے میں اقبالیات کے شوقین اور نئی پود کے متلاشیانِ اقبالیات کو ان کی خانگی زندگی سے کچھ واقفیت ہو سکے۔ نہیں تو اقبالیات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا اور پُر جوش سمندر ہے جس میں دیدہ زیب لعل و گہر کی فراوانی ہے اور ہر ایک متلاشی بقدرِ ظرف اس بے بہا سمندر سے فیض پا سکتا ہے۔ عشق و محبت کی بنا پر ہی مرد قلندر حضرت اقبال اپنے فرزند دلبند کے لیے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں یوں عرض گذار ہیں:

ہمی یک آرزو دارم کہ جاوید
ز عشق تو بگیرد رنگ و بوئے

ترجمہ: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری یہی ایک تمنا ہے کہ میرا بیٹا یعنی جاوید آپ کے عشق و محبت سے ہی رنگ اور خوشبو پا کر فیض یاب ہو جائے۔

جب مقبول بارگاہ خداوندی اور منظور سرکار حضرت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقبالؔ جیسے دیدہ ور شخصیت اپنے لختِ جگر کے بارے میں دعا گو ہو تو جاوید جیسے سعادت مند فرزند

کا اس دنیا میں اپنا نام روشن کرنا ایک یقینی سی بات ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے والدِ گرامی کی اچھی تربیت اور بزرگوں کی دعاؤں اور نگاہِ کرم سے اپنی زندگی کو چار چاند لگائے اور بہت سارے مراحل میں کامیابی حاصل کی۔ اونچے اور بلند عہدوں پر فائز ہوئے۔ جب ان کے والدِ محترم کو لندن میں ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط موصول ہوا تو انہوں نے جاوید کے نام کے عنوان کے تحت نظم لکھی:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا گر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ وگل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ نازک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اسی طرح حکیم الامت علامہ اقبالؔ نے اپنے اس نورِ نظر یعنی جاوید کے نام اپنی مشہور عالم کتاب ''جاوید نامہ'' میں ایک سو چھبیس اشعار پر ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے خطاب بہ جاوید (سخنے بہ نژادِ نو) اس طویل فارسی نظم میں گو کہ خطاب اپنے بیٹے سے ہے مگر درحقیقت اس کا پیغام ساری ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کے نام ہے اور جاوید کی ذات بطور علامت اس میں استعمال کی گئی ہے۔ اس نظم میں کلمۂ توحید کی حقیقت صوم وصلوٰۃ کی ماہیت، مسلم ملت کی موجودہ حالت اور دینِ فطرت کی آفاقیت کے اسرار کا اظہار کیا گیا ہے۔ بطور نمونہ یہ اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

اے پسر ذوقِ نگہ از من بگیر ۔ سوختن در لالہ از من بگیر
لالہ گوئی ؟ بگو از روئے جان ۔ تا ز اندام تو آید بوئے جان

ترجمہ: اے میرے بیٹے ذوقِ نظر مجھ سے حاصل کر۔ لالہ میں جلنا مجھ سے سیکھ۔ لالہ تو کہے تو روح سے کہہ تاکہ تیرے جسم سے روح کی خوشبو آئے۔

دوسری جگہ بھی اپنے بیٹے جاوید سے ایک محبت آمیز انداز میں خطاب فرماتے ہیں۔

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

والدہ کی وفات کے بعد اقبالؔ نے اپنے دونوں بچوں کی نگہداشت اور تربیت کے لیے بدرجۂ مجبوری ایک جرمن خاتون آنٹی ڈورس کی خدمات حاصل کی تھیں جس نے بڑی شفقت سے ماں کی شفقت ومحبت سے محروم دونوں بچوں کو سنبھالا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے حکومتِ پاکستان کی طرف سے انہیں خاندانِ اقبالؔ کی خدمت کے صلے میں معقول رقم ادا کی تھی۔ ایامِ طفولیت کی منزلوں سے نکل کر آپ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ یہ دراصل علامہ اقبالؔ کی شب وروز کی دعاؤں کا ہی نتیجہ ہے کہ جاوید اقبال نے تعلیمی میدان میں اپنے جوہر دکھائے اور بیرونی ممالک کی نامور یونیورسٹیوں سے تعلیم کے اعلیٰ مدراج پر پہنچ کر بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کیں۔

اپنے قارئین کرام کی توجہ قرآنِ مقدس کی ایک آیت کی طرف دلانا چاہتا ہوں:

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا۔ ہم ان کے ساتھ ان کی اولاد کو بھی شامل کر دیں گے اور ان کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہ ہونے دیں گے۔ ہر شخص اپنے اعمال میں محبوس رہے گا۔

(سورۃ الطور آیت:۲۱)

مفسرین کرام اس کی تفسیر میں یوں رقم طراز ہیں کہ یہ ان اسلاف مقبولین کے اکرام اور راز دیار لطف وسرور کے لیے ہوگا کہ ان کی زیارت کو بھی باوجود ان کے درجہ عمل کی پستی کے ان کے ساتھ ملحق اور ہم مرتبہ کردیا جائے گا۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے شرافت نسب کا آخرت میں مفید ہونا نکلتا ہے لیکن شرافت دینی کا' نہ کہ عرفی دنیوی شرافت کا۔

(تھانوی جلد ۲' ص ۵۸۲)

آیت میں بہت بڑی بشارت اہلِ ایمان کے لیے ہے۔ اپنا ایمان اگر صحیح وسلامت ہے تو انشاءاللہ رحمتِ الٰہی ہر کلمہ گو کے مدراج بلند کر کے اُسے اُس کے بلند پایہ اسلاف مقبولین کے درجہ تک پہنچا ہی دے گی۔ (تفسیر ماجدی جلد ہفتم ص ۵۷)

کہنے کی بات یہی ہے کہ مرحوم ڈاکٹر جاوید اقبال کی اپنی الگ پہچان تھی۔ آپ نے علم و ادب کی بلندیوں کو چھولیا۔ بیرونی ممالک یعنی یورپ میں تعلیم حاصل کی اور ڈگریاں حاصل کر کے اپنی شخصیت کو نکھارا۔ آپ کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ بہت سارے ممالک تک پہنچ گئے اور بڑی بڑی اور سر برآوردہ شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں تہران میں سید جمال الدین افغانی کانگریس کی صدارت بھی کی تھی۔ فردوسیؔ کے مزار پر حاضری دی۔ انہیں استنبول میں مجلس تحفظ میراث اسلام کی صدارت بھی بخشی گئی۔ ۱۹۷۷ء میں نظام الدین اولیاؒ دہلی کے مزار پر بھی حاضری دی۔ اندرا گاندھی کے ساتھ ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبالؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر بھی موجود رہے۔ قونیہ میں مزارِ رومی پر فاتحہ خوانی کی۔ چین کا دورہ بھی کیا۔ دنیا کے اور بھی بہت سارے اہم مقامات کا دورہ کیا اور اپنے بصیرت افروز خطبات سے وقتاً فوقتاً سامعین کو مستفید کیا۔

ڈاکٹر جاوید صاحب نے ۱۹۷۲ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج کے طور پر حلف اٹھایا۔ ۱۹۸۲ء میں چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کی حیثیت سے اُن کی تقرری عمل میں آئی اور بالآخر سپریم کورٹ کے جج کے عہدۂ جلیل پر ریٹائر ہوئے۔ انہیں اپنی زندگی میں یہ شرف بھی حاصل رہا کہ وہ ایک ماہر قانون ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پایہ کے دانشور' ایک بہترین فلاسفر اور علامہ اقبالؔ کے افکار اور اُن کے نظریات کے بھی شارح ثابت ہوئے ہیں۔ وہ اردو او رانگریزی کے ایک بہترین ادیب اور قلم کار تھے۔ اپنے والد کی زندگی پر آپ نے ''زندہ رود'' کے نام سے تین جلدوں پر مشتمل ایک تفصیلی کتاب شائع کی جس نے عالمگیریت حاصل کی۔ ''مئے لالہ فام'' ان کی ایک اور عمدہ کتاب ہے۔ آپ نے زندہ رود جو کہ ایک ضخیم کتاب کی صورت میں دستیاب ہے اس کی تلخیص بھی چھپوائی۔ اپنی زندگی' ادبی خدمات' علمی کارناموں' طویل اسفار اور گوناگوں دیگر مشغولیات سے متعلق اپنی سوانح حیات ''اپنا گریبان چاک'' کے ٹائٹل کے تحت شائع کی جو کہ مرحوم ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے بہت سارے گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اقبالیاتی ادب پر سینکڑوں مضامین تحریر کیے ہیں۔ اس طرح علمی اور ادبی دنیا کا یہ ستارہ ہمیشہ چمکتا رہے گا اور ہر سو اپنی روشنی سے اندھیرے گوشوں کو علم کے نور سے منور کرتا رہے گا۔

مگر راقم السطور کی رائے میں یہ سب کچھ ہونے کے باوجود آپ کے لیے یہی چیز باعثِ عزّوشرف اور وجہِ افتخار ہے کہ آپ ممدوحِ عالم' حکیم مشرق' دانائے راز حضرت اقبالؔ کے نورِ نظر اور فرزندِ ارجمند ہیں۔ یہ سب سے بڑھ کر نسبت ہے۔ جیسا کہ درج بالا آیہ کریمہ اور اس کی تفسیر کی روشنی میں قلم بند کیا گیا ہے اور دنیوی زندگی کے مقابلہ میں اُخروی پائیدار زندگی میں صالحین اور مقبولانِ خدا کی اولاد اور عزیز واقارب کے بارے میں بشارت دی گئی ہے۔ یہاں پر یہ بھی لکھتا چلوں کہ زبان

زدِ خاص وعام ہے کہ ..... آوازِ خلق نقارہ خدا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی وفات پر لوگوں کے کانوں سے یہی آواز ٹکرائی کہ ڈاکٹر علامہ اقبالؔ کے بیٹے انتقال کر گئے اور سبھی سننے والوں کی توجہ اس مناسبت سے خود بخود علامہ اقبالؔ کی طرف مبذول ہوگئی اس لیے اپنی الگ پہچان کے باوجود جاوید صاحب کے لیے یہ سعادت مندی ہے اور نیک شگون ہے ۔جیسا کہ علامہ کے متعلق مولینا گرامی کا یہ شعر بھی مشہور ہوا:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبالؔ
پیغمبری کرد و لے پیمبر نتوان گفت!

اس طرح علامہ کی اولوالعزمی اور بلند مرتبت ہونے کی دلیل واضح ہوتی ہے۔ یہاں اس حوالے سے حیدر آباد کے جناب رؤف خیر کے مضمون کا یہ اقتباس بھی نقل کرنے کو جی چاہتا ہے اور انہوں نے خود جناب جسٹس جاوید اقبال کی تصنیف زندہ رود کے حوالہ سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

''بچپن میں باپ کے حوالہ سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں مانا کیونکہ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔جوان ہوا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔یہ میرے لیے پدرم سلطان بود کی بناء پر فخر کا مقام تھا۔زندگی میں اچھا برا کام کیا تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔عجیب اتفاق ہے میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا''۔علامہ اقبالؔ سے تعلق کو اعزاز کے بجائے بوجھ سمجھنے والے جسٹس جاوید اقبال جو کچھ ہیں thanks to Iqbal ہی تو ہیں۔خود نوشت سوانح عمریاں تو بے شمار لکھی گئیں مگر خریدنے والا یہ سوچ کر خریدتا ہے کہ علامہ اقبالؔ کے بیٹے نے آخر کیا لکھا ہے۔جگن ناتھ آزاد کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔وہ بجائے خود کیسے ہی شاعر کیوں نہ رہے ہوں، علامہ اقبالؔ کے حوالے سے پہچانے جانے پر نازاں تھے۔انہیں اقبالؔ کا بیشتر کلام ازبر بھی تھا۔اک ایسے وقت جب کہ ہندوستان میں اقبالؔ کا نام لینا بھی جرم سمجھا جاتا تھا، جگن ناتھ آزاد نے سرکاری سطح پر اقبالؔ کی شاعرانہ حیثیت کا احساس دلایا۔''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' کو ترانۂ ہندی کا درجہ دلایا جو آج بھی برقرار ہے''۔

پھر بھی مرحوم ڈاکٹر جاوید اقبال قابلِ تعریف وتوصیف ہیں کہ انہوں نے قابلِ قدر حد تک اپنے والدِ گرامی کے نظریات اور افکار اقبالؔ اور اُن کے پیغام وغیرہ کی بھرپور تشریح وتوضیح کر کے اقبالیاتی علم وادب میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔قانونِ قدرت کے مطابق ہر انسان میں اپنے الگ الگ تخلیقی جواہر موجود ہوتے ہیں۔علامہ مرحوم نے اپنے بارے میں خود ہی فرمایا ہے۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روز گارے، ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اپنے اس طالب علمانہ مضمون میں اگر اس بات کا بھی ذکر کروں کہ مجھے گذشتہ سال یعنی مارچ ۲۰۱۴ء میں مرحوم جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے ساتھ شرفِ ملاقات حاصل ہوا تھا تو شاید بیجا نہ ہوگا۔اگر چہ اس پر الگ سے تفصیلاً لکھنے کی ضرورت ہے (بلکہ کچھ لکھا بھی جاچکا ہے)۔علامہ اقبالؔ کا ایک عقیدت مند ہونے کی بناء پر مجھے پچھلے سال دوسری دفعہ لاہور جانے کا موقع میسر ہوا۔داتا گنج بخشؒ کی درگاہ پر حاضری کے بعد راقم بار دیگر علامہ مرحوم کی قبر پر حاضر ہوا اور اپنے عشق ومحبت کے پھول قرآنی آیات اور درود ودعا کی صورت میں اس مرد قلندر کی خدمت میں بطور ثواب پیش کیے۔اس نادار اور مفلس کی جھولی میں اس کے سوا کیا تھا اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ گر قبول افتد زہے عزو شرف۔جیسا کہ علامہ نے بھی فرمایا ہے ۔

زیارت گاہِ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

دورانِ سفر بذریعۂ فون ڈاکٹر جاوید سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور وہاں سے لبیک سن کر مسرت حاصل ہوئی اور ان کی قیام گاہ واقع گلبرگہ لاہور پہنچ گیا۔ گیٹ پر تعمیر شدہ بنکر میں متعین سپاہی نے ادھر سے ہی میرا نام بول دیا اور اندر جانے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جناب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب ملاقاتی کمرے میں داخل ہوگئے۔ اگرچہ بڑھاپے کے آثار بھی ان پر نمایاں تھے مگر بالکل صحت مند دکھائی دیتے تھے۔ بھوؤں پر سفیدی کے اثرات تھے۔ دانت بالکل درست حالت میں تھے۔ چہرے بشرے سے اچھے لگتے تھے۔ سفید لباس میں ملبوس اور اس کے اوپر نیلے رنگ کی بازو والی بنیان (سویٹر) زیب تن کیے ہوئے تھے۔ میں ان کے ساتھ بغلگیر ہوا۔ مصافحہ کیا۔

مرحوم نے قہوہ منگوایا اور کچھ بسکٹ بھی ساتھ رکھے۔ اپنے سفرناموں کے بارے میں تفصیلات سنائیں۔ میں ایک نظر ان کو دیکھتا تھا اور دوسری نظر سے ایک مورِ ناتواں کی طرح سلیمان کے دربار میں خود کو محسوس کرتا تھا۔ بیچ بیچ میں دورانِ گفتگو اور ہوں ہاں کر کے اپنی نگاہیں کمرے کی دیواروں پر بھی دوڑاتا تھا اور قائداعظم جناح صاحب اور علامہ اقبال کی تصویروں کو بھی دیکھتا تھا۔ الماریوں میں قانون کی کتابیں اور دیگر کتابیں بھی سلیقہ مندی سے رکھی گئیں تھیں۔ اوپر والے طاقچے میں سیاہ جلد کی کتاب پر بھی نظر ٹھہر گئی۔ یہ بڑے سائز کی تھی۔ یہ کتاب وحی منظوم یعنی علامہ سیماب اکبرآبادی کا منظوم ترجمہ قرآن کریم تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ کی ملاقات نصیب ہوئی۔ میرے ساتھ پشاور کے ایک ساتھی بطورِ گائیڈ ساتھ چلے تھے۔ مرحوم کی بیگم صاحبہ جسٹس ناصرہ کو بھی ایک نظر سے دیکھا۔ اپنی خواہش اور التماس پر شام کو اس عالمِ اسلام کے بطل جلیل یعنی اقبال کے فرزند سے دوسری بار ملنے کا شرف حاصل ہوا اور اُن کے ساتھ کچھ تصویریں لے لیں۔ جو کہ میرے پاس موجود ہیں۔ آپ نے تحفتہً اپنی کتاب زندہ رود کی تلخیص اپنے دستخطوں کے ساتھ مرحمت فرمائی۔ آج بھی رخصتی کے وقت ان کی زبان سے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے ہیں..... ''خدا تمہیں زندہ رکھے''۔ انگریزی میں درج ذیل دو کتابیں جناب اقبال صلاح الدین (علامہ کے نواسے) نے مجھے تیسری دفعہ پاکستان پہنچنے پر تحفتاً مرحمت فرمائیں۔

1- Essays of Dr. Javid Iqbal
By Mohammad Suhail Umer

2- Intellectual Legacy
Essays by Dr. Javid Iqbal

دونوں کتابیں بڑی ضخیم ہیں۔

علامہ اقبال کی صاحبزادی منیرہ صلاح الدین کا گھر بھی باہر سے دیکھ لیا۔ اندر جانے کی خواہش ظاہر کی مگر کافی دیر ہونے کی وجہ سے شاید وہ محو آرام تھیں۔ دوسرے دن جا نہیں پایا اور ملاقات کی تمنا دل میں ہی رہی۔ بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔ یہ جناب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی مہمان نوازی، شفقت اور اخلاق کریمانہ ہیں کہ انہیں کے مشورہ پر میں اپنے گائیڈ تاج نعمان کے ہمراہ علامہ مرحوم کی آخری قیام گاہ یعنی جاوید منزل بھی پہنچ گیا جہاں پر حضرت اقبال نے اپنی حیات مستعار کے آخری تین سال بسر کیے تھے اور یہیں پر اپنی جانِ عزیز خدا تعالیٰ کے سپرد کی تھی۔ بلاشک آپ عزیز ہی نہیں بلکہ عزیزِ جہاں بھی تھے۔ جاوید منزل میں مجھے وہ کمرہ دیکھنے کا شرف حاصل ہوا جہاں پر آپ نے پلنگ پر آخری سانس لی تھی۔ اس پر آج بھی وہ تکیہ اور وہ شیٹ لگا ہوا ہے جس پر آپ نے انتقال فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ اس

مقام پر مجھے اور بھی کئی چیزیں دیکھنے کا موقع ملا۔ مثلاً علامہ اقبال کی الماریوں میں بند رکھی گئی کتابیں، فوٹو گرافس، علامہ کے جوتے وغیرہ۔ اب یہ جاوید منزل باضابطہ سرکاری تحویل میں ہے او رحکومتِ پاکستان (پنجاب) کے زیرِ انتظام ہے۔ جاوید منزل کے ساتھ والے صحن میں سجاوٹ کے ساتھ سنگِ سیاہ کے خوش نما او رتراشیدہ پتھر نصب کیے گئے ہیں جن پر علامہ کے ارشادات اور کچھ یادگاری تاریخی کلمات کندہ کیے گئے ہیں۔

خاندانِ اقبالؔ کے افراد سے میرے خطوط کے جوابات میں اُن کے جوابی خطوط سے چند جملے تبرکاً نقل کیے جاتے ہیں:

۱۔ ''اچھی بات ہے کہ آپ نے اُن (اقبالؔ) سے عقیدت کی بنا پر سرینگر سے لاہور کا سفر اختیار کیا اور ان کے مزار پر حاضری دے کر اپنے دل کو تسکین پہنچائی'' (ڈاکٹر جاوید اقبال)

۲۔ شاکر صاحب کی معیت میں خوب وقت گذرا۔ میں نے اقبال اکیڈیمی لاہور کی شائع کردہ اپنی کتاب انہیں تحفہ کے طور پر دی۔ (ڈاکٹر جاوید اقبال کے خط سے بنام ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی ،کشمیر یونیورسٹی)

۳۔ ''خدا کا شکر ہے کہ آپ کا سرینگر سے لاہور کا سفر خاص طور پر نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ آپ نے میری ذات کے بارے میں جس شفقت اور محبت کا اظہار کیا ہے، اس کے لیے شکریہ قبول فرمائیے''

(ڈاکٹر جاوید اقبال)

۴۔ ''آپ کا جذبات وسعادت سے بھرا خط جس میں آپ کی سعی اور محرومی ملاقات کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ یقیناً اس میں ہمارے ملازمین کی کوتاہی آڑے رہی۔ میرے والدِ محترم (علامہ صاحب) کے لیے آپ کے جذبات قابل تعریف ہیں''۔

(آپ کی بہن منیرہ۔ علامہ کی صاحبزادی)

۵۔ ''خط میں ہمارے اہل خانہ کے متعلق آپ نے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے۔ اس کے لیے انتہائی مشکور ہیں۔ دبستانِ اقبال آپ کی پُر خلوص دعاؤں کا طالب ہے''۔

(میاں اقبال صلاح الدین)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم ڈاکٹر جاوید اقبال کی روح کو سکون عطا کرے۔ ان کی لغزشوں کو معاف کرے۔ ان کی قبر کو اپنے نور سے منور کرے۔

این دعا از واز جملہ جہاں آمین باد!

داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

کتب خانۂ اکبر حیدری (ص 45 سے آگے)

آؤ اب پلٹو ہماری طرف۔ شلفوں اور الماریوں میں لگی ان قیمتی اور سبق آموز کتابوں پر جمی ہوئی گرد و غبار کو جھاڑ دو اور مطالعہ کتب کی بدولت اپنے مستقبل کو روشن کرو۔

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں
اب اکثر گذر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں.... (گلزار)

حیدری صاحب کے لائق جانشین فرزند ڈاکٹر محمد ظفر حیدری اس رسالہ کو باقاعدگی کے ساتھ منظر عام پر لاتے ہیں اور اس کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی انتھک محنت سے اس کے بہت سارے خصوصی شمارے نکالے ہیں۔ اپنی طرف سے بھی والد کی وفات کے بعد ظفر صاحب نے کتب خانہ اکبر حیدری میں بہت اضافہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے والد محترم کے نقشِ راہ پر چلنے کی مزید توفیق عطا کرے۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری: مردِ قرطاس و قلم

ریڈیو کشمیر سے جونہی یہ جانکاہ خبر سنی کہ اردو کے نامور محقق، ادیب اور نقاد اکبر حیدری رحلت کر گئے تو میں بالکل اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ کیونکہ مجھے ان کی بیماری وغیرہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ میں نے مرحوم کے فرزند سے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس میں کوئی کامیابی نہ ہوسکی۔ پھر دل پر جبر کر کے یقین کرنا ہی پڑا اور کلام الٰہی میں درج موت کی حقیقت کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اس موقعہ پر میرے منہ سے بے ساختہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن نکل گیا۔

میں اپنے قلم کو بہت کمزور تصور کرتا ہوں اور مجھے الفاظ کی تنگ دامانی کا بھرپور احساس ہے کہ میں جس مرحوم شخصیت کے بارے میں یہ سطور قرطاس پر بکھیر رہا ہوں وہ میرے احساسات سے کہیں بلند ہے۔ لکھنے والے ان کے بارے میں لکھیں گے اور خوب لکھیں گے اور مدتوں لکھتے ہی رہیں گے۔

پروفیسر اکبر حیدری کے بارے میں بہت پہلے سے میرے دماغ میں ایک دھندلا سا نقشہ تھا۔ ان کو نزدیک سے دیکھنے کا کبھی موقعہ میسر نہیں ہوا تھا۔ ملازمت کے دنوں میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے بارے میں اخبار آفتاب میں ان کا ایک مضمون چھپ چکا تھا۔ جو کہ علامہ مرحوم کی تاریخ ولادت کے تعلق سے لکھا گیا تھا۔ غالباً یہ زمانہ ۸۰ کی دہائی کا تھا۔ پھر مجھے ماہنامہ 'شیرازہ' اردو سرینگر ۲۰۰۳ء شمارہ ۴-۵ پڑھنے کا موقع ملا۔ اس میں اقبالؔ اور شاد حیدر آبادی عنوان کے تحت پروفیسر اکبر حیدری کا ایک مضمون پڑھنے کو ملا۔ یہ مضمون بہت ہی بسیط اور کافی دلچسپ ہے اور شیرازہ کے متذکرہ شمارے میں کوئی ۴۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

مضمون کی دلچسپی کے پیش نظر میں صاحب مضمون کی خدمت میں ایک طویل خط لکھنے پر آمادہ ہوگیا اور اس میں مقدور بھر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ خط موصول ہونے پر اُسی روز موصوف کی طرف سے میرے نام فون آ گیا اور طویل بات چیت کے بعد حیدری صاحب نے بھی میرے بارے میں عمدہ اور حوصلہ افزاء جذبات کا اظہار فرمایا۔

اگست ۲۰۰۶ء میں راقم السطور نے پروفیسر حیدری کے ساتھ بذریعۂ فون رابطہ کیا اور ان کی شائع شدہ دو کتابوں 'اقبالؔ نادر معلومات' اور 'اقبالیات کے نئے گوشے' کی فرمائش کی۔ انہوں نے مطلوبہ رقم کے عوض دونوں کتابیں بھیجنے کی حامی بھر لی اور میں بھی اس مطلوبہ رقم پر راضی ہوگیا اور مجھے دونوں کتابیں موصول ہوئیں۔ دونوں کتابیں اقبالیاتی ادب میں خاصہ درجہ رکھتی ہیں اور یہ کتابیں شائقین اقبالؔ کے لیے یقیناً گنج گرانمایہ ہیں۔ رقم پا کر موصوف نے مجھے اطلاع دے دی اور میرے ذوق ادب کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ گویا میں نے کتابوں کی یہ کثیر رقم عشقِ اقبال میں صرف کی اور میں نے بھی خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا اقرار کیا۔

ٹیلی فون رابطہ قائم ہونے کے ساتھ ساتھ مرحوم حیدری صاحب نے مجھے یہ بھی اطلاع دے دی کہ ان کی طرف سے ایک ماہنامہ رسالہ ''حکیم الامت'' کے نام سے نکلنے والا ہے۔ اس رسالے کے لیے بھی راقم نے سالانہ چندہ پیش کیا۔ جس

روز ماہنامہ حکیم الامت کی رسم افتتاح ہونے والی تھی۔

موصوف نے مجھے بھی کلچرل اکادمی سرینگر کے دفتر پر مدعو کیا اور اپنی تقریر کے دوران میرے بارے میں کچھ حوصلہ افزا کلماتِ تحسین بیان کیے۔

مرحوم اکبر حیدری صاحب میری ادنیٰ ذات سے کس قدر متاثر ہو گئے تھے اور ان کو میرے اندر کون سی خوبی نظر آئی تھی اس کا میں بھی ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں کر پایا۔ میرے خیال میں شاید یہ عشق علامہ اقبالؔ ہی کا جذبہ ہے جو باہمی طور دلوں کی کشش کا ذریعہ بن گیا اور یہی وجہ نظر آتی ہے کہ اس زمانے میں محترم حیدری نے حکیم الامت جلد ا شمارہ نمبر ۳ میں مجھ ادنیٰ شخص کے بارے میں مرزا بشیر احمد بیگ شاکرؔ سرخی کے تحت آدھے صفحے پر مشمل اپنے بہترین جذبات اور تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ اس سرخی کی چند سطروں کا نقل کرنا شاید مناسب ہوگا تاکہ اس بات کا ثبوت فراہم ہوسکے کہ مرحوم کے دل میں کتنی وسعت تھی۔ نقل سطور یوں ہے:

''شاکر صاحب علم دوست اور اقبالؔ کے عاشق ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی کے ڈاک خانے میں ملازم ہیں اور معمولی تنخواہ پاتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ جو لوگ اردو کے دعوے دار ہیں اور بڑی بڑی رقمیں تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کو کتاب تو درکنار ایک رسالہ خریدنے کی توفیق نہیں ہے۔ شاکرؔ صاحب کا ظرفِ بلند نظر وسیع اور مذاق علم تیز تر ہے۔ انہیں کتابیں اتنی پسند آئیں کہ مجھے دیکھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ نوشہرہ سے زحمتیں اٹھاتے اٹھاتے میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور ایک کتاب پر تبصرہ کر کے میرے سپرد کیا۔ دوران گفتگو جب رسالہ حکیم الامت کے بارے میں سنا تو فوراً رسالہ دیکھے بغیر سال بھر کا چندہ بھی ادا کیا۔ غرضیکہ انہیں کتب بینی کا بہت شوق ہے اور تبصرہ پوری کتاب کو احاطہ کرتا ہے۔ اس لیے ان کا تبصرہ حکیم الامت میں فخر کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے۔'' (ایڈیٹر)

(بحوالہ حکیم الامت۔ ج ا شمارہ ۳)

اب اردو زبان وادب کا یہ شہسوار مَنوں مٹی کے نیچے سو گیا ہے اور تا صبح قیامت برابر سوتا ہی رہے گا۔ مگر اس نے اپنے پیچھے علم وادب کا گرانقدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ اس سے اردو کے شیدائی فیض پاتے رہیں گے۔ تحقیق کے میدان میں جناب حیدری صاحب کی اپنی الگ پہچان ہے۔ اس مرد میدان نے برسوں اس خارزار میں صحرا نوردی کی ہے۔ اردو ادیبوں اور شاعروں جو کہ گوشۂ گمنامی میں چلے گئے تھے۔ حیدری مرحوم نے ایک نئی آن بان کے ساتھ دریافت کیا ہے اور ان کے ادبی کارناموں سے پردہ ہٹایا ہے۔ وہ بالکل ایک جوہری کی مانند گمشدہ لعل وجواہرات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے تھے اور گرد وغبار جھاڑ کر ان کو جوہر فروش کی طرح زیب وزینت عطا کرتے تھے۔ یہ میر تقی میرؔ خدائے سخن کی بات ہو یا انیسؔ و دبیرؔ مرثیہ گویانِ کربلا کی۔ حیدریؔ صاحب نے ان کے تئیں تحقیق کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ غالبیات کے سلسلے میں بھی وہ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اس پر بھی ان کا تحقیقی کام قابل ستائش ہے۔

حکیم الامت شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؔ کے تو وہ شیدائی ہی تھے۔ اقبالیات پر ان کی کتابیں لاثانی ہیں۔ مثلاً کلام اقبالؔ پرانے رسالوں کے آئینے میں۔ اقبالؔ کی صحت زبان، اقبالیات کے نئے گوشے، اقبال نادر معلومات، ان کی اور ایک کتاب جو کہ کسی ادبی بددیانتی یا سہل انگاری کی نذر ہو گئی ہے۔ یعنی اقبالؔ احباب و آثار اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ خاصکر ماہنامہ حکیم الامت کے آج تک کے تمام شمارے جن میں اقبالیاتی ادب، اقبالؔ کے عشق رسولؐ اقبال بحیثیت عاشق قرآن، فلسفہ اقبال وغیرہ پر کثیر التعداد مضامین لکھے گئے ہیں۔ جو کہ آئندہ تحقیق کاروں کے لیے نشانِ راہ ثابت ہوں

گے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک سے بھی خطوط کی صورت میں حیدری صاحب کے ان کارہائے نمایاں کو سراہا گیا ہے۔ خاص کر فرزند اقبال جسٹس جاوید اقبال، سید تقی عابدی جیسے بلند قامت ادیبوں نے اس پر برملا اظہار کیا ہے۔ لکھنؤ اور حیدر آباد کی پرانی لائبریریوں میں گھومنا پھرنا، وہاں کی شیلفوں پر لگی پرانی کتابوں اور مسودوں کو نیچے اُتروا کر اُن سے گرد وغبار جھاڑنا اور کچھ نادر ونایاب چیزیں ڈھونڈ نکالنا حیدری صاحب جیسے باہمت اور اولوالعزم ادیبوں کا دل گردہ ہے۔ دل میں آتا ہے کہ ان کی قبر پر جا کر یہ کہوں۔

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

اس مردِ قرطاس وقلم کے حکیم الامت والے ایڈیٹوریل بہت ہی صحت منداور جاندار ہوتے تھے۔ غائبانہ طور پر راقم کے کانوں میں ان کے صریر خامہ کی آواز گویا آج بھی گونج رہی ہے اور مجھے یہی لگ رہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی موضوع پر شروع کریں گے اور اپنی عادت کے مطابق لکھیں گے۔

چل اَے خامہ بسم اللہ اب

جناب اکبر حیدری کے چلے جانے سے اردو دنیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا ناممکن اگر نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اب حیدری صاحب کے بعد اردو ادب اور زبان کے شیفتگان کا میدان جیسا خالی لگ رہا ہے۔ آج اردو زبان کو اس کے دشمنوں نے اپنے نرغہ میں لیا ہے اور ہر طرف سے یہ زبان بادِ سموم کے تھپیڑے کھائے جا رہی ہے۔ دشمنوں کی سازشیں اس کی جڑیں کاٹنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کے بہی خواہ اور ہمدرد حیدری مرحوم کے نقش قدم پر چل کر اس زبان کی بقاء اور آبیاری کے لیے کمر بستہ ہو جائیں اور دشمنوں کے برے ارادوں کو خاک میں ملائیں۔ یہی اردو ادب کے اس محسن کو بہترین خراج عقیدت ہوگا۔

مرحوم حیدری صاحب کی فروگذاشتوں یا خطاؤں سے صرفِ نظر کر کے اردو زبان وادب کے وسیع تر مفاد میں ادب نوازوں کو ہمت اور جواں مردی سے کام لینا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس نصیب کرے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

(مرزا غالبؔ)

گلشن بکس کشمیر (ص 40 سے آگے)

ایک علم دوست کے درج ذیل خیالات بلا شک کتابوں کے شیدائیوں کے لیے نقل کیے جاتے ہیں اور خاص کر نئی پود کے لیے جو مطالعہ کتب سے دور ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کے لیے بھی اس دوری کو پاٹنے کے لیے بہت مفید اور سبق آموز ہیں۔ کتابیں بلند خیالات اور رسنہری جذبات کی دستاویزی یادگاریں ہوتی ہیں۔ کتابیں بحر حیات کی سیپیاں ہیں جن میں پُراسرار موتی بند ہیں۔ کتابیں معلومات کے ثمردار درختوں کے باغ ہیں۔ گذرے ہوئے بزرگوں کے دھڑکتے دل ہیں۔ حسن وجمال کے آئینے ہیں اور وقت کی گذری ہوئی بہاروں کے عکس ہیں۔ کتابیں لافانی بلبلیں ہیں جو زندگی کے پھولوں پر سرمدی سرمدی نغمے گاتی ہیں۔ انہی بلند وبالا خیالات کو نظر میں رکھتے ہوئے شیخ اعجاز احمد کا قائم کردہ یہ علم وادب کا یہ گلستان Gulshan Books Kashmir اپنے چاہنے والوں کے لیے دلکشی اور رعنائی کا باعث ہے۔

نہرو پارک سری نگر میں واقع کتب خانہ

گلشن بُکس کشمیر

Gulshan Books Kashmir

کتابوں کی یہ دنیا بھی دیکھو کیا نرالی ہے
عجائب اور غرائب کی یہ دنیا لامثالی ہے
کتابیں اُتری ہیں پیغمبروں پر آسمانوں سے
درج قرآن میں ہے یہ، یقین کے واسطے پڑھ لے
(شاکر)

دانشوروں کا یہ قول بالکل بجا ہے کہ ''یہ دنیا (کتابوں کی) پر اسرار دنیا ہے۔ اس میں وسعت بھی ہے اور حیرت انگیز گہرائیاں بھی۔ یہاں بلالحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل، ملک وقوم زمان ومکان پاک روحوں سے ملاقات ہوتی ہے''۔

مارچ ۲۰۱۷ء کی چار تاریخ کو بلیوارڈ روڈ سرینگر کے نزدیک واقع نہرو پارک کے گلشن بکز پر مشہور ومعروف مصنفہ اور براڈ کاسٹر محترمہ نعیمہ احمد مہجور کی انگریزی تصنیف Lost in Terror کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ اس دل خوش کن خبر کو پہلے ہی سرینگر سے شائع ہونے والے کچھ اخباروں میں مشتہر کیا گیا تھا۔ چنانچہ ابتداء سے اپنے کتابی ذوق وشوق کے پیش نظر راقم السطور بھی نہرو پارک پہنچ گیا۔

گلشن بکز والوں کی طرف سے جھیل ڈل کے مختصر سے فاصلے کو پار کرنے کے لیے بلیوارڈ سڑک کے کنارے سے گلشن بکز کے احاطے تک اور وہاں سے واپسی پر مفت شکارے کا بندوبست رکھا گیا تھا۔ نہرو پارک پر واقع یہ کتب خانہ عمارت کی پہلی منزل میں سجایا گیا ہے۔ جونہی میں نے اپنی نظریں کتب خانہ کے چاروں اور دوڑائیں تو یک بہ یک میری زبان سے بے ساختہ انگریزی میں یہ جملہ نکل گیا It looks like a heaven یہ عظیم الشان کتب خانہ Gulshan Books کے نام سے مئی ۲۰۱۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ بات بطور خاص قابل ذکر ہے کہ یہ بے مثال کتب خانہ مشہور عالم جھیل ڈل کے کنارے کے نزدیک ہی قائم کیا گیا تھا۔ چونکہ جھیل ڈل اپنی خوب صورتی اور قدرتی حسن کی وجہ سے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اگر چہ موجودہ وقتوں کے سنگ دل اور بے رحم انسان کے ہاتھوں اس کی خوبصورتی اور جاذبیت بہت حد تک متاثر ہوئی ہے۔ مقامی اور بیرونی شاعروں اور ادیبوں نے جھیل ڈل کے بارے میں اپنی قلمی جولانیوں کو خوب نکھارا ہے اور وہ ڈل کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اپنے دامنِ مراد کو بھر دیتے ہیں اور اپنے مطالعہ کی تشنگی کو دور کرتے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر قاری حضرات مفت میں کتابیں پڑھ کر استفادہ کرتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا کتب خانہ ہے۔ یہاں اس سجے سجائے اور دل کو فرحت بخشنے والے کتب خانہ میں کوئی تیس ہزار (۳۰،۰۰۰) کے قریب عنوانات پر کتابیں رکھی گئی ہیں۔ انگریزی اور اردو زبانوں میں یہاں عمدہ ترین کتابیں چاروں طرف نظر آتی ہیں۔ نیچے سے اوپر تک بنائے گئے شلف

دیدہ زیب کتابوں سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور بہت ہی سلیقے سے ہر قسم کی کتابیں دیکھنے والے کی نگاہوں کو خیرہ کرتی ہیں۔انگریزی زبان وادب کی کتابوں کی تعداد اردو اور کشمیری کی نسبت بہت زیادہ ہے۔قرآن مجید کے بہت سارے نسخے یہاں موجود ہیں اور ان کے ترجمے اور تفسیریں بھی دستیاب رکھی گئی ہیں۔تاریخی، جغرافیائی، سائنسی، شعروشاعری اور ادبی کتابوں کا یہاں خاصا ذخیرہ پڑھنے والوں کے لیے میسر رکھا گیا ہے۔صوفی شاعری اور مذہبی امورات سے متعلق بھی کتابیں موجود ہیں۔حقیقی علم وادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے بجا طور پر فرمایا گیا ہے کہ ؎

کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا اینجاست

زمانہ اگرچہ سرپٹ گھوڑے کی طرح تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور ماضی کو پیچھے چھوڑتا ہے مگر پھر بھی ماضی سے حال اور مستقبل کسی نہ کسی صورت میں جڑا رہتا ہے آج کل اگرچہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور دورہ ہے۔انٹرنیٹ اور کمپیوٹر جیسے جدید ایجادات کی سہولتیں میسر ہیں۔مگر اس سب کے باوجود کتاب کی اپنی افادیت سے انسان مستثنیٰ نہیں ہوسکتا ہے۔جس طرح کتاب اپنے پڑھنے والے کے دل ودماغ کو مستفید کرتی ہے اور اس کی ذہنی بالیدگی کی نشوونما کرتی ہے۔وہ چیز موجودہ سائنسی ایجادات سے حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔کتاب کو اول سے آخر تک سنجیدگی کے ساتھ پڑھنے سے انسان ایک عجیب وغریب کیفیت محسوس کرتا ہے۔اس کی اپنی ہی لطافت اور سرمستی ہے کہنے والے نے بجا کہا ہے ؎

فراغتے، گوشۂ چمنے و کتاب

دراصل گلشن بکس نے اس طرح ایک خاص جگہ پر کتب خانہ قائم کرکے ایک مثال قائم کی ہے۔عمارت کے چاروں طرف صاف وشفاف پانی، خوب صورت اور سجے سجائے ہاؤس بوٹوں کا دلکش نظارہ، پانی میں چلتی ہوئی رنگین شکاریاں، دریائی پرندوں اور آبی بطخوں کی دل کو چھونے والی آوازیں، صبح کا سماں، جانوروں کی چہچہاہٹ، ہر سو مسجدوں کے میناروں سے اذانوں کی گونج، مفت ریڈنگ روم اور کافی والی دکان کی مشترکہ بیٹھک میں جب صاحب مطالعہ صبح اور شام یا بیچ والے اوقات میں جھیل ڈل کے پیچھے بہ طرفِ مشرق زبرون پہاڑیوں کی طرف نگاہ اٹھاتا ہوگا۔تو کچھ عجیب سماں دکھائی دیتا ہوگا۔علامہ اقبالؔ نے یہاں آکر جھیل ڈل کے کنارے تشریف رکھ کر درست فرمایا تھا ؎

کوہ، دریا و غروب آفتاب
من خدا را دیدم آنجا بے حجاب

تقریب سعید کے روز یعنی ۴ مارچ ۲۰۱۷ء کو اس علم ودانش کی فرحت بخش جگہ پر محترمہ نعیمہ مہجورؔ کے ساتھ ایک نشست منعقد ہوئی۔کتاب کی رونمائی عمل میں لائی گئی۔بہت سے علم دوست حضرات اور دانشور موجود تھے۔محترمہ نے اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا اور کتاب مذکور سے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنائے جب کہ پڑھنے کے دوران اُن کی آنکھیں پُرنم بھی ہوئیں۔سامعین میں سے بہت سے حضرات نے اپنے سوالات پیش کیے اور موصوفہ نے اپنے جوابات سے ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔نشست کے افتتاح پر مہمانوں کی چائے سے بھی مہمان نوازی کی گئی۔اس ادارے کے موجود سربراہ جناب شیخ اعجاز احمد ہیں۔یہ ان کے خاندان کی پانچویں پشت سے تعلق رکھتے ہیں۔میزبان خود بھی علم دوست اور ادب نواز ہیں۔انگریزی، اردو اور کشمیری میں لاتعداد کتابیں چھاپ کر گلشن علم وادب کی آبیاری کرتے ہیں۔کشمیر بھر کے علاوہ ملک کی دیگر ریاستوں میں بھی اپنی اشاعتی کارکردگی کی بناء پر یہ اچھی طرح پہچانے جاتے ہیں۔اللہ سے دعا ہے کہ وہ شیخ اعجاز اور ادارہ سے دیگر افراد کو زیادہ سے زیادہ علمی خدمات انجام دینے کی توفیق عطا کرے۔۔۔(باقی ص 38 پر)

کتب خانۂ اکبر حیدری کشمیری

علم و دانش کا ایک گرانقدر خزانہ

دین اسلام میں علم کی اہمیت اور فرضیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔علم کا وجود کتاب کا مرہونِ منت ہوتا ہے اور کتابوں کی بدولت کتب خانوں کی زینت بڑھ جاتی ہے اور علم وادب کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ دنیا جہاں کی سب سے بڑی دولت کو علم کا نام دیا جاتا ہے۔علم جو انبیاء کی وراثت' صاحب علم کا تحفظ' خداشناسی کا ضامن:

که بے علم نتواں خدا را شناخت

کتب' کتاب کی جمع اور رخانہ فارسی میں گھر کو کہتے ہیں۔لفظی اعتبار سے کتب خانہ کا ترجمہ کتابوں کا گھر ہوگا۔اس لیے عربی لغت میں کتبہ دارالکتب' خزانہ کتب کا لفظ استعمال ہوا ہے جب کہ قدیم عربی میں خزائن کتب کہا جاتا تھا۔

کتابیں ہی وہ ساتواں آسمان ہیں جہاں دنیا کے کاملین وعارفین کی روحیں بقائے دوام وحیات حاصل کرنے کے بعد مجتمع ہیں۔ یہ وہ مرکز ہے جہاں آفتابِ علم کی پُرنور شعائیں اورخوب صورت کرنیں انسانی دماغوں کو روشن کرنے کے لیے ہمہ وقت بے تاب رہتی ہیں۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے زندہ رہنے کی خواہش محض کتاب کی وجہ سے ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔یہ میری بہترین ساتھی ہے۔

کتاب خانوں کو بجا طور پر فکرِ انسانی کے گنج ہائے گرانمایہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ ماضی وحال کے مراکز اتصال ہیں۔ یہاں انسان کی روحانی وذہنی سفر کی تمام منزلیں نظر آتی ہیں۔کتب خانوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے ہمیں خالد بن ولید بن معاویہؒ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے علم دوست خلفاء وحکمران نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی زندگیوں کو دین وعلم کی ترویج کے لیے وقف کردیا۔بنوعباس کا عہد خلافت بجا طور پر اسلامی تاریخ کا عہدِ زریں کہلوائے جانے کا مستحق ہے۔ ہارون الرشید کے کتب خانہ دارالحکمہ میں چار لاکھ کتب تھیں جن کی مضمون وار درجہ بندی ہوچکی تھی۔(بحوالۂ مضمون دین وعلم کی ترویج میں کتب خانوں کا کردار)۔

ان نقل کردہ کچھ تمہیدی کلمات کے بعد راقم السطور مرزا بشیر شاکر اب اپنے اصلی موضوع کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتا ہے اور رقم طراز ہے کہ اُمتِ مسلمہ کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ دنیا کے جس جس خطے میں بھی وہ آباد ہوگئے وہاں اس نے مساجد' خانقاہوں وغیرہ کے ساتھ ساتھ مدارس اور کتب خانوں و لائبریریز کا قیام بھی عمل میں لایا اور درس وتدریس کے اہتمام کے ساتھ مطالعۂ کتب کا ذوق بھی پروان چڑھایا۔شہروں' قصبوں اور محلوں کے اندر انہوں نے دارالمطالعہ قائم کیے۔

لائبریری سائنس Library Science ایک وسیع موضوع ہے اور وقت وقت پر علماء وفضلا نے اس پر بہت سی مفید اور کارآمد کتابیں لکھی ہیں۔ ماضی قریب میں چند ہی سال پہلے تک عوام الناس اور علمی شائقین علمی اداروں میں بیٹھا کرتے تھے اور کتابوں کے مطالعہ میں منہمک رہا کرتے تھے۔

اس مضمون نگار کو ریاست اور بیرون ریاست چند اہم کتب خانے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ بہت پہلے مجھے از ہر الہند یعنی

دارالعلوم دیو بند یو پی جانے کا موقع ملا تھا اور وہاں پر عظیم الشان کتب خانہ دیکھا تھا۔ یہ کتب خانہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں دینی کتابوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی راجدھانی دہلی جاکر میں نے جامع ملیہ اسلامیہ کا کتب خانہ دیکھا تھا۔ یہاں بھی کثیر تعداد میں مختلف موضوعات پر مختلف قسم کی کتابیں موجود ہیں۔ یہ کتب خانہ دیکھنے کے لیے اس وقت دو کشمیری طالب علم جو وہاں ان دنوں زیر تعلیم تھے اور جن کے نام محمد یوسف او رعمران ہیں نے میری راہنمائی کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے دہلی کی سیاحت کے دوران ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کی بیٹی سابقہ وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی کے نجی کتب خانے بھی دیکھنے کا موقعہ میسر ہوا تھا۔ دونوں باپ بیٹی نے اپنے علمی ذوق کے پیش نظر اپنی اونچی اونچی اور شیشہ بند الماریوں میں زیادہ تر انگریزی زبان کی کتابیں موجود رکھی تھیں۔

بیرون ملک مجھے کئی بار مملکتِ خدا داد یعنی پاکستان جانے کا موقع ملا تھا۔ مجھے حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال کے مرقد منور کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ الحمد للہ اس پر جتنا بھی شکر کروں وہ کم ہے۔ یہاں لاہور کی شاہی مسجد میں بھی بطرف مشرق عمارت کی دوسری منزل میں ایک بہت بڑی لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اور زیادہ تر اوپر والی شلفوں میں بڑی بڑی کتابیں دیکھی تھیں مگر ہائے وائے! کتب خانے کے نگران کے سوا وہاں بھی کوئی شخص نظر نہیں آیا تھا اور کتابیں گرد و غبار چاٹ رہی تھیں۔ ایسے ہی لاہور میں، میں نے حضرت علامہ اقبال کا وہ کمرہ بھی دیکھا تھا جو جاوید منزل میں واقع ہے۔ اُس کمرہ میں بھی علامہ اقبالؒ کی زیرِ مطالعہ رہنے والی کتابیں الماریوں میں بند پڑی تھیں۔ عالم اسلام کے بطل جلیل سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا ذاتی ملکیت کا کمرہ بھی میں نے دورانِ سفر دیکھا تھا جو کہ ایک مختصر بلکہ یک منزلہ مکان میں موجود ہے۔ یہاں ہی اسلام کے اس فردِ فرید نے انتقال کیا تھا۔ کوئی سات الماریوں میں، میں نے مرحوم کی کتابیں دیکھی تھیں جو کہ شیشہ والی الماریوں میں مقفل رکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ذاتی ملکیت کی اور بھی بہت سی چیزیں یہاں رکھی گئی ہیں۔

اپنی اس وادی مینو نظیر میں مجھے چند مہینے قبل دار العلوم رحیمیہ بانڈی پور جانے کا موقعہ ہاتھ آیا تھا۔ میں نے دار العلوم کے مشاہدے کے دوران یہاں کی عظیم الشان اور رفیع القدر علمی خزانہ یعنی کتب خانہ کو دیکھنے کی سعادت حاصل کی تھی۔ یہ بے مثال کتب خانہ دوسری تعمیر شدہ عمارت میں منتقل ہونے والا تھا جو کہ اسی غرض و غایت سے جدید خطوط پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہاں بھی دینی کتابوں کا بہت عظیم سرمایہ موجود ہے جس میں تفاسیر قرآن، احادیثِ مبارکہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر موضوعات کی قابلِ قدر کتابیں موجود ہیں۔ سرینگر میں سری پرتاپ سنگھ SPS میوزیم میں بھی ایک قدیم لائبریری موجود ہے۔ جہاں پرانے زمانے کے بہت ہی علمی نوادرات موجود ہیں۔ میرے ایک علم دوست اور ادب نواز جناب عبد الرحمن کوندو صاحب کا کتب خانہ بھی بے نظیر اور بے مثال ہے جو کہ نو تعمیر شدہ روڈ یعنی علی جان روڑ پر واقع ہے۔ کوندو صاحب کو خدا تعالیٰ نے علمی ذوق سے نوازا ہے اور انہوں نے اپنی محنت شاقہ سے یہ کتب خانہ قائم کیا ہے۔ کتب خانوں کی افادیت اور علمی شائقین کے ذوق و شوق کے پیشِ نظر ان کتب خانوں کا ایک سرسری تذکرہ کیا گیا۔

تذکرۂ کتب خانہ اکبر حیدری کشمیری:

پروفیسر ڈاکٹر اکبر حیدری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ برِ صغیر پاک و ہند کے ایک جانے پہچانے اور معروف ادیب اور محقق ہیں۔ اقبال شناسی کی حیثیت سے بھی آپ کی ایک الگ شناخت ہے۔ آپ کشمیر کے گرمائی دار الخلافہ سرینگر کے خانقاہِ سوختہ نوا کدل میں پیدا ہوئے تھے۔ زندگی کے گونا گوں مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اور صبر آزما حالات

سے گذر کر آپ نے علمی اور ادبی مشاغل کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ترقی کے منازل کو طے کرتے ہوئے آپ پروفیسر بن گئے۔

اردو ادب کی خدمت اور اقبالیات کے علاوہ آپ نے بہت سارے دیگر علمی موضوعات پر تحقیقی کام کیا۔ اقبالیات کے سلسلے میں آپ کی تحقیق مستند مانی جاتی ہے اور علمی دلائل اور ناقابلِ تردید شواہد پر آپ اپنی تحقیق کو منطقی انجام پر پہنچانے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ اسی طرح مرزا غالبؔ، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، میر ضمیرؔ اور گلستانِ ادب کے دیگر قدیم شعراء اور ادباء پر آپ نے کافی کام کیا ہے۔ عمر بھر اردو زبان و ادب کی آبیاری اور خدمت گذاری کے لیے آپ دن اور رات ایک کرتے رہے۔

لائبریریوں کو ڈھونڈ نکالا، نوابوں اور راجہ مہاراجوں کی منتیں اٹھانا، گلی گلی گھومنا پھرنا، سڑکوں اور شاہراہوں کی خاک چھاننا، مگر علمی نوادرات دریافت کرنا اور تحقیق کے مرحلوں سے گذرنا پروفیسر اکبر حیدری نے اپنی حیاتِ عزیز کا متاع گرانمانہ جانا تھا۔ قلم کاروں اور ادیبوں نے اُن کے کارناموں کو سراہتے ہوئے اُن کو بجا طور پر ایک جوہری قرار دیا ہے اور اس جوہری کو جہاں سے بھی گذر کر آبلہ پائی کے ساتھ کوئی علمی جوہر ہاتھ لگ جاتا تھا وہ اس کو اٹھا کر اور اس پر لگی گرد جھاڑ پھونک کر صاف کرتے تھے اور پھر ہمہ تن اس کو چمک دمک عطا کرتے تھے۔ دورانِ سفر لکھنؤ، حیدری صاحب کو ایک ایکسیڈنٹ سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا اور چوٹیں بھی آئیں تھیں۔ کیا کشمیر، کیا لکھنؤ، کیا حیدر آباد یا دہلی وغیرہ ان ساری جگہوں کی اس مسافرِ علم نے صحرا نوردی کر کے اپنی علمی پیاس بجھائی تھی ؎

بناء کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

بالآخر اس اقبال شناس اور اردو ادب کے سرپرست نے کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوت کے پیش نظر ۱۸ ستمبر ۲۰۱۲ء میں اپنی عارضی زندگی کا سفر تمام کیا اور ہمیشہ کے لیے موت کے آغوش میں چلا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون! مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس سرکردہ ادیب اور محقق کی قبر آج تک جوں کی توں ہے اور گورنمنٹ اداروں خاص کر کلچرل اکادمی نے اس مقبرے کو شایانِ شان طریقے پر تعمیر کرنے کی طرف تغافل سے کام لیا، جب کہ کئی دوسرے اصحاب کے مقبروں کو زیب و زینت سے سجایا ہے۔

ایسے نامورانِ علم و ادب کے مقابر کو محفوظ رکھنا زندہ قوموں کی نشانی سمجھی جاتی ہے اور آئندہ شخصیتوں کے لیے ایسے کام سود مند ثابت ہو سکتے ہیں۔ امید ہے کہ کلچرل اکادمی سے وابستہ افراد اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

راقم الحروف کو کوئی بارہ یا تیرہ سال قبل پروفیسر اکبر حیدری کی حینِ حیات میں اُن کے دولت کدہ بمقام ہمدانیہ کالونی بمنہ سرینگر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس سے پہلے ان کے ساتھ قلمی تعارف اور غائبانہ طور پر بذریعۂ ٹیلی فون بات چیت کرنے کا شرف ملا تھا۔ کتابی ضرورت اور روبرو ملاقات کرنے کی غرض سے میں بمنہ میں ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا تھا۔ علیک سلیک اور کچھ رسمی ملاقات کے بعد آنجناب نے مجھے چائے پلا کر مہمان نوازی کا ثبوت دیا۔ پھر انہوں نے وسیع القلبی سے مجھے اوپر والی منزل میں اپنی لائبریری دکھائی مگر پہلے یہ شرط عائد کی تھی کہ میں ان سے کسی کتاب کا مطالبہ نہ کروں جس پر میں نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کی تھی۔

اوپر جا کر محترم حیدری صاحب نے مجھے اپنا کتب خانہ دکھایا۔ کتب خانہ کیا ہے؟ ایک گنج گرانمایہ اور علم و ادب کا ایک عطر بیز لہلہاتا ہوا گلشن۔ یہاں میں حیران و سرگردان رہا کہ کس زمانے کی کتابیں، مخطوطات، اخبارات، رسالے یہاں موجود ہیں۔ یہ اسی شیدائی علم و ادب کا گردہ ہے اور اس کی ہمت و حوصلہ کی بات کہ قدیم وقتوں کے رسالے جیسے مخزن لاہور،

صوفی پنڈی بہاؤالدین، زمانہ کانپور، خدنگ نظر وغیرہ رسالے اس گنجینۂ ادب میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم شعراء کے کلام پر مشتمل دواوین بھی اس لائبریری میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں قدیم اور نامی گرامی شعراء کرام کی تصویریں بھی البموں میں محفوظ رکھی گئی ہیں۔

اب ذرا تفصیلاً کتابوں، رسالوں اور دیگر فن پاروں کے بارے میں شیدایان علم وادب کے لیے لکھا جاتا ہے۔ کیا ہی اہل ذوق اور اہلِ نظر لوگ تھے جنھوں نے علمی مجنون بن کر لیلائے ادب کے عشق میں یہ نوادرات اور نسخہ جات جمع کیے تھے اور آج ہم جیسے کاہل طبیعت اور آرام طلب قلم کار کہلانے والے پکی پکائی روٹی کھا کر ڈکار لیتے ہیں اور بلند بانگ دعوی کرتے ہیں۔ حیدری صاحب جیسے اساتذہ کی تقلید سے ہی ہم کسی علمی مجلس یا محفل میں بیٹھنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

کچھ تفصیل کتب خانۂ اکبر حیدری میں موجود کتابوں اور دیگر علمی نوادرات کی۔

۱۹۵۰ء سے جمع کردہ کتابیں ۵۰۰۰ سے زیادہ، رسائل وقدیم اخبارات موجود ہیں۔

قدیم اخبارات: اودھ اخبار ۱۸۶۰ء کی فائل سے آگے، مخزن الفوائد حیدر آباد، الپنچ پٹنہ، سفیر ہند امرتسر، اخبار چودھویں صدی راولپنڈی، الوقت گورکھپور، نقاد آگرہ، مخزن لاہور، صوفی منڈی بہاؤالدین، نیرنگِ خیال لاہور، علی گڑھ میگزین علی گڑھ، سہیل علی گڑھ، کلیم دہلی وغیرہ۔

کتب اقبالیات تقریباً ۲۰۰ جس میں خود حیدری صاحب کی درجن بھر کتابیں ہیں۔

غالبیات تقریباً ۱۵۰ جس میں حیدری صاحب کی نصف درجن کتابیں ہیں۔

میریات: ۱۰۰ سے زائد، جس میں حیدری صاحب کی ۴ کتابیں شامل ہیں۔

مراثی: تقریباً ۳۳۰ جس میں خود حیدری صاحب کی درجن بھر کتب ہیں۔

تاریخ اردو ادب تقریباً ۱۰۰ سے زائد جن میں تاریخ احمدی، تاریخ حسن، تاریخ بہارستان شاہی، تاریخ کشمیر، تاریخ اردو ناگپور، بہار گلشن تاریخ کشمیر پنڈتان، تاریخ ہند، تاریخ اردو تامل ناڈو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مذہبیات واسلامیات پر بھی خاصی کتابیں کتب خانۂ اکبر حیدری میں موجود ہیں جن میں نقوش لاہور کا رسول نمبر اور قرآن نمبر شامل ہے۔ غالباً ہندوستان میں صرف کتب خانۂ اکبر حیدری ہی میں مکمل رسول نمبر کا سیٹ موجود ہے۔ اَلْحَمْدُلِلّٰہ راقم السطور کی ذاتی لائبریری میں بھی سیرت پر مبنی یہ لاثانی اور گرانقدر رسول نمبر مکمل صورت میں موجود ہے۔

قلمی مخطوطات: مراثیِ انیسؔ ودبیرؔ، دیوانِ آتشؔ، دیوانِ ذوقؔ، دیوان غالبؔ وغیرہ۔

لغات اردو، فارسی وانگریزی ڈکشنریاں اور انسائیکلو پیڈیا کی بھی خاصی تعداد بھی یہاں موجود ہے۔

متعدد ناولیں بھی موجود ہیں جن میں اہلیہ اکبر حیدری محترمہ فرحت آراء حیدری صاحبہ کی ڈیڑھ درجن ناولیں بھی موجود ہیں۔ ایک ناول ''فطرت'' مرحوم پر شیخ محمد عبداللہ نے بھی جیل سے ۱۹۶۲ء میں تبصرہ کیا ہے۔ جگہ کی تنگی کے باعث متعدد کتابیں بند پڑی ہوئی ہیں۔ پروفیسر اکبر حیدری کے لائق وفائق فرزند ڈاکٹر محمد ظفر حیدری بہت جلد لائبریری کو وسعت دینے کا ارادہ رکھتے ہیں نیز کتابوں کی کیٹالاگنگ بھی شروع ہوگئی ہے۔ بعض قدیم اور بوسیدہ کتابوں کی جلد بندی کا بھی ارادہ ہے۔

کتب کے علاوہ لائبریری میں سینکڑوں کی تعداد میں مشاہیر کے خطوط بھی موجود ہیں جن میں جوشؔ ملیح آبادی، محمد

پروفیسر اکبر حیدری کے لائق و فائق فرزند ڈاکٹر محمد ظفر حیدری بہت جلد لائبریری کو وسعت دینے کا ارادہ رکھتے ہیں نیز کتابوں کی کیٹالاگنگ بھی شروع ہوگئی ہے۔ بعض قدیم اور بوسیدہ کتابوں کی جلد بندی کا بھی ارادہ ہے۔

طفیل، وحید قریشی، جسٹس جاوید اقبال، جسٹس محمد ہدایت اللہ، جسٹس مرتضیٰ فضل علی، مشفق خواجہ، ہلال نقوی، ڈاکٹر سید ضمیر نقوی، ڈاکٹر تقی عابدی، شمس الرحمن فاروقی، حامدی کاشمیری، گوپی چند نارنگ، محمود الحسن، جعفر رضا وغیرہ شامل ہیں۔

علم وادب اور زبان اردو کے اس شہسوار نے کیسے پاپڑ بیلے ہوں گے اور کن خارزاروں سے گذر کر اپنے آپ کو لہولہان کیا ہوگا۔ کتنے دنوں کا چین اور کتنی ہی راتوں کی نیند خراب کی ہوگی۔ کس طرح قدیم زمانے کے ریگ زاروں اور نوکیلے کانٹوں کی چبھن کو برداشت کر کے اپنے شوق کا یہ گلستان سجایا ہوگا۔ اردو دنیا سے باخبر اور تجربہ کار حضرات کی رائے ہے کہ حیدری صاحب جیسے ادیب نامور کی کڑی مولانا حالی، ظفر علی خان اور دیگر ادیبوں سے ملتی ہے۔ تنقید اور تحقیق کے میدان میں حیدری صاحب کا رنگ اور ڈھنگ بالکل الگ جھلکتا ہے اور ان کی یہ نمایاں پہچان ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دنیائے فانی میں کوئی بھی چیز حرفِ آخر نہیں ہوسکتی ہے۔ سہو وخطا اور لغزشوں سے کوئی بھی شخص مبرا نہیں ہوسکتا ہے۔ حیدری صاحب کی ادبی زندگی کے بارے میں تفصیل سے علیحدہ طور پر لکھنے کی گنجائش ہے اور اس مضمون میں ایسی باتوں کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں

پروفیسر اکبر حیدری کے سر یہ سہرا بھی بندھتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی وفات سے کوئی چھ سال قبل ایک تحقیقی ادبی مجلہ ''حکیم الامت'' کے نام سے جاری کیا جو کہ ماہنامہ بنیادوں پر مسلسل بارہ برسوں سے جاری وساری ہے اور راقم بھی اس کا ایک ممبر ہے۔ یہ رسالہ بھی ایک روشن قندیل کی طرح اپنی ضیاء پاشیوں سے اندھیری راہوں کو روشن کرتا ہے اور اردو زبان وادب کی بہترین اور قابل قدر خدمت انجام دیتا ہے۔ وقتاً فوقتاً ریسرچ کرنے والے اسکالر اس کے یادگاری نمبروں کی تلاش میں رہتے ہیں اور سربرآوردہ قلم کار خطوط کی صورت میں اس کی سراہنا کرتے ہوئے دادِ تحسین دیتے ہیں۔

کتب خانوں کا شائقین کتب کے نام پیغام:

اے کتابوں کے شوقین اور مطالعہ کا ذوق رکھنے والو۔ آؤ اور دوبارہ ہماری صحبت اختیار کرو۔ ہماری ہم نشینی آپ کے لیے بہت سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔ زمانۂ ماضی کو یاد کرو کہ ہماری کتابوں کی چھپٹا جھپٹی میں ہماری جلدیں ٹوٹ جاتی تھیں۔ ہماری کمیابی کی وجہ سے آپ کو بہت انتظار کرنا پڑتا تھا پھر کہیں ہم آپ کے ہاتھ لگ جاتی تھیں۔

اے موجودہ دور کے کتب بینی سے دور ہوجانے والو۔ ذرا اپنے بزرگوں کو یاد کرو اور ان کے ذوقِ مطالعہ کی تحقیق کرو کہ وہ کس طرح مطالعۂ کتب میں محو رہا کرتے تھے۔ ان کے راتوں کی نیند اڑ جاتی تھی اور وہ اپنے خواب راحت سے بے خبر ہوکر ہمارے اندر کھو کر بلندیوں کو چھوتے تھے۔ کمپیوٹر اور دیگر ذرائع کی تحریروں سے آپ کو وہ لطف حاصل نہیں ہوسکتا ہے جو کہ ہماری ورق گردانی اور تحریروں سے آپ کو حاصل ہوسکتا ہے۔ ذرا ایک نظر یورپی ممالک کو بھی دیکھو کہ تمام تر ترقیوں اور جدید سہولیتوں کے باوجود بھی کتاب ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی ہے۔ کتاب کو وہ ایک بہترین ساتھی سمجھتے ہیں اور وہ اس کے مطالعہ سے تسکین حاصل کرتے ہیں۔------- (باقی ص 35 پر)

علی بخش: خادمِ علامہ اقبالؔ

تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ عاشق کو اپنے معشوق کی ہر ایک چیز پیاری ہوتی ہے اور اس کی ہر اَدا اُس کو بھاتی ہے' اسی لیے مجنوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ لیلیٰ کے عشق ومحبت میں سرگرداں پھرا کرتا تھا اور جب وہ لیلیٰ کی گلی سے گذرتا تھا تو وہاں کتیا کے بچے کو بھی اپنی گود میں اٹھاتا تھا اور اس کو چومتا بھی تھا۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ بذاتِ خود عاشق تھے اور عشق ومحبت کی سرمستیوں سے سرشار اور مالا مال تھے۔ آپ کا سارا فلسفۂ حیات عشق ومحبت سے لبریز ہے اور آپ نے اپنے شعر وادب کی سوغات کو عشق و عاشقی ہی کے جذبات سے زیب وزینت بخشی ہے وہ خود فرماتے ہیں ؎

عشق دمِ جبریل' عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام

- - - - -

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع ودین بت کدۂ تصورات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

- - - - - -

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلمان بھی کافر و زندیق

علامہ کی زندگی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار تھی اور وہ اکثر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی سے بے تاب ہو کر آنسو بہاتے رہتے تھے۔ اسی طرح دورانِ تلاوت قرآن بھی تر بتر آنکھوں سے اس مقدس صحیفہ کے مطالعہ میں محو رہتے تھے۔ یہ ان کے عشق کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ۸۱ سال کا طویل عرصہ گذرنے کے باوجود بھی ان کا تذکرہ ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ ان کی یاد میں سال بھر سمینار' کانفرنسیں اور یادگاری محفلوں کا انعقاد عمل میں لایا جاتا ہے۔ خصوصاً ۹ نومبر اور ۲۱ اپریل کو ہر سال یونیورسٹیوں' کالجوں اور دیگر علمی وادبی اداروں میں پُروقار مجالس اقبالؔ کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اقبالؔ کی زندگی اور ان کے فلسفۂ خودی یا دیگر موضوعات کو زیر بحث لایا جاتا ہے اور اس طرح نئی پود کو اقبالیات کے فکر وفلسفہ سے روشناس کیا جاتا ہے۔ ان کے نام سے بہت سارے ادارے اور اسکول وغیرہ منسوب کیے گئے ہیں۔

یہ حضرت علامہ کی سحر آفرین شخصیت کا کرشمہ ہے کہ جہاں ان کی وفات کے بعد ان کے چاہنے والوں کی دنیا بھر میں ایک خاصی تعداد نظر آتی ہے وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی حین حیات میں ہی بہت سارے احباب' مفکر' دانشور اور علم دوست حضرات ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوئے تھے اور شب وروز اس عظیم اور عبقری شخصیت کی خدمت میں حاضر رہ کر علمی استفادہ کرتے تھے۔ کبھی کبھی یہ حضرات علامہ کی صحبت سے فائدہ اٹھا کر فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ کبھی سیاسی امور پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ کبھی زندگی اور موت کے حقائق سے رمز آشنا ہوتے تھے اور کبھی شعر وسخن پر اظہار خیال کرکے اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ اس طرح یہ مفکرین ملک وملت علامہ اقبالؔ

کے انقلاب آفرین اور روشن خیالات سے مستفید ہو کر دوسروں کو بھی بہرہ ور کرتے تھے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت علامہ کی خدمت عالیہ میں معروف ہم عصر عالمانہ شخصیات کی آمد ورفت رہتی تھی۔ جن میں کچھ نام یوں ہیں: مولانا غلام رسول مہرؔ سید نذیر نیازی (زندگی کے آخری سالوں میں) سر محمد شفیع، چودھری محمد حسین، حفیظ جالندھری، سر ذوالفقار علی، مرزا عبدالقادر بیدلؔ، عبدالصمد ککرو رئیس بارہمولہ کشمیر المتخلص بہ مقبولؔ، حکیم نابینا، سر شیخ عبدالقادر مدیر مخزن، مولانا گرامیؔ، مولانا ظفر علی خان، منشی طاہر الدین وغیرہ۔ غرض اپنے زمانے کے علم وادب کے چاند ستارے بزم اقبال میں وقتاً فوقتاً حاضر رہتے تھے۔

اسی طرح جہاں علامہ کی خدمت میں بڑے بڑے اکابر حاضر رہتے تھے وہاں ایک معمولی سا انسان بھی اپنا شوق پورا کرنے کے لیے علامہ کی زیارت سے مستفید ہوسکتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک کباب فروش بھی علامہ کی شہرت سے متاثر ہو کر ان کو دیکھنے کی غرض سے لاہور میں ان کی دہلیز پر حاضر ہو کر اپنی ملاقات کی پیاس بجھاتا تھا۔ چنانچہ ایک عرصہ سے مجھ کمتر راقم الحروف کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہو رہا تھا کہ اس حکیم مشرق اور دانائے راز کے گھریلو خادم یعنی علی بخش کے بارے میں اپنے کچھ خیالات کا اظہار کر کے اس کی خادمانہ زندگی کے گوشوں میں بھی مختصراً کچھ لکھوں کہ کس طرح اس سعادت مند شخص کے نصیب جاگے تھے اور اس کی قسمت کا ستارہ چمکا تھا کہ اس کو علامہ اقبال جیسی عالمی شہرت یافتہ اور بارگاہِ خداوندی میں مقبول شخصیت کی خدمت گذاری قسمت میں ملی اور عمر بھر یہ شخص عظیم مفکر کی رات دن خدمت کرتا رہا۔

علی بخش کے بارے میں کچھ لکھنے سے پیشتر مناسب سمجھتا ہوں کہ فیضانِ اقبال کے بارے میں درج ذیل کچھ سطور صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر علی بخش خادم اقبال کی بلندئ قسمت اور سعادت مندی کو ثابت کرسکوں۔

جناب ممنون حسن خان اپنے ایک مضمون ''اقبال کی فیضانی یادوں کے سائے'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''بھوپال میں حضرت علامہ کے گلے کا علاج برقی شعاعوں سے پرنس آف ویلیز ہاسپٹل (موجودہ حمیدیہ ہاسپٹل) میں کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر سید عبدالباسط ان کے معالج خاص تھے۔ سر راس مسعود ان کو ہاسپٹل لے جاتے تھے۔ ان کے شخصی معاون کے طور پر میں سر سید ثانی کے ساتھ رہتا تھا۔ بجلی کے علاج کے دوران جب حضرت علامہ اپنے جوتے اتار دیتے تھے تو میں ان کو اپنے رومال میں لپیٹ کر اپنی بغل میں دبالیا کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر سر سید ثانی بڑی محبت سے میری طرف دیکھتے تھے اور مسکراتے تھے۔ جب علاج ختم ہوجاتا تو میں اپنے ہاتھ سے حضرت علامہ کو جوتے پہنا دیتا تھا۔ مجھے زندگی میں ایسی دو سعادتیں حاصل ہوئی ہیں جن کو میں اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ اپنی مرحومہ ماں کی کفش برداری اور حضرت علامہ کی کفش برداری''۔

(بحوالہ اقبالؔ بحر خیال، مرتب: پروفیسر بشیر احمد نحوی)

سبحان اللہ! کیسی جانفزا اور مسرت افزاء بات ہے۔ کیسے عاشقان اقبالؔ اس دنیا میں آئے ہیں۔ اوپر نقل شدہ اقتباس میں صاحب مضمون جناب ممنون حسن خان حضرت اقبالؔ کی کفش برداری کو اپنا ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں تو اس شخص کی بختاوری اور خوش بختی کا کیا کہا جائے کہ جس کو ساری عمر اس فقید المثال اور روحانی فیض وبرکت سے مالا مال یعنی علامہ اقبالؔ کی خدمت گذاری نصیب ہوئی تھی اور جو ہر وقت علامہ کے حکم اور ارشادات کے لیے ہمہ تن گوش رہتا تھا اور ہر اک حکم کو بہ خوشی بجا لاتا تھا اور ہر خواہش کی تکمیل میں خود کو تیار رکھتا تھا۔

قارئین کی خدمت میں راقم بھی اپنے کچھ فیض رساں لمحات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہے کہ سن ۲۰۱۴ء میں مجھے بھی پہلی بار لاہور پاکستان میں مرقد حضرت اقبالؔ پر حاضری نصیب ہوئی اور میں اس یادگاری لمس کو کیسے فراموش کرسکتا ہوں کہ جب مجھے اس مردِ خود آگاہ کی قبر کو اپنے دونوں گنہگار ہاتھوں سے تھامنے کا موقعہ ملا تھا اور میں اس وقت اللہ کی بارگاہ اقدس میں محو دعا ہوا تھا۔ سنگ مرمر سے تعمیر شدہ یہ تاریخی روضہ اور اس کا کتبہ تھام کر ایک عجیب کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ علامہ نے خود فرمایا تھا ؎

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

اسی سفر پاکستان کے دوران علامہ اقبالؔ کے فرزند جسٹس جاوید اقبال کے ساتھ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات بھی نصیب ہوئی تھی اور یہ ملاقات ان کے دولت کدہ واقع گلبرگ لاہور میں ہوئی تھی۔

انہی کی ہدایت اور راہنمائی سے مجھے حضرت علامہ کی آخری رہائش گاہ یعنی جاوید منزل جانے کا موقعہ بھی ملا تھا جہاں پر وہ آخری تین سال کے لیے رہائش پذیر ہوئے تھے۔ میں اس کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتا ہوں کہ مجھے جاوید منزل میں وہ کمرہ دیکھنے کا موقعہ ملا جہاں اس محسن ملت نے انتقال کیا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اس بیڈ پر بچھے شیٹ کو اپنے ہاتھ سے چھونے کی کوشش کی تھی جس پر علامہ نے آخری سانسیں لی تھیں۔ دیگر چیزوں کے علاوہ میں نے علامہ اقبالؔ کے استعمال شدہ جوتے بھی دیکھ لیے تھے اور ان کا عکس آج بھی میرے تصور میں ہے۔

اسی طرح تیسری بار مملکت خداداد کے سفر کے دوران میں نے حکیم الامت کی سن رسیدہ صاحبزادی منیرہ صلاح الدین کے ساتھ بھی شرف ملاقات حاصل کیا تھا۔ یہ ۲۶ فروری ۲۰۱۶ء کی تاریخ تھی۔ جونہی محترمہ کمرے میں داخل ہوئی تھیں تو میں نے فرطِ عقیدت و محبت سے ان کی جبین کو اپنی محبتوں کا بوسہ دیا تھا۔ کیونکہ یہ دونوں بھائی بہن بچپن میں اپنے باپ کے لاڈلے رہے تھے۔ آں محترمہ نے میری اقبالی عشق و محبت کو بھانپ کر اپنے مبارک ہاتھوں سے میرے کندھوں پر اپنے ذاتی استعمال کا شال ڈال دیا تھا جو کہ میرے پاس موجود ہے۔ (اس بارے میں، میں نے تفصیلاً پہلے ہی اخباروں اور رسائل میں لکھا ہے)۔

ہاں بات چل رہی تھی خادم اقبال علی بخش کی مگر ان سنہری یادوں نے اور مجنون کی طرح عشق لیلیٰ میں گرفتار میری یہ تاریخی یادیں تازہ ہو کر میرے ذہن و دل میں رقص کرنے لگیں اور اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں ان باتوں کو قندِ مکرر کے طور پر قلمبند کرنے پر آمادہ ہوا۔

علی بخش کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے بہتر یہی رہے گا کہ خود علی بخش ہی کی زبانی ان کی کہانی قرطاس کے ان صفحات پر درج کی جائے اور وہ کیسے اور کس طرح علامہ اقبالؔ کی خدمت میں پہنچے تھے یہ بھی اسی سعادت مند اور نیک بخت انسان ہی کی زبانی درج کیا جاتا ہے کہ وہ اس طرح ہے۔

"میں علی بخش موضع اٹل گڑھ ضلع ہوشیار پور کا رہنے والا ڈاکٹر صاحب کا قدیمی خادم ہوں۔ میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ اسی لیے ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ میں کب ان کے پاس نوکر ہوا۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ جب میں ان کے پاس آیا تو میری عمر چودہ سال کی تھی۔ اب میں پچاس یا پچپن سال کا ہوں گا۔ یا شاید اس سے ایک دو سال کم یا زیادہ اس حساب سے میں کوئی اڑتیس یا چالیس سال ان کے پاس رہا۔

کانگڑہ کا زلزلہ آپ کو یاد ہوگا بس اُن دنوں مجھے ڈاکٹر صاحب کی نوکری میں پانچواں یا چھٹا سال تھا۔ اب آپ خود حساب کر لیجئے کہ مجھے ان کی خدمت میں کتنے سال ہوئے۔

میں جب اٹل گڑھ سے لاہور آیا تو اسلامیہ کالج کے

پرنسپل مولوی حاکم علی کو نوکر کی ضرورت تھی۔ مجھے ایک آدمی اُن کے پاس لے گیا اور چار روپے اور روٹی کپڑے پر مجھے ان کے پاس نوکر کرا دیا۔

مولوی حاکم علی بھاٹی دروازہ کے اندر رہتے تھے ان کے مکان کے سامنے ایک بالا خانہ تھا جس میں اورینٹل کالج کے ایک پروفیسر صاحب رہتے تھے۔ یہ بڑے گورے چٹے کسرتی بدن کے نوجوان تھے اور ان کا نام شیخ محمد اقبال تھا۔ یہی شیخ محمد اقبال آگے چل کر ڈاکٹر اقبالؔ اور سر اقبالؔ بنے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا رتبہ دیا۔ مولوی حاکم علی سے ان کا بڑا میل جول تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔

میری عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی۔ گاؤں سے نیا نیا آیا تھا اس لیے شہر کے طور طریقے نہیں جانتا تھا۔ شہر والوں کی بعض باتیں بھی میری سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ ایک دفعہ مولوی صاحب نے کہ آج سالن میں انار دانہ ڈالنا۔ میں سمجھا یہی دانہ ڈالنے کو کہہ رہے ہیں، میں پنساری کے ہاں سے ایک پیسے کا یہی دانہ لے آیا اور سالن میں ڈال دیا۔

اس بات کی بڑی شہرت ہوئی۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب نے بھی یہ قصہ سنا اور بہت ہنسے۔ پھر تو مجھے سب چھیڑنے لگے ایک دن مولوی حاکم علی صاحب کہنے لگے آج بتاشوں کا مربّہ لے آنا۔ میں سارا شہر پھر آیا لیکن بتاشوں کا مربّہ کہیں نہ ملا۔ جس دکاندار سے مانگتا تھا وہ بے اختیار ہنس پڑتا تھا۔

ایک دن میں کسی کام سے ڈاکٹر صاحب کے ہاں گیا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے علی بخش تم میرے پاس کیوں نہیں چلے آتے۔ اگر تمہیں میری نوکری کرنا منظور ہو تو میں مولوی صاحب سے کہہ دوں۔

پہلے تو میں کچھ ہچر مچر کرتا رہا۔ پھر حامی بھر لی۔ کہنے لگے۔ اب تو جون کا مہینہ ختم ہونے کو ہے کچھ دنوں تک کالجوں میں تعطیل ہو جائے گی تعطیل ختم ہونے پر آنا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے اس معاملہ کی نسبت کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ تعطیل شروع ہوئی تو میں گھر چلا گیا۔ اکتوبر میں واپس آ کر ڈاکٹر صاحب سے ملا تو وہ بولے بھئی علی بخش! تم نے مجھ سے چلتے وقت کوئی بات نہیں کہی تھی اس لیے مجھے یقین نہیں تھا کہ تم واپس آؤ گے۔ اب تو میں سیالکوٹ سے نوکر لے آیا، جب تک تمہیں نوکری نہیں ملتی یہی رہو، میں تمہارا کوئی نہ کوئی انتظام کر دوں گا۔

میں نے کہا میرے کچھ ہم وطن لاہور میں رہتے ہیں، انہیں کے پاس جا ٹھہروں گا یہ کہہ کر میں چلا گیا۔ تھوڑے دن گزرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے استاد مولوی میر حسن صاحب سیالکوٹی کے فرزند سید تقی شاہ صاحب پتہ پوچھتے پوچھتے میرے پاس آ پہنچے اور کہنے لگے کہ تمہیں شیخ صاحب نے بلایا ہے۔

بات یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب سیالکوٹ سے جو نوکر لائے تھے وہ بد دیانت نکلا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے تو طرح دیتے رہے کہ شاید سُدھر جائے لیکن جب اس کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا تو اسے علیحدہ کر دیا اور پھر مجھے بلوا بھیجا۔ انہیں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا اب میں بالکل آزاد ہوں جو چاہوں کروں اور جو چاہوں کہوں شاید یہ پھانس جو مدت سے میرے دل میں کھٹکتی ہے اب نکل جائے۔

ہمارے علاقہ میں بچپن کی شادیوں کا بہت رواج ہے۔ میری شادی بھی بچپن میں ہوگئی تھی۔ جب تک میری عمر چھوٹی تھی۔ سسرال والے چپکے بیٹھے رہے۔ مگر جب میں بڑا ہوا تو انہوں نے اصرار کیا کہ بیوی کو لے جاؤ۔ غرض گولے کی رسم ادا کی گئی اور میں بیوی کو جا کے لے آیا۔ کچھ دن میں گھر پر

رہا۔ پھر بیوی کو اٹل گڑھ چھوڑ کر لاہور چلا آیا۔

میرے رشتہ داروں کو میرا لاہور میں رہنا پسند نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ تم اب گرہستی ٹھہرے۔ لاہور کو چھوڑ و اور یہیں آ کے رہو۔ نوکری میں ہزار آرام سہی مگر گھر سا آرام کہاں؟ کئی دفعہ میرا جی بھی نوکری چھوڑ کر چلے جانے کو چاہا لیکن ڈاکٹر صاحب سے یہ بات کہنے کا حوصلہ نہ پڑا۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب دن بھر کے کاموں سے فرصت پا کر گھر آئے اور کھانا کھا کر حقہ پینے لگے۔ میں نے جی کڑا کر کے کہا:

''شیخ صاحب میں گھر چلا جانا چاہتا ہوں''۔

وہ حقہ پیتے پیتے رُک گئے اور کہنے لگے۔

''کیوں خیر ہے؟''

میں نے کہا ''اب میرا جی لاہور میں نہیں لگتا۔ جی چاہتا ہے گھر چلا جاؤں اور باقی عمر اپنے کنبہ میں گزاروں''۔

ڈاکٹر صاحب بولے۔

''کیا تم نے سچ مچ ارادہ کرلیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں''۔

انہوں نے تین بار یہی بات پوچھی اور میں نے ہر بار جواب میں یہی کہا کہ میں اب لاہور میں نہیں رہ سکتا۔

وہ کہنے لگے۔ ''اچھا کب جاؤ گے؟''

میں نے کہا۔ ''اجازت ہو تو ابھی چلا جاؤں؟''

فرمایا۔ ''تمہاری مرضی''۔

میں نے بوریا بدھنا اٹھایا اور اجازت چاہی تو کہنے لگے۔ ''علی بخش! میرا جی چاہتا ہے کہ تم میرے پاس ہی رہو''۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پھر کہنے لگے ''میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ تمہیں نہ جانے دوں۔ ہاں اگر تم چھٹی لے کے جانا چاہو تو اور بات ہے، جب جی چاہے گھر ہو آؤ کوئی روکتا تھوڑے ہی ہے بلکہ اچھا تو یہ ہے کہ سال میں کچھ عرصہ چھٹی کا مقرر کرلو اور یہ دن اپنے گھر گذار آیا کرو''۔

میں نے ارادہ تو بڑا پکا کیا تھا کہ اب لاہور میں نہیں رہوں گا لیکن ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن کر ارادہ ٹوٹ گیا اور جب انہوں نے پوچھا، ''کیوں یہ بات منظور ہے؟'' تو میری زبان سے صرف اتنا نکلا، ''جی ہاں شیخ صاحب''۔ وہ پھر کہنے لگے، ''کیوں اب مجھے چھوڑ کے نہیں جاؤ گے؟''

کئی سال تو یونہی ہوتا رہا کہ میں کچھ دنوں کے لیے گھر چلا جاتا تھا پھر یکایک میری بیوی کا انتقال ہو گیا' لوگوں نے کہا' تم ابھی جوان ہو دوسرا بیاہ کرلو ایک دو جگہ سے شادی کی بات بھی آئی مگر میں نے پھر شادی نہیں کی اور ڈاکٹر صاحب کے قدموں میں عمر گذار دی۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے کبھی برا بھلا نہیں کہا۔ ایک دفعہ ان کے بھانجے نے مجھے گالی دی تو اس پر سخت ناراض ہوئے بلکہ اسے پیٹا بھی۔ البتہ دو تین دفعہ مجھ پر خفا ضرور ہوئے اور یہ خفگی تھوڑی دیر میں جاتی رہی۔

کوئی سال بھر ہوا کہ ایک سکھ ڈاکٹر صاحب کے ہاں آیا۔ ان کے ہاں ہر قسم کے لوگ آتے تھے' کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اس نے آتے ہی گلاس مانگا اور بغل سے بوتل نکال کر گلاس میں شراب انڈیل دی غٹا غٹ چڑھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو تاب کہاں سخت خفا ہوئے اور کہنے لگے تم نے اس کمبخت کو گلاس کیوں لا دیا اور جب وہ شراب پینے لگا تھا تو اسے روکا کیوں نہیں؟ اس واقعہ کے سوا ڈاکٹر صاحب عمر بھر میں کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہوئے۔

(بحوالہ اقبال نامہ' چراغ حسن حسرت)

اس طرح اس خادم اقبال کی زندگی کے دن عظیم المرتبت شاعر اور مفکر کی خدمت میں گذرتے رہے۔ اس خادم

اور مخدوم مکرم کے درمیان گذرے اوقات بھی اور ان کے درمیان وقوع پذیر ہوئے واقعات بھی قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے اور ان یادگاری لمحات سے سبق حاصل کرنے کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔

سر سید راس مسعود بھی علی بخش سے بہت مذاق کی باتیں کیا کرتے تھے ایک بار انہوں نے علی بخش کی مونچھوں کی بہت تعریف کی ۔ علامہ نے فرمایا: مسعود ! تمہاری اس تعریف سے میں بہت خوش ہوا ہوں۔ کم از کم تم نے علی بخش کے ساتھ انصاف کیا اور اس کی مونچھوں کی تعریف کی۔

میں تو علی بخش کی مونچھوں کو دیکھ کر اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ ہمارے شاعر محبوب کی زلفوں کی تو بہت تعریف کرتے ہیں لیکن علی بخش کی مونچھوں کی کوئی تعریف نہیں کرتا ہے' یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے۔

(اقبال کی فیضانی یادوں کے سائے' مشمولہ اقبال بحر خیال)

علی بخش کو گھریلو کام انجام دینے کے ساتھ ساتھ علامہ کی ہی صحبت میں نشست و برخاست کے مواقع میسر رہتے تھے ۔جس وقت علامہ اقبال پر اشعار کا نزول ہونے لگتا تھا تو بقول علی بخش اس وقت ان کی حالت غیر ہوجاتی تھی۔ ان پر اس وقت کپکپی طاری ہوجاتی تھی اور وہ اپنے ہاتھوں کو بھی بجاتے تھے ۔اس حالت سے نکل کر ان کے ماتھے پر پسینہ پھوٹتا تھا اور پھر وہ علی بخش کو قلم اور دوات لے آنے کی فرمائش کرتے تھے اور اپنے تازہ ترین اشعار قلمبند کرتے تھے۔

علی بخش کو مہمانوں کی خاطر داری کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا جو کہ علامہ کی ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے۔ چنانچہ مولانا گرامی جو اقبال کے قریبی دوستوں میں سے تھے کے بارے میں لکھتے ہیں' گرامی صاحب کو سنگترے بہت مرغوب تھے۔ میں بازار جاتا تو کہتے تھے میرے لیے ناگپوری سنگترے مت لائیو۔ میں سنگترے لاتا تو کہتے ارے میاں یہ سنگترے تو بہت چھوٹے ہیں اور کھٹے بھی تو ہیں۔ آئندہ ایسے سنگترے لائیو۔ میں دوسری دفعہ جاتا تو دیسی سنگترے لے آتا۔ انہیں دیکھ کر کہتے یہ بڑے بڑے سنگترے کیا اٹھا لائے' یہ تو کسی کام کے نہیں ناگپوری سنگترے لایا کرو۔

اقبال کے پنتالیس سال تک گھریلو خدمت پر مامور خادم علی بخش نے اقبال کی خانگی زندگی کے حوالے سے جو بیانات تاثرات' حالات اور واقعات بیان کیے ہیں' ان میں سے ایک جگہ بھی شراب نوشی کا کہیں ذکر نہیں۔ علی بخش کا ایک بیان شراب نوشی کے الزام کے رَد پر کافی ہے کہ ایک سکھ دوست اقبال سے ملاقات کے بعد اقبال کے مکان کے برآمدے میں شراب پینے لگا۔ اقبال نے علی بخش سے پوچھا کہ کیا'' وہ سکھ چلا گیا''، علی بخش بولا ہاں چلا گیا۔ لیکن اپنے ٹانگے سے کوئی بوتل لاکر برآمدے پر شاید شراب پی رہا تھا۔ علی بخش کا کہنا ہے کہ میں نے اقبال کو کبھی اس قدر غضب ناک ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جیسا غصہ لفظ شراب سن کے اقبال کو آ گیا اور کہنے لگا،''اس سکھ کو فوراً برآمدے سے ہٹاؤ''۔

(بحوالہ اقبال' بحر خیال' از پروفیسر بشیر احمد نحوی)

مولانا گرامی کے بارے میں علی بخش بیان کرتے ہیں کہ:

''کبھی کبھی آدھی رات کو چائے کی طلب ان کو پریشان کر دیتی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں رات کو دو تین بجے بازار گیا' حلوائی کی دکان کھلوائی' دودھ لایا اور چائے بنا کر دے دی''۔

ایسے ہی ایک اس شیرین تر قصہ کو جاری رکھتے ہوئے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت علامہ کی شخصیت کے کچھ خاص روحانی اور پُر اسرار حالات بھی کتابوں میں درج ہوئے

ہیں۔ چنانچہ علی بخش نے بیان کیا ہے کہ کئی دفعہ رات کی خاموشی میں مجھے حضرت علامہ نے بلایا اور کہا اس شخص کو ذرا باہر جا کر واپس لائیے۔ میں گیٹ کھول کر لاہور کے بازار میں گھومتا پھرتا رہا مگر کچھ بھی نظر نہیں آیا اور علامہ کی خدمت میں عرض کیا۔ وہ بولے کیا کہتے ہو ابھی مولانا رومیؒ یہاں آ کر میرے ساتھ باتیں کرتے تھے اور کبھی کہتے کہ ابھی مرزا غالب یہاں بیٹھ کر میرے ساتھ ہم کلام ہوئے تھے۔

بالآخر عالم انسانیت کو حیات بخش پیغام دینے والے اور اسلام کے اس بطل جلیل اور فرد فرید کی ہم نشینی اور صحبت میں عمر بھر رہنے والے علی بخش کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ وقت آخر بھی یہ علامہ کے کمرے میں موجود رہا۔ علامہ کے شانوں میں درد ہونے لگا تو علامہ نے علی بخش کو شانے دبانے کو کہا۔ پھر اچانک لیٹے لیٹے اپنے پاؤں پھیلا دیئے۔ اوپر کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور بایاں ہاتھ دل پر رکھا اور دائیں ہاتھ سے سر کو تھامتے ہوئے کہا، ''یا اللہ میرے یہاں درد ہے'' اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف ڈھلک گیا اور قبلہ رو ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور پانچ بج کر چودہ منٹ پر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس وقت علی بخش علامہ کے قدموں سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا اور اس طرح ہوشیار پور پنجاب کے رہنے والے ایک مسکین صورت مگر روشن دل رکھنے والے خادم اقبالؔ نے علامہ کی ہم نشینی سے دنیاوی آسودگی کے ساتھ ساتھ آخرت کے لیے بھی اپنا سامان سفر تیار کیا۔

واہ! وہ زمانہ بھی یاد کرنے کے لائق ہے کہ جب علامہ اقبالؔ اپنے زمانہ کے علم و ادب کے گہوارہ یعنی لاہور میں موجود ہوتے تھے۔ ان کی حیات میں کتنے ہی سرکردہ علماء، مفکرین، ادب نواز، شاعر حضرات اس قابل فخر مفکر اعظم کی خدمت میں پہنچ جاتے تھے اور اپنی ملاقات کی پیاس بجھاتے تھے۔ اطراف و اکناف سے آ کر شوقین حضرات بارگاہ اقبالؔ میں حاضری دیتے تھے۔ بہت سے طالب علم بھی اسکول یا کالجوں سے اس عظیم شخصیت کا شہرہ سن کر ان کے دولت کدے پر زیارت کی غرض سے جایا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے اس مرد قلندر کی رہائش گاہ کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رہتے تھے

ہر کہ خواہد گو بیاو ہر کہ خواہد گو بِرو
گیر و دار و حاجب و دربان درین درگاہ نیست

راقم مضمون ہٰذا اپنی جگہ تفکر کے اسی سمندر میں ڈوبا ہوا ہے کہ علی بخش کی کیا قسمت تھی کہ عمر بھر اس مردِ درویش کی صحبت و رفاقت اس کو نصیب ہوئی۔ کیسی پُرنور صحبتیں رہی ہوں گی جب علی بخش نے علامہ کی اشک بار آنکھوں سے تلاوت قرآن کی آواز سنی ہوگی، کیسی رنگین اور دلآویز ساعتیں گذری ہوں گی کہ جب علامہ پر اشعار کا نزول ہوا ہوگا تو حسب الحکم علی بخش قلم اور دوات لے کر ان کے سامنے بیٹھا ہوگا۔ کیسے اوقات گذرے ہوں گے کہ علامہ نے اپنی اولاد جاوید اور منیرہ کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے علی بخش کو ہدایات دی ہوں گی، کیسی پر بہار شامیں رہی ہوں گی۔ ایسی صحبتوں اور محبتوں سے گذر کر یقیناً یہ خادم اقبالؔ ذرہ سے ستارہ بن گیا

وہ لمحہ زندگی بھر کی عبادت سے بھی پیارا ہے
جو اک انسان نے اک انسان کی خدمت میں گزارا ہے

اس طرح اپنی مختصر زندگی میں خادم اقبالؔ علی بخش دوسروں پر سبقت لے گیا اور اس کو بارگاہ اقبالؔ میں پذیرائی ہوئی اور اپنی اس زندگی میں نیکیوں اور سعادتوں کو سمیٹتے سمیٹتے یہ عاشق اقبالؔ بھی بعد وفات اقبالؔ کئی سال کے بعد اس منزل کی طرف چل بسا جہاں سے آج تک کوئی بھی فرد بشر لوٹ کر نہیں آتا۔

اے روحِ علی بخش!

میری دعا ہے کہ خدائے عزوجل آپ کو اپنی رحمتوں سے سے نوازے کہ تجھ کو ایسے یکتائے روزگار کی قدم بوسی نصیب ہوئی کہ جس نے اپنے بارے میں زبان فارسی میں یوں کہا تھا۔

چوں رختِ خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند باما آشنا بود
ولیکن کس نہ دانست کہ ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

یعنی جب میں نے اس دنیا سے رخت سفر باندھا اور منزل آخرت کی طرف چل نکلا تو سبھی حضرات نے یہ کہا کہ ہمیں اس کے ساتھ آشنائی تھی۔ لیکن کوئی بھی یہ نہیں جان سکا کہ اس دنیا میں آنے والے مسافر نے کون سا پیغام دیا اور یہ پیغام کس کو دیا اور یہ کہاں سے یہاں آ گیا تھا۔

اے روح علی بخش!

اللہ تعالیٰ آپ کی قبر کو اپنی مغفرت کا پروانہ عطا کرے کہ تجھے ایسے فرد فرید اور در ثمین کی رفاقت و خدمت میسر آئی کہ جس کی تابناک کرنوں اور علم قرآن کی ضیاء پاشیوں سے سارا عالم جگمگایا۔ اسلام کے اس عظیم فرزند کے تئیں علماء کرام نے مختلف طریقوں سے اپنا خراج عقیدت پیش کیا ہے اور اس کی عظمتوں کو سراہا ہے۔ ان میں سے کچھ علماء جلیل کا مختصر خراج درج کیا جاتا ہے۔

مشرق کو جیسے عظیم انسان کی ضرورت تھی۔ اقبالؔ اسی قالب میں ڈھلے ہوئے انسان تھے۔ جو صرف اسی دور کے لیے نہیں ہر زمانے کی ضرورت تھی۔ کیونکہ ان کی عظمت مادی دنیا یا دنیا سے صرف نظر کرتے ہوئے محض آخرت کی عظمت نہیں تھی وہ دنیا و آخرت کے دو کناروں پر عملی راہنما تھے اور دونوں عالموں کا حسین قوام۔

(استاد عباسی محمود العقاد)

عالم اسلام بلکہ تمام عالم کے سامنے ایک ایسے شخص کا ظہور ہوا جس نے جدید فلسفے کو کچھ اسی انداز میں اپنے شعر میں ڈالا کہ دل اور روح جھوم اٹھے۔ ایسی آواز جس سے بڑے بڑے علماء متاثر ہوئے اور وہ حیرت سے اس مسلمان کی جانب دیکھنے لگے جو ہند میں پیدا ہوا۔ وہیں پرورش پائی اور لوگوں کے سامنے ایسے شعری فلسفے کے ساتھ نمودار ہوا جو کسی بھی طرح فلسفہ ہند سے مماثلت نہیں رکھتا تھا۔

(ڈاکٹر محمد حسین ہیکل)

اگر حسانؓ شاعر رسولؐ ہیں تو اقبالؔ شاعر رسالت ہیں۔ اگر صوفی شعراء نے مجالس ذکر کو فضائل اسلام اور شمائل نبوت سے معطر کیا تو ان میں سے فقہ شریعت اور علم حقیقت میں کوئی بھی اقبالؔ کے مقام کو نہ چھو سکا اور کتاب اللہ میں تدبر اور کلام رسولؐ میں علمی نظر اور قدیم مشرقی اور جدید غرب کے مابین قوتِ تمیز سلامتِ فہم اور صحتِ حُلم میں کوئی بھی اقبالؔ کا ہم پلہ نہیں ہے۔

(استاد احمد الزیات)

اسی طرح برصغیر پاک و ہند کے بلند پایہ مفکرین اور علماء جن میں سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا مودودی، سید سلیمان ندوی وغیرہ شامل ہیں نے بھی اقبالؔ کے تئیں اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ایسے ہی نواب سر ذوالفقار علی خان نے بھی فرمایا ہے:

''اگر تخت طاؤس اہل ایران کے لیے مایہ ناز ہے اور کوہ نور تاج برطانیہ کے لیے وجہ افتخار ہے تو اقبالؔ بھی کسی ملک کے دربار کمال کی زیبائش میں ایسے ہی منصب کے مستحق ہیں''۔

(بحوالہ تعلیقاتِ اقبالؔ)

عالم اسلام کی یہ بلند شخصیت اپنے بارے میں کیا کہتی

ہے یہ بھی قابل غور وفکر ہے۔ پر سنئے تو سہی! تو نے مجھے مفکر اور بلند تصورات کا خواب دیکھنے والا جانا ہے۔ مجھے میرے گھر میں بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھو اور یہ دیکھو کہ میں باری باری ان کا مرکب بنتا ہوں گویا میں لکڑی کا ایک گھوڑا ہوں' ہاں مجھ کو حلقۂ خاندان میں اپنی سفید بالوں والی بوڑھی ماں کے قدموں میں پڑے ہوئے دیکھو جس کے شباب انگیز ہاتھ کا لمس وقت کے دھارے کو پیچھے بہا دیتا ہے اور میرے دماغ میں بسے ہوئے کانٹوں اور ہیگلوں (کانٹ اور ہیگل جیسے بہت سے فلسفیوں) کے باوجود مجھے ایک طفل مکتب ہونے کا احساس بخشتا ہے۔ یہاں تو مجھے بحیثیت انسان پائے گا۔

(بحوالۂ مضمون' آدم خاکی' از بشیر احمد نحوی)

اے روح علی بخش!

رحمت خداوندی آپ کو ردائے رحمت ومغفرت سے ڈھانپ لے اور تیری قبر کو نورانی بنائے کہ تجھے جاوید نامہ جیسی عظیم الشان روحانی اسرار ورموز والی فارسی تصنیف کرنے والے اقبالؔ کا شرف نیاز حاصل رہا کہ اس لاثانی کتاب کی بدولت اس کو افلاک میں اولوالعزم ان رفتہ کے روحوں کی زیارت نصیب ہوئی اور ان سے ملاقات کر کے اس نے عالم انسانیت بالخصوص مسلمانوں کو سربستہ رازوں سے آگاہ کیا اور اس طرح ان کی یہ فارسی تصنیف فارسی ادب کی اہم ترین تصنیف قرار پائی۔

اے روح علی بخش!

کتنے ہی جاہ وحشمت رکھنے والے تیری علامہ اقبالؔ کے ساتھ عمر بھر کی رفاقت اور خدمت گزاری پر ناز کرتے ہوں گے۔ کتنے ہی اہل دانش اور علامہ کے ہم عصر ان کی جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ یہاں ہمارے کشمیر کے اپنے زمانے کے رئیس بارہمولہ کہلانے والے یعنی عبدالصمد ککرو المتخلص بہ مقبل ایک طویل سفر طے کر کے لاہور پہنچ کر علامہ کی زیارت کر کے اور ان کا کلام سن کر مستفید ہوتے تھے۔ تیری شخصیت قابل فخر ہے کہ تو ہشت پہر اس مردِ خود آگاہ و خدا آگاہ کی صحبتوں سے بہرہ ور ہوتا رہا اور آپ کی نشست و برخواست' رفتار و گفتار' غرض ان کی محبوبانہ اداؤں کو دیکھ کر سرفراز ہوتا رہا۔

حدیث نبویؐ میں آیا ہے کہ دنیا میں جو جس کے ساتھ محبت رکھے گا وہ قیامت کے روز بھی اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ ماشاء اللہ کس قدر تیری ذات قابل رشک ہے کہ تجھے ایک ایسے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور رفناء فی القرآن کی طویل مدتی صحبت نصیب ہوئی کہ جس کا رُواں رُواں عشق نبی میں ڈوبا ہوا تھا اور بوقتِ تلاوت قرآن اس کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسوؤں کے قطروں سے تر شدہ قرآن آپ کو اٹھانا پڑتا تھا۔ زہے نصیب اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی قبر میں بھی اپنے نور سے منور کرے اور اپنی رحمتوں کی برسات برسائے۔ آمین۔

اپنے معزز قارئین کی تشنگی کا خیال کر کے یہ بھی لکھ دیتا ہوں کہ شہاب نامہ کے مصنف قدرت اللہ شہاب کی کوششوں سے اس خادم اقبالؔ کو سرزمین لاہور میں ہی ایک قطعہ زمین الاٹ کی گئی تھی اور انتقال ہونے پر اس کو وہیں لاہور میں ہی دفن کیا گیا تھا۔

پونچھ کا دورہ (ص 56 سے آگے)

کے خلاف نہیں تھی اور نہ آئندہ اس کا یہ طرز عمل رہے گا مگر کشمیری یعنی مادری زبان کا تحفظ ہر حال میں ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے۔ اس کانفرنس کا ایک طرۂ امتیاز یہ بھی تھا کہ طویل مدت کے بعد ادبی مرکز کمراز کا جو ترانہ تخلیق کیا گیا تھا اسے مناسب موقعوں پر بجایا جاتا رہا۔ یہ ترانہ وادی کے معروف اور بلند پایہ شاعر وادیب پروفیسر مرغوب بانہالی نے قلمبند کیا ہے اور یہ ترانہ بجائے خود ادبی مرکز کمراز کے شایان شان ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ یادگار ادبی کانفرنس ہمارے قلب وجگر میں مدتوں نیک خیالات اور مثبت امیدوں کا اجالا کرتی رہے گی۔

سہ روزہ ادبی کانفرنس کے سلسلے میں

پونچھ کا دورہ

زبان وادب کے شیدائیوں کا یادگار ملن

جولائی کی یکم تاریخ سے تین تاریخ تک ادبی مرکز کمراز کی ۳۳ویں سالانہ کانفرنس صوبہ جموں کے پونچھ علاقے میں منعقد ہوئی۔ یہ سالانہ کانفرنس کئی لحاظ سے ایک تاریخ ساز کانفرنس تھی۔ سن ۲۰۱۰ء کے بعد کشمیر کی وادی سے باہر یہ ادبی کانفرنس تاریخی مقام پونچھ میں بڑے ہی ولولہ اور جوش و جذبہ کے ساتھ منعقد کی گئی۔ کانفرنس میں کشمیر کے علاوہ صوبہ جموں، ڈوڈہ، بھدرواہ، راجوری وغیرہ سے بھی مندوبین شامل ہوئے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ کانفرنس اپنے پیچھے کچھ انمٹ نقوش چھوڑ گئی جو کشمیری ادب وفکری احیاء نو کی کوششوں میں سنہری حروف سے لکھے جائیں گے۔ ادبی مرکز کمراز کی بنیاد درویش صفت مفکر وادیب پروفیسر محی الدین حاجنی مرحوم نے ڈالی تھی۔ یہ انہی کا خلوص بھرا دل اور نیک تمنائیں تھی کہ اس ادبی تنظیم نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کی ہوئی ہے۔ آج یہ اپنے پورے جوبن اور برگ و بار کے ساتھ آگے کی منزلوں کی طرف رواں دواں ہے، یہاں تک کہ اس نے وادی سے باہر کی خوش نما فضاؤں کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔ آج نیک دل مرحوم حاجنی صاحب کی روح یقیناً اپنے اس لگائے ہوئے پودے کو تناور اور شاداب درخت کی صورت میں دیکھ کر شاداں اور مسرور ہو رہی ہوگی ۔

بہار جواب کے آئی ہوئی ہے
یہ ٹہنی انہی کی لگائی ہوئی ہے

قریباً اڑھائی سو افراد پر مشتمل اس قافلۂ شوق کا مراز ادبی سنگم شوپیاں نے ٹاون ہال شوپیان میں دلی کی گہرائیوں سے استقبال کیا اور مہمان نوازی کے طور پر چائے اور باقرخانیوں سے اس کی خاطر تواضع کی۔ ادبی مرکز کمراز کے کاروان میں شامل مندوبین نے پہلی دفعہ مغل روڑ کا سفر کیا اور اپنی دیدۂ بینا سے اس شاہراہ کا مشاہدہ کیا جو ابھی زیر تعمیر ہے۔ مغل روڑ پر سفر کے دوران اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ پرانے زمانے میں کتنے کارواں اس شاہراہ سے گذرے ہوں گے جن میں سلاطین، راجے مہاراجے، تاجرین، سیاح اور عوام شامل ہوا کرتے تھے۔ سڑک کے دائیں بائیں لہلہاتے اور سرسبز کھیت، باغات اور کیاریاں کیا دعوت نظارہ دے رہی تھیں ان کا الفاظ کے جامے میں بیان نہیں ہوسکتا۔ یہاں کے شجر وحجر دیدہ زیب اور خوب صورت نظر آتے ہیں۔ کئی مقامات دیکھنے والی آنکھوں کو ایسے لبھا گئے گویا وہاں سر سبز سیاہ مائل سبز اور مخملی چادریں جیسے بچھائی گئیں تھیں۔ یہ قدرت کی کاری گری کی زندہ جاوید مثالیں ہیں۔ فلک بوس پہاڑوں کا نظارہ بھی خوب سے خوب تر تھا۔ ریت اور مٹی کے تودے دیکھ کر بھی دل دہل اٹھتا تھا۔ راستے میں چلتے چلتے پیر کی گلی

کا وہ مقام بھی نظر نواز ہوا جہاں حضرت احمد کریم کا مدفن ہے۔ یہ حضرت شاہ ہمدانؒ کی نظر فیض سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ عقیدت مند یہاں حاضری دیتے ہیں اور فاتحہ و درود واذ کار پڑھتے ہیں۔ راجوری اور دیگر ملحقہ جگہوں سے بھی لوگ یہاں شوق دیدار لیے آجاتے ہیں۔ اردگرد کے اونچے اونچے پہاڑ کی چوٹیوں پر برف کی دلفریب تہیں جمی ہوئی رہتی ہیں۔ قدرت کی کاری گری اور صناعی کا گہرا اثر دلوں پر نقش کرتی ہیں۔

مغل روڑ کو طے کرنے کے بعد مرکز کمراز کا کارواں سرنکوٹ پہنچ گیا جہاں ادب نواز و علم دوست حضرات کی طرف سے اس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ مشروبات سے مہمانوں کا استقبال کرنے کے بعد مرکز کے زعماء نے اس ادبی کانفرنس کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔ وہاں سے تازہ دم ہو کر کاروانِ ادب اپنے منزل کی جانب روانہ ہو گیا اور شام کے وقت پونچھ کی پرفضاء اور پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی میں وارد ہو گیا۔ یہاں ڈگری کالج پونچھ میں اس کاروان نے اپنا پڑاؤ ڈالا۔ پہلے سے ہی طے شدہ پروگرام کے مطابق تاریخی کانفرنس کئی نشستوں پر مشتمل تھی۔ تلاوتِ قرآن پاک اور نعت شریف کے بعد ہی مشاعرے کا آغاز ہوا اور پھر مسلسل تین روز تک حسب پروگرام یہ ادبی کانفرنس علاقہ پونچھ کے در و دیوار پر چھائی رہی۔ ناچیز راقم نے بھی محفل مشاعرہ میں اپنا نعتیہ کلام پیش کیا جب کہ دوسرے شعراء نے مختلف نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ کانفرنس میں متقدر شعراء اور ادباء کے علاوہ نمائندگان حکومت جموں وکشمیر بھی شامل رہے ہیں سر فہرست جناب عبدالغنی ملک وزیر برائے اعلیٰ تعلیم، جناب اعجاز خان، ایم ایل اے، جہانگیر صاحب ایم ایل سی قابل ذکر ہیں۔ دوسرے روز وزیر خزانہ جناب رحیم راتھر بھی تشریف فرما ہو گئے اور اپنے زریں خیالات سے کانفرنس کو زینت بخشی۔ انعامات اور اکرامات سے جن ادبی شخصیات اور طلباء کو نوازا گیا ان میں جناب غلام نبی آتش، جناب ڈاکٹر جاوید اقبال اور رخسانہ جبین قابل ذکر ہیں۔ چند خواتین بھی اس تاریخ ساز کانفرنس میں بلا امتیاز مذہب وملت شامل تھیں۔ ان میں پروفیسر نصرت اندرابی، رخسانہ جبین، عتیقہ جی اور سنتوش شاہ نادانؔ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست سے باہر پاکستانی زیر انتظام کشمیر سے شوکت مجید ملک بھی کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ پنڈت فرقہ سے تعلق رکھنے والے جناب رتن تلاشی اور پیارے ہتاش اس قافلے میں شریک وسہیم تھے۔ کانفرنس میں تین مقالے بھی پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ کرشن چندر سے متعلق تھا جو کہ جناب کے ڈی مینی نے تحریر کیا تھا۔ دوسرا مقالہ چراغ حسن حسرتؔ سے متعلق جناب منشور بانہالی کا لکھا ہوا تھا۔ جسے انہوں نے پڑھ کر سنایا۔ کانفرنس کا خصوصی مقالہ تھیم پیپر ''کشیرِ چھِنہ کاہِ گر'' تھا جو کہ فاروق احمد فیاض نے بڑے دل سوزی اور محنت سے تیار کیا تھا۔ یہ مقالہ کانفرنس کا لب لباب تھا۔ اس پر خاصی بحث وتمحیص ہوئی اور سچ یہ ہے کہ یہ کانفرنس ہال میں تمام مندوبین کے اذہان پر چھایا رہا۔ تیسرے روز یعنی ۳ جولائی کو یہ کانفرنس اختتام پذیر ہوئی۔

مبارک بادی کے مستحق ہیں ادبی مرکز کمراز کے تمام اہل قافلہ اور پونچھ کے ادب نواز اور مہمان نواز لوگ جنہوں نے اس کانفرنس میں اپنی قابل قدر کاوشوں سے چار چاند لگائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قسم کی مفید کانفرنسیں آئندہ بھی منعقد کی جائیں اور ریاست سے باہر کشمیریوں، ادیبوں اور شاعروں کو دعوت دی جائے تاکہ ہم اپنی زبان، تہذیب اور ثقافت کی محافظت اور عروج وترقی کے لیے اپنا فریضہ انجام دے سکیں۔

کانفرنس کے دوران یہ تاثر کچھ زیادہ ہی نمایاں تھا کہ تمام زبانیں آپس میں بہنوں کا جیسا رشتہ رکھتی ہیں۔ یہ کانفرنس کسی بھی صورت میں دوسری زبانوں۔۔۔ (باقی ص 54 پر)

علامہ اقبالؔ پر خصوصی ضمیمہ

(مطبوعہ اخبار ''تعمیل ارشاد'' سرینگر مورخہ ۲۸ اپریل ۲۰۱۴ء)

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؔ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔اس نابغہ روزگار شخصیت کی پذیرائی اگرچہ ان کی حیات مستعار میں ہی ہوئی تھی اور ان کی علمی اور فکری گہرائیوں سے ان کے زمانے کے اہل علم و دانش بخوبی واقف ہو گئے تھے مگر یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کی عظمتوں کا راز چاروانگ عالم میں آشکارا ہو گیا۔ان کے انتقال پُرملال کے ساتھ ہی ساتھ ان کی شہرت کا آفتاب خوب سے خوب تر چمکنے لگا۔ان کی حیات، علمی اور ادبی کارناموں پر بہت سی تحقیقات ہوئیں اور اہل دانش و بینش نے سینکڑوں کتابیں لکھیں۔ان کے روزمرہ کے معمولات منظر عام پر آنے لگے، ان کی نشست و برخواست، عادات و اطوار، ان کی تصانیف، ان کی شعر و شاعری اور ان کے فلسفہ حیات کے بہت سارے معاملات زیر بحث آگئے۔اخبارات اور رسائل وغیرہ کے خصوصی نمبرات اور ضمیمے نکالے گئے اور یہ سلسلہ برابر آج تک جاری ہے۔

یوں تو اس مفکر قوم وملت کے تئیں ہر سال ان کی یاد میں تقاریب منعقد کی جاتی ہیں، سمیناروں کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اخبارات کے خصوصی گوشے یا ضمیمے شائع کیے جاتے ہیں اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر یہاں کے ایک موقر روزنامہ ''تعمیل ارشاد'' نے بھی حالیہ مہینے میں ۲۱ اپریل یوم اقبال کی مناسبت سے اپنے اخبار کا ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا ہے۔یہ ضمیمہ گوشۂ ادب کے عنوان سے معنون ہے۔اس گوشۂ ادب میں مختلف عنوانات کے تحت چار صفحات پر مشتمل اقبال اور اقبالیات سے متعلق دلچسپ مضامین شائع ہوئے ہیں جو کہ ہر لحاظ سے علم دوست حضرات اور شائقین اقبالیات کے لیے کسی تحفہ سے کم نہیں ہیں۔اس ضمیمے میں سب سے پہلے معروف اقبال شناس پروفیسر بشیر احمد نحوی کا ایک مختصر مضمون ''گوئٹے اینڈ اقبال'' دونابغاتِ جہان چھپ چکا ہے۔دراصل یہ مختصر مضمون ایک انگریزی کتاب کا اجمالی جائزہ ہے۔

اقبالؔ کو اس مغربی مفکر یعنی گوئٹے نے بہت متاثر کیا ہے اور ان کے تصورات کو اقبالؔ نے اپنی شاعری میں نمایاں کیا ہے۔علامہ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کے فہم و دانش کو مغربی دانشوروں نے جلا بخشی ہے اور باطن کے نور ایمان کو مشرق کے صاحب نظر بزرگوں نے تازہ کیا۔

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظران

دوسرا عنوان اقبالؔ کی نظم نگاری مسجد قرطبہ کے آئینے میں ہے یہ تحریر پروفیسر عارفہ بشریٰ کی ہے اس مضمون کے تحت اقبال کی نظموں میں فکری بلندیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

''اقبالؔ کی فارسی مثنوی اسرار خودی کے تین ترجمے'' یہ دلچسپ مضمون پروفیسر تسکینہ فاضل صاحبہ کا تحریر کردہ ہے اور اقبالیاتی ادب میں ایک اضافی کی حیثیت رکھتا ہے۔پروفیسر موصوفہ نے اپنے اس مضمون میں اسرار خودی کے انگریزی ترجمہ بعنوان (Secrets of the Self) جو کہ رینالڈ اے

نکلسن نے اقبال کی اجازت سے کیا تھا اسی کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ اسرار خودی کا کشمیری زبان میں ترجمہ کولگام کشمیر کے ایک مایہ ناز شاعر جناب ناز کولگامی نے کیا ہے جو کہ بعد میں پاکستان چلے گئے تھے اور وہاں پر ہی اپنے اس منصوبے کو عمل میں لایا تھا۔ اس حوالہ سے بھی پروفیسر موصوفہ نے قارئین اخبار کو اپنی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ تیسرا ترجمہ اسرار خودی کا جناب عبدالرشید فاضلؔ کا ہے اس کا بھی اس معلوماتی مضمون میں تذکرہ ہے اور یہ مضمون بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

اس کے علاوہ اس خصوصی ضمیمہ میں اور بھی بہت سارے عنوانات کے تحت مختلف اہل علم او رصاحبان فکر کے مضامین درج ہیں مثلاً علامہ اقبالؔ کا تصور تعلیم (ڈاکٹر ظہور احمد مخدومی) اقبال کی شاعری پر فارسی شعراء کے اثرات (جمشیدہ جہاں آراء) اقبال کی وطن پرستی (سید عباس جوہرؔ) کلام اقبال حیران و پریشان ہے۔ ابلیس بھی (عمران رشید) اقبال اپنے چند افکار کے آئینے میں (غلام رسول بانڈے) علامہ اقبالؔ کے شعری افکار کے چند پہلو (رخسانہ رحیم صالحاتی) علامہ اقبالؔ ایک نظر میں (ایڈیٹر گوشۂ ادب) عالمی استعماری نظام کے مقابلے میں اقبالؔ کا تصور نظام عدل ایک مطالعہ (ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی)۔

غرض اس طرح ان علمی او راقبالیاتی مضامین سے اخبار تعمیل ارشاد نے علامہ کے حضور میں اپنا اور ان کے عقیدت مندوں کا نذرانہ پیش کرنے کی بہترین کوشش کی ہے اور اس چھوٹے سے گلدستے میں مختلف رنگوں کے مہک دار پھول سجائے ہیں۔ اقبالیاتی ادب میں ایک حسین سعی ہے اور ایک دستاویز کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ علامہ کی شخصیت اور فکر وفن پر جتنا بھی لکھا گیا ہے اور جتنا بھی لکھا جائے گا وہ بے پایاں سمندر کے نزدیک بہت ہی کم ہے بقول شاعر ؎

ورق تمام ہوا اور مدح ابھی باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

تعمیل ارشاد کے ایڈیٹر اور ان کے ادارہ کے ساتھ وابستہ عملہ یہ خصوصی ضمیمہ نکالنے پر قابل ستائش اور مبارکبادی کے مستحق ہیں اور امید ہے کہ وہ آئندہ بھی ایسی کاوشیں جاری رکھیں گے۔

مقبرۂ مرشد حضرت تھانوی کی حاضری پر

مرزا بشیر شاکر

ہو مبارک دیکھنا مجھ کو مزار تھانویؒ
ہے جہاں بیدار روح حضرت اشرف علی
ذرہ ذرہ ہے مقدس اس زمین کی خاک کا
ہے یہاں مہر درخشان علم کے افلاک کا
اہل دل کے واسطے راحت فزا ہے یہ جگہ
دید کے قابل بہت ہی پُر سکون ہے یہ جگہ
ہے یہاں مدفون جو ہستی تجھے معلوم ہے
ان کی عظمت اور بزرگی کیا ہے اور یہ کون ہے
کیا بتاؤں میں کہ ہے کیا ان کی عظمت کا مقام
پیشوا تھے وہ شریعت اور طریقت کے امام
معرفت کی اک دوکان کہلاتی تھی وہ خانقاہ
حضرت اشرف علیؒ تشریف رکھتے تھے جہاں
علم کے موتی بکھر جاتے تھے مجلس میں وہاں
لب کشا، جس بزم میں ہوتے تھے مردِ حق جہاں
قدرو قیمت ہے بہت ہی ان کے ملفوظات کی
ان کے ارشادات کی اور ان کے فرمودات کی
مرقدِ اشرف علی پہ رحمتوں کا ہو نزول
ہو تیرے فضل وکرم سے یہ دعا یارب قبول

ماھنامہ ''حکیم الاُمت'' سری نگر کا تقی عابدی خصوصی شمارہ

جہاں تک میری یاد ماضی کا تعلق ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شہسوار ادب مرحوم و مغفور پروفیسر اکبر حیدری صاحب نے کلچرل اکادمی سرینگر کے کلچرل ہال میں اگست ۲۰۰۶ء میں اپنے ماہنامہ اردو جریدے ''حکیم الامت'' کا اجرا کیا تھا۔ اس موقعے پر وادی کے نامی گرامی ادیبوں اور قلم کاروں کے علاوہ بہت سے شاعروں اور شاعرات کے ساتھ راقم الحروف بھی آں محترم کی دعوت پر حاضر ہوا تھا۔ ۲۰۰۶ء سے آج تک کچھ تیرہ سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے اور رسالہ ''حکیم الامت'' برابر کسی تھکن اور تھکاوٹ کے بغیر اپنے ادبی سفر کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ آج کل کے ناموافق اور ناگفتہ بہ سیاسی اور سماجی حالات میں کوئی رسالہ نکالنا اور پھر اس کا جاری رہنا شاذ ہی نظر آتا ہے۔ وادی کشمیر کو گذشتہ تیس سال سے جو وقتاً فوقتاً نا مساعد سیاسی حالات نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور یہاں کے باشندگان اللہ کے رحم و کرم سے اپنی زندگی گذار رہے ہیں۔ غیر یقینی اور ناقابلِ بیان صورت حال کے ہوتے ہوئے میرا مشاہدہ یہی رہا ہے کہ پروفیسر اکبر حیدری کا اجرا کردہ ''حکیم الامت'' باقاعدگی کے ساتھ منظر عام پر آتا رہا ہے اور اس کے شائقین اس کو ہاتھوں ہاتھ لے کر ہر شمارے کی دادِ تحسین دیتے ہیں۔ جیسا کہ مکتوبات والے کالم سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح اردو زبان کے متوالے اور شائقین ادب اِس کی سرہانا کرتے ہیں۔ اس رسالے نے نہ صرف وادی کے طول و عرض میں اپنے ٹھکانے بنائے ہیں بلکہ وادی سے باہر برصغیر پاک و ہند کے علاوہ بیرون ممالک بھی یہ رسالہ اپنے قارئین تک پہنچتا ہے۔ اردو ادب کے اس گل بداماں جریدے نے اپنے معمول کی اشاعتوں کے علاوہ بہت سارے خصوصی اور یادگاری شمارے بھی نکالے ہیں۔ اپنے کرم فرماؤں اور باذوق قارئین کے دستِ تعاون سے اس رسالے نے بڑی بڑی اونچی اڑانیں بھر کر کچھ دیر پا نقوش چھوڑے ہیں۔ ان خصوصی نمبرات کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے کافی وقت درکار ہوگا اور یہاں میرے اس محدود تاثراتی مضمون میں اس کی گنجائش نظر نہیں آرہی ہے۔ البتہ بطورِ ''مشتے نمونہ از خروارے'' میں اس کے چند ہی یادگاری شماروں کا نام لے کر اکتفا کروں گا۔

۱۔ پروفیسر اکبر حیدری نمبر ۲۔ مقالات اکبر حیدری نمبر ۳۔ زمانہ کانپور نمبر ۴۔ معرکہ اسرار خودی نمبر ۵۔ مقالات سید عباس علی شاہ نمبر ۶۔ خطیب اکبر نمبر ۷۔ شمس الدین نمبر ۸۔ خاتونِ جنت نمبر ۹۔ مولودِ کعبہ نمبر ۱۰۔ ابو طالب نمبر ۱۱۔ خدیجتہ الکبری، ۱۳۔ اُم کلثومؑ ۱۴۔ فضہؑ نمبر ۱۵۔ حضرت عباسؑ نمبر وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں ہر سال محرم نمبر اور سیرت رسول نمبر بھی شائع ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ حکیم الامت کے مشمولات میں اس کے بانی مبانی پروفیسر اکبر حیدری کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا شامل ہونا بھی اس کی خصوصیت ہے۔ یہ مقالات یا مضامین پڑھ

کر ایک حقیقی تشنۂ علم وادب کی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ مرحوم نے اپنی عمر عزیز کے اوقات کا کس طرح عمدہ استعمال کیا ہے اور ایک صحرنورد کی مانند کن صحراؤں اور ریگستانوں کی خاک چھان کر چمکتے ہوئے ہیرے اور علمی جواہرات حاصل کر کے ان کو زیب قلم وقرطاس کیا ہے۔ اکبر حیدری مرحوم ایک معتبر اور مستند محقق سمجھے جاتے ہیں۔ اپنے پختہ اور مضبوط دلائل سے وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ حکیم الامت کے سبھی شماروں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے مضامین ومقالات کو جمع کر کے اگر الگ اسے زیور طبع سے آراستہ کیا جائے تو ریسرچ اسکالروں کے لیے ایک ضخیم اور مفید کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ سچ کہا ہے حافظ شیرازی نے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آمدم برسر مطالب:

اتنی گونا گونیت اور صد ہا رنگ ادبی بہاروں کے بعد اب کی بار رسالہ ''حکیم الامت'' کے سر یہ سہرا بندھتا ہے کہ اس کی دوررس اور متلاشی نظریں افق ادب کے ایسے ستارے پر جاٹھہری ہیں جو کہ بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ یہ تابدار ستارہ تقی عابدی کے نام سے شہرت کی بلندیوں کو چھو چکا ہے۔ اگر چہ اپنے پیشے کے لحاظ سے جناب تقی عابدی ایک معالج ہیں مگر اس کے برعکس انھوں نے اردو زبان وادب کی خدمت سے نام کمایا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر عابدی دہلی میں پیدا ہوئے ہیں مگر اپنی عمر عزیز کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی خوشبو اطراف عالم میں پھیلائی ہے اور قلم کی صورت میں تیشۂ فرہاد کی مانند سنگلاخ پہاڑوں کو کھود کر اردو زبان کی خاطر شیرین اور صاف وشفاف پانی کی ندیاں بہائی ہیں۔

حکیم الامت کا زیر نظر شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء ۳۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ بہت ہی دیدہ زیب اور زیبائش اور خوبصورتی سے آراستہ ہے۔ مجلہ کے سرورق پر تقی عابدی شیروانی پہنے آنکھوں پر عینک لگا کر کچھ پڑھتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ غالباً کسی سیمینار کی تصویر ہے۔ اندرونی صفحات میں کوئی پندرہ صفحات پر اس مجلہ کو ڈاکٹر تقی عابدی کی رنگین تصویروں سے آراستہ کیا گیا ہے جن میں ان کی تصانیف' کتب خانہ اور فیملی کی تصاویر بھی شامل ہیں۔

اس خوب صورت اور معلوماتی شمارے میں اہل قلم کے ۵۳ مضامین اردو زبان میں درج ہیں اور آخری صفحات میں انگریزی میں بھی ۵ مضامین لکھے گئے ہیں۔ بجائے خود ہر مقالہ یا مضمون بہت ہی قیمتی اور گراں مایہ ہے۔ اگر ہر مضمون کا مختصر جائزہ ہی لیا جائے تو بلا خوف تردید یہ دوسرا تقی عابدی شمارہ بن سکتا ہے۔ مجھ جیسے کمزور قلم والے انسان کے لیے تمام مضامین کو پڑھ کر کچھ لکھنا سردست ممکن نہیں ہے۔

تقی شناسی کے لیے اس آب زر سے تولنے کے لائق خصوصی شمارے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ گلستان اردو میں یہ یادگاری مجلہ ایک نورستہ پھول کی مانند لہلہاتا ہے۔ اس شمارے میں الگ سے ڈاکٹر عابدی کے لکھے گئے مقالات بھی شامل اشاعت کیے گئے ہیں جن کی اپنی الگ قدر وقیمت ہے۔ چند ایک کے عنوانات یوں ہیں:

شاعر انقلاب وجمالیات جوش ملیح آبادی' امجد کے نعتیہ کلام کی معجز بیانی' ڈاکٹر نارنگ کی شاہکار کتاب کی نئی دریافت' حالی کی قلبی واردات' سرسید کا مرثیہ' کس کس نے حالی کی مخالفت کی' میر انیس کے سلاموں میں اخلاقی قدریں' مرزا جعفر علی خاں اثر کا پہلا مرثیہ ''شہید اعظم''' منتخب تردینوں کا اجمالی جائزہ' سرسید کی واحد فارسی نعت' مرحوم ڈاکٹر شان الحق' قاآنی شیرازی کا شاہکار مرثیہ' طیب روحانی علامہ رشید ترابی'

علامہ اقبال کا تصور عشق و مستی' اردو رسم الخط۔

اس کے علاوہ اس خصوصی شمارے میں منظومات تقی عابدی کی فہرست بھی الگ ہے۔ یہ مجلہ پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جناب تقی عابدی نے ۶۰ سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ کسی بھی ادبی میدان میں آنجناب مرد میدان نظر آتے ہیں۔ یہ غالبیات کا معاملہ ہو یا اقبالیات کا' انیسیات کی بات ہو یا دبیریات کی' فیض شناسی ہو یا امجد فہمی یا پھر حالی کی سخن شناسی ہو۔ ہر ایک موضوع پر ڈاکٹر عابدی نے اپنی استادانہ مہارت دکھا کر اردو زبان و ادب کو سرخرو کیا ہے اور ایسی خدمات سے وہ آسمانِ ادب پر مہر منیر کی طرح روشن اور تاباں نظر آتے ہیں۔

یہ عروسِ اردو کی اپنی خوش بختی ہے کہ اپنے دشمنوں کے نرغے میں رہنے کے باوجود بھی اس کو بہت سارے دوست اور ہمدرد بھی میسر رہتے ہیں جو کہ اس کو حوصلہ شکن اور مایوس کن حالات کے اندر بھی سہارا دیتے ہیں اور اس کو زندگی کا آب حیات پلانے کی سعی میں مصروف رہتے ہیں۔ اگرچہ ڈاکٹر تقی عابدی طبابت کے پیشے سے منسلک ہیں مگر اس کے باوجود وہ اردو زبان کے پیچیدہ زلفوں کو نکھارنے' سنوارنے اور سجانے میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ اس سخت جان ریختہ کہلانے والی زبان کے بارے میں موصوف کے چند روشن خیالات پیش کیے جاتے ہیں:

''اردو کی نئی بستیوں میں اردو کا فروغ جاری ہے۔ اب اردو صرف اردوئے معلیٰ تک محدود نہیں بلکہ اردو مجلہ میں رونق بازار ہے۔ اب اردو کا پرچم اردوئے معلیٰ نہیں بلکہ اردوئے محلہ پر لہرا رہا ہے۔ دبستانِ دہلی' لکھنؤ' آگرہ' حیدرآباد' پنجاب وغیرہ میں اردو کی نشوونما کے لیے جدید لسانی تجربات کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی دبستان کو دوسرے دبستان پر اس دور میں فوقیت حاصل نہیں اور اردو ادب عالمی شہرت کا حامل ہے''۔

ایک نبض شناس معالج ہونے کے باوجود سید تقی عابدی کے قلم سے ۶۰ سے زیادہ کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آ گئی ہیں۔ ایسا ہونا کچھ عجوبہ یا کرشمۂ خداوندی ہی لگتا ہے۔ چند کتابوں کے نام یوں ہیں۔ شہید' جوشِ مودّت' اقبال کے عرفانی زاویے' رموز شاعری' مرزا دبیر' تجزیۂ یادگار انیس' عروس سخن' روپ کنور کماری' دربار رسالت' غالب دیوان نعت و منقبت' چوں مرگ آید' کلیاتِ غالب' فیض شناسی' امجد فہمی وغیرہ۔ اردو کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا سپہ سالار فارسی زبان پر بھی یکساں دسترس رکھتا ہے اور علمی و ادبی گتھیوں کے سلجھانے میں ہمہ وقت محو رہتا ہے۔ بقول اقبال

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش کہ جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

راقم السطور کی رائے میں آج اردو ادب کے سرپرستوں وفات یافتہ داغ' سودا' غالب' اقبال' میر انیس' مرزا دبیر کے علاوہ حالی اور فیض کی روحیں جنت الفردوس میں شاداں اور جھومتی ہوں گی کہ زمانہ کی دست درازیوں اور اردو دشمنی کی ریشہ دوانیوں کے باوجود بھی کوئی شخص تقی عابدی کی صورت میں ان کے لگائے ہوئے اور مہکائے ہوئے گلستانِ اردو کی آبیاری تن' من' دھن سے کر رہا ہے اور اس کی نئی نئی بستیاں قائم کرنے کے لیے شب و روز محنت کر کے اپنی نیند بھی حرام کرتا ہے۔ جب تک تقی عابدی جیسے عالم و فاضل کا وجود رہے گا تو اردو کے زوال کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے مگر شرط ہے کہ ان کے چاہنے والے اور اردو کے شائقین بھی اپنا فرض نبھائیں اور خالی خولی تقی عابدی کے شانوں پر سارا بوجھ نہ ڈالیں بلکہ ان کے ساتھ بھرپور تعاون کریں۔

مدیر محترم فرزندِ ارجمند جناب پروفیسر اکبر حیدری مرحوم یعنی ڈاکٹر محمد ظفر حیدری۔۔۔۔ (باقی ص 27 پر)

پوسٹ کارڈ...

اپنی پہچان پہ آج بھی نازاں

زمانہ کبھی ساکت وصامت نہیں رہتا۔اس کا پہیہ پیہم گھومتا رہتا ہے۔نئی منزلوں اور نئی دِشاؤں کی تلاش میں اور یہ مسلسل اور انتھک سفر تاریخ کی شاہراہ پر کیا کیا اپنے پیچھے نہیں چھوڑتا۔اگلے زمانوں میں انسان نے بیل گاڑی سے رسل ورسائل کا کام لیا اور کبوتروں سے قاصد کا کام لے کر نام و پیام کا سلسلہ جاری رکھا۔اس مخصوص ظرف زماں ومکاں کی قید میں یہ دونوں چیزیں انسانی تہذیب وتمدن کی جز ولائنفک ہی نہیں بلکہ معراج کمال تھیں، مگر انسان کا مضطرب ذہن اس کی اُمنگیں زندگی کے بدلتے تقاضے تمناؤں کی اڑان وغیرہ اسے کہاں اسی من وسلویٰ پر گذارہ پر اکتفا کرنے دیتا؟ ابن آدم نے وقت کی تسخیر، برق رفتاری کی کھوج اور آسائشوں کے اہتمام شوق میں جدت طرازیوں کی صحرا نوردی کا سلسلہ رواں دواں رکھا۔پوسٹ کارڈ اسی کھوج کرید کی ایک دل فریب علامت ہے جس کے اندر زمانے کی نیرنگیاں اور تاریخ انسانی کی دلچسپ سرگزشت پیوستہ ہے۔پوسٹ کارڈ نے سدھائے ہوئے کبوتروں کو نامہ و پیام کے جھنجھٹ سے فارغ کیا اور ابلاغی کاوشوں کو ایک نئی طرح دی مگر انقلابات زمانہ کے باوجود اسے کوئی فارغ نہ کرسکا۔اس ایک چھوٹی سی چیز نے حضرت انسان کا ہاتھ تھام کر گویا اسے سیر افلاک کا گرویدہ بنایا کہ آج جب مواصلاتی دنیا میں انٹرنیٹ، موبائل اور دیگر محیر العقول ایجادات کا سلسلہ جاری ہے۔

پوسٹ کارڈ ابھی بھی بڑے ناز ونعم سے اپنے سفر کے پڑاؤ طے کرنے میں لگا ہوا ہے۔

باب قبول تک نہیں پہنچی ہماری آہ
پھر پھر کے گر رہی ہے ابھی آسمان کی سیر

گذرے ہوئے زمانے میں پوسٹ کارڈ (Post Card) عنوان سے ایک کہانی بھی لکھی گئی تھی جو کہ اردو ادب کا ایک دلچسپ حصہ بن گئی۔عموماً پوسٹ کارڈ کا سائز "3"x5 ہوتا ہے۔اس کا اپنا ایک تاریخی پس منظر ہے۔اس میں شک وشبہ نہیں کہ پوسٹ کارڈ نے دہائیوں تک سماج میں میل ملاپ کو بڑھانے اور معاشرتی رشتوں کو استوار کرنے میں اپنا ایک اہم ترین رول نبھایا ہے۔اپنے چھوٹے سائز کے باوجود اس نے دنیا کی دوریوں، مسافتوں اور وسعتوں کو حیران کن انداز میں سمیٹ لیا۔سچ یہ ہے جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی کے وجود میں آنے سے قبل اس چھوٹے سے پوسٹ کارڈ پر انسانی دنیا کا بہت کچھ انحصار ہوا کرتا تھا۔پیار محبت کرنے والوں کے درمیان اس معمولی کارڈ سے مرجھائے ہوئے دل کی کلیاں کھل اٹھتی تھیں اور یہ کارڈ دو پریمیوں کے غائبانہ طور پر میل موانست کا ذریعہ ہوا کرتا تھا۔کئی بار یہی پوسٹ کارڈ ڈاکیہ یا شاعری زبان میں نامہ بردار مقاصد کے ہاتھوں ان کے لیے نوید جانفزا بن کر مسرتوں کا پیغام لاتا تھا۔کاروباری لوگوں کے درمیان پوسٹ کارڈ کے گشت

سے ہی ان کی باہمی تجارت اور لین دین کو فروغ ملتا تھا۔ ہزاروں کیا لاکھوں روپیہ کی تجارت اس دس پندرہ پیسہ والے پوسٹ کارڈ کے توسط سے چٹکیوں میں سرانجام پاتی۔ کسی کے تولد ہونے کی خوش خبری یا مرنے کی غم ناک خبر بھی بس اسی کارڈ کی وساطت سے مل کر رنج وغم یا خوشی وانبساط کی لہریں پھوٹ جاتی تھیں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ پوسٹ کارڈ نے ایک مختصر سفر طویل عرصے میں طے کر کے افسانوں کو جنم دیا۔ زمانے کی نیرنگیاں دیکھ کر پوسٹ کارڈ نے بھی بساط بھر انگڑائیاں لے کر اس رنگین دنیا میں اپنے وجود کو نئے تقاضوں سے ہم کنار کیا اور نام و پیام کی دنیا میں نئے نئے اسالیب میں عالمی سطح پر اپنا سفر پورے عزم وارادے کے ساتھ جاری رکھا۔ ان میں سے چند ایک نام یوں ہیں۔ پرنٹیڈ پوسٹ کارڈ‘ پکچر پوسٹ کارڈ‘ میگا دوت پوسٹ کارڈ۔

یورپین ممالک سے آکر سیاح لوگ زیادہ تر پکچر پوسٹ کارڈ کا استعمال کرتے ہیں اور ہزاروں میل دوری کی مسافت سے اپنے گھر والوں اور احباب کو اپنی خیریت اور حالات وواقعات کی اطلاع دیتے ہیں۔ قدرت کے حسین اور رنگین نظاروں سے لطف اندوز ہوکر وہ پکچر پوسٹ کارڈ کے ذریعہ اپنے جذبات کو اظہار کا سلیقہ عطا کرتے ہیں۔ محکمہ ڈاک کی طرف سے میگا دوت پوسٹ کارڈ متعارف ہوکر عام لوگوں اور غریب طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے راحت رسانی کا سامان بہم پہنچایا گیا۔ اس کارڈ کی قیمت موجودہ شرح کے لحاظ سے بہت ہی رعایتی ہے یعنی صرف پچیس پیسے۔ اس کا استعمال کر کے صحافت سے وابستہ لوگ اور تاجرین بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

پرنٹیڈ کارڈ کو استعمال میں لاکر کاروباری حضرات بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگرچہ موجودہ دور میں زیادہ تر ای میل، انٹرنیٹ اور موبائیل فون کا استعمال کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی چھوٹے سائز یعنی "5 x "3 کا پوسٹ کارڈ اپنی اہمیت کا لوہا منواتا جارہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جدید دنیا اس قدیم مگر مفید شئ سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ڈاک خانہ جات میں پوسٹ کارڈ کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ اس میں مختصر عبارت ہی لکھنے کی گنجائش ہوتی ہے مگر اس اختصار میں بھی ایک وسیع کائنات چھپی رہتی ہے۔ پسماندہ اور دور دراز علاقہ جات میں یہ کارڈ آج بھی نصف الملاقات کا رول بخوبی ادا کر رہا ہے۔

کئی سال قبل آل انڈیا ریڈیو کے خبروں کے بلیٹن میں یہ حیران کن خبر نشر کی گئی کہ نومبر ۲۰۱۲ء میں ستر سال قبل ڈاک میں بھیجا گیا ایک پوسٹ کارڈ نیویارک میں اپنی منزل مقصود کو پہنچ گیا ہے۔ ۴ جولائی ۱۹۴۳ء کو راک فورڈ سے بھیجا گیا یہ پوسٹ کارڈ طویل عرصہ کے بعد دو بہنوں کو پہنچ گیا۔ جنگ عظیم دوم کے دوران یہ کارڈ راک فورڈ سے باپ کی طرف سے روانہ کیا گیا تھا اور ۷۰ برس کی طویل مدت کے بعد یہ دو بہنوں کو نیویارک میں پہنچ گیا تھا۔

اس عرصہ دراز کے دوران یہ محو سفر رہنے والا پوسٹ کارڈ کہاں تھا یہ ایک معمہ ہے۔ اس عجیب وغریب خبر نے اپنے سامعین کو حیرت میں ڈال دیا ہوگا۔ جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی عروج کے اس دور میں بھی ایک پوسٹ کارڈ نے یہ کمال دکھایا کہ دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ یہ خبر راقم السطور کو بھی ماضی کے دھندلکوں میں لے گئی۔ چالیس سال سے زیادہ سرینگر میں محکمہ ڈاک میں کام کرنے کی بناء پر ڈاک کی رسید گی، روانگی اور تقسیم کاری کا سارا منظر دفعتاً میری نظروں میں سمایا گیا۔ وقت پر ڈاک کی رسید وروانگی اور ڈاکیہ کے ذریعہ اس کی بروقت اور ٹھیک تقسیم کی عمل آوری ایک ایک چٹھی، ایکنالجمینٹ (Acknowledgement) ‘لفافوں‘ خطوط اور بیرنگ خطوط وغیرہ کی تقسیم کاری‘ میری رائے میں اب یہ خواب وخیال کی باتیں ہیں۔ زمانہ کی تیز رفتار ترقی نے یہ ساری چیزیں سرپٹ

گھوڑے کی طرح اپنے پیچھے چھوڑ دیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ ڈاک خانوں میں دیگر امور کے علاوہ ڈاک کی باضابطہ جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ ہر ایک چٹھی اور خط پر ڈیلوری مہر ثبت کی جاتی تھی۔ بغیر تاریخ رسیدگی مہر ڈاک ہرگز بھی تقسیم نہیں کی جاتی تھی۔ شاذ و نادر ہی کوئی خط وغیرہ کسی معقول وجہ کے بغیر ڈاک خانوں میں پڑا رہتا تھا۔ ڈاکیہ حضرات وردی پوش ہوا کرتے تھے اور لوگوں کی نظروں میں ان کا وقار بلند ہوتا تھا مگر زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ سب کچھ بدل کے رہ گیا۔ اگرچہ آج کے ترقی یافتہ دور میں ڈاک خانہ جات کے نظام کو جدید خطوط پر استوار کیا گیا ہے اور بیشتر ڈاک خانوں میں یہاں کمپیوٹرائز ڈسسٹم چالو کیا گیا ہے پھر بھی اس سارے اہتمام شوق کے باوجود عام قسم کی ڈاک، اخبارات، رسالے ٹھیک ڈھنگ سے متعلقین میں تقسیم نہیں ہو پاتے۔ راقم کو ذاتی طور پر اس کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ اس کی اپنی وجوہات ہیں، افسران بالا ان وجوہات سے بخوبی واقف ہوں گے۔ میری دانست میں ان میں سے چند ایک وجوہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ نئی نئی بستیوں کا پھیلاؤ تا حد نظر۔

۲۔ بلند و بالا عمارتوں، سرکاری دفاتر اور نئے نئے کمپلیکس کی تعمیر جہاں وقت کی کمی اور کام کے دباؤ کی وجہ سے ڈاک تقسیم کرنے والا عملہ باقاعدگی کے ساتھ پہنچ ہی نہیں پاتا ہے۔

۳۔ اکثر خطوط وغیرہ پر ناکافی پتہ کا اندراج۔

۴۔ ڈاک تقسیم کرنے والے عملہ کی کم یابی بھی ایک اہم وجہ ہے جس علاقے میں ایک سے زیادہ ہرکاروں کی ضرورت ہے وہاں بس واحد شخص سے کام کروانا بھی محکمہ ڈاک کی ذمہ داریوں پر تساہل و تغافل کا ٹھپہ ثبت کرتا ہے۔

۵۔ انسپکٹر صاحبان کی طرف سے ڈاک کی ٹھیک تقسیم اور بروقت تقسیم کاری کی طرف عدم توجہی اور اس کی خاص وجہ دو یا تین انسپکٹر صاحبان کی جگہ فقط ایک ہی کی تعیناتی۔

۶۔ کچھ تو سٹاف کی عدم توجہی، احساس ذمہ داری کے فقدان، تاخیر سے دفتروں میں حاضری اور وقت مقررہ سے قبل ہی گھر واپسی۔

ضرورت ہے کہ ان کوتاہیوں کی طرف خاطر خواہ توجہ دی جائے اور ڈاک نظام کو درست کیا جائے تاکہ پوسٹ کارڈ بیچارہ اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کر سکے اور اپنا سفر نظام الاوقات کے دائرہ کے اندر پورے آب و تاب کے ساتھ جاری رکھ سکے اور یہ بچارہ خواہ مخواہ لوگوں کے طعن و تشنیع کا شکار نہ بنے ؎

جب ولولہ صادق ہوتا ہے جب عزم مصمم ہوتا ہے
تکمیل کا سامان غیب سے خود اس وقت فراہم ہوتا ہے

پروفیسر غلام نبی فراقؔ (ص 67 سے آگے)

اور ترجمہ کاری کا یہ درخشندہ ستارہ کئی سال تک علیل رہ کر صاحب فراش رہا۔ میں اکثر و بیشتر ان کی عیادت کے لیے جایا کرتا تھا۔ چائے سے ہر وقت میری تواضع کی جاتی تھی۔ ۱۷ دسمبر ۲۰۱۶ء کو وادی مینو نظیر کا یہ بلند قامت شاعر موت کے پنجوں میں بے بس ہو کر اپنے اہل و عیال کے علاوہ اپنے سبھی چاہنے والوں کو داغ مفارقت دے کر اس منزل کی طرف رواں ہوا جہاں سے آج تک کوئی بھی واپس نہیں آیا ہے۔ مرحوم کو پورے احترام کے ساتھ ملک صاحب صورہ کی زیارت گاہ کے قریب دفن کیا گیا ہے اور وہ منوں مٹی کے نیچے تا صبحِ قیامت آسودہ ہیں ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیے کیا

فراقؔ صاحب نے بوقتِ ملاقات میری شاعری کے بارے میں کبھی کبھی اپنے تاثرات مختصراً قلم بند کیے تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

پروفیسر غلام نبی فراقؔ کے ساتھ میرے مراسم

پروفیسر غلام نبی فراقؔ مرحوم کو ابتدائی طور پر میں نے سری پرتاپ کالج سرینگر میں دیکھا تھا جب کہ ۱۹۶۷ء میں، میں نے وہاں پر طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا تھا۔ وہ زمانہ بھی یاد کرنے کے لائق ہے کہ کیسے شفیق اساتذہ ہوا کرتے تھے۔ طلباء کی تئیں کس قدر ان کے دل میں ہمدردی ہوتی تھی۔ اُن دنوں کالج کے پرنسپل جناب سیف الدین ہوا کرتے تھے اور جناب نذیر احمد خان ڈپٹی پرنسپل تھے۔ وادی کے معروف دانشور پروفیسر محی الدین حاجنیؔ، پروفیسر شیخ محمد اقبال، جناب ستار شاہد، عبدالعزیز وغیرہ قابل اساتذہ ایس پی کالج میں پڑھاتے تھے۔ ادھر طالب علموں کے دل میں بھی اساتذہ کے لیے بے حد احترام ہوا کرتا تھا۔

وقت اور زمانے کا پہیہ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے اور حالات یکسر بدلتے رہتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ پروفیسر غلام نبی فراقؔ صاحب جو کہ ابتدائی طور پر بہوری کدل سرینگر میں سکونت کرتا تھا وہاں سے منتقل ہو کر ہمارے ہی علاقہ میں منتقل ہو کر سکونت پذیر ہو گیا۔ اسی دوران میری ملازمت کی تعیناتی ڈاک خانہ نوشہرہ میں ہی ہوئی اور میں بحیثیت سب پوسٹ ماسٹر یہاں کام کرنے لگا۔ چونکہ یہ وہ زمانہ تھا (اسی کی دہائی) جب کہ بہت کچھ ڈاک خدمات پر منحصر ہوتا تھا۔ چٹھیاں، خطوط، لفافے، اخبارات، کتابیں رسائل وغیرہ سب کچھ بذریعہ ڈاک آتا تھا اور بھیجا بھی جاتا تھا۔ اسی سلسلے میں پروفیسر فراقؔ کا رابطہ بھی ڈاک خانہ نوشہرہ کے ساتھ بڑھ گیا اور ضرورتوں کے پیش نظر فراقؔ صاحب کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی چلتا رہا اور فراقؔ کے ساتھ میرے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے۔

ہم دونوں یعنی فراقؔ صاحب اور میں ایک ہی محلے کے باشندے تھے اور قریبی فاصلے پر رہتے تھے۔ بچپن کے دنوں سے ہی میرے دل میں پڑھنے کا شوق تھا۔ اکثر و بیشتر شعرائے کرام کے کلام سے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ سکول کے ایام میں کچھ باذوق اساتذہ کی رہنمائی میسر ہوئی تھی اور انہوں نے میرے اس ذوق کو مہمیز کیا تھا۔ چونکہ دل میں ایک چنگاری سی تھی۔ شاعروں کا کلام اکثر کاپیوں اور کاغذ کے پرچوں پر بھی لکھ کر موجود رکھتا تھا۔

اسی خدا داد ذوق و شوق کے ہوتے ہوئے جناب پروفیسر فراقؔ صاحب کے دولت خانہ پر میرا آنا جانا ہوا۔ میں کچھ شرم و حیا بھی محسوس کرتا تھا اور فراقؔ صاحب کو سنجیدہ موڑ میں پاتا تھا اور زیادہ لب کشائی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ دن گذرتے گئے اور ہمارے درمیان ایک دوستانہ ماحول پیدا ہوا۔ میں بھی اب فراقؔ صاحب کے ساتھ بے تکلف سا ہو گیا اور علمی و ادبی معاملات کے بارے میں گفت و شنید ہونے لگی۔ کبھی کبھی یہ ملاقاتیں طویل ہوتی تھیں اور کبھی مختصر اسی دوران ہمارے ہی محلے کے ایک دوست جناب شیخ محمد حسین مرحوم بھی ہماری محفلوں میں شریک ہونے لگے۔ مرحوم خود بھی شریف النفس اور علم دوست تھے۔ علم و ادب پر ان کی بھی خاص نظر تھی۔ اب ہم تینوں اکٹھے بیٹھ کر محفل سجاتے تھے۔ دورانِ گفتگو بہت سارے معاملات علمی، ادبی، سماجی اور مذہبی زیر بحث آتے تھے۔ حالانکہ دونوں صاحبان عمر میں مجھ سے بہت سینئر تھے۔

کچھ وہ سناتے تھے اور کچھ میں اپنی طرف سے گوش گذار کرتا تھا۔اب میرا حوصلہ بھی بڑھ گیا تھا اور اب میں فراق صاحب کی سنجیدہ طبیعت یا بارعب شخصیت سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتا تھا اب کے میں کچھ اپنائیت سے اور بے تکلفی کے ساتھ اُن کے ساتھ گھل مل گیا۔اب میں اپنی شاعرانہ تخلیقات غزل یا نظم محمد حسین مرحوم کی موجودگی میں یا اکیلے فراق صاحب کو سنایا کرتا تھا اور فراق صاحب ہوں ہاں کہے بغیر میرے اشعار سنا کرتا تھا۔کبھی کبھی شعری تخلیقات کا پرچہ اپنے پاس رکھتا تھا اور کسی دوسرے روز اس کی درستی فرما کر مجھے واپس کرتا تھا اور کچھ زبانی مشورے بھی دیتا تھا۔

دوران ملاقات ایک روز راقم الحروف نے اپنی ایک کشمیری نظم ''نچہ ہند ناو'' اُن کو سنائی۔نظم سن کر مرحوم فراق صاحب نے اس کی بہت داد دی اور اس کو پسند کیا بلکہ یہاں تک بھی کہہ دیا کہ میں نے انگریزی ادب اور اردو ادب بھی پڑھا ہے مگر اس قسم کی نازک اور حسین جذبات پر مشتمل نظم میری نظروں سے نہیں گذری ہے۔اُن سنہری دنوں کی ملاقاتوں کو یاد کر کے میرا دل آج تڑپ جاتا ہے ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب

پروفیسر فراق دوران گفتگو کچھ اپنی سرگذشت بھی سناتے تھے ۔اپنے اشعار یا نظم سنا کر مجھے مستفید کرتے تھے ۔پرانی اور جدید شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔کبھی اپنے ساتھی پروفیسر حضرات کی باتیں سناتے تھے۔ ایک دفعہ یہ بھی کہا کہ اپنے زمانے کے یونیورسٹی پروفیسر اور شعبۂ انگریزی کے سربراہ مرحوم محمد سلطان وانٹ نے رحمن راہی اور مجھ سے کہا تھا کہ آپ نے اپنی زندگی خراب کی ہے۔آپ کو امریکہ جانا چاہیے تھا اور وہاں ہی پڑھانا چاہیے تھا۔

جناب فراق صاحب کو انگریزی ادب پر زیادہ دسترس تھی۔اکثر انگریزی شعراء کو آپ نے پڑھا تھا اور ان کی بیشتر نظموں کا اپنی مادری زبان میں ترجمہ کیا ہے۔یہ ترجمے ان کی کتاب ''رنگ نظرن ہند'' میں چھپ چکے ہیں اور یہ کتاب منظرِ عام پر آ گئی ہے۔

میری زندگی میں ایک ایسا موقعہ بھی آ گیا کہ وادی کے ایک اور قلم کار اور شاعر مرحوم عبدالرحمن آزادؔ کے ساتھ ایک قلمی تنازعہ کھڑا ہو گیا۔خط وکتابت کی صورت میں لمبے لمبے خطوط کا تبادلہ ہوا۔اس میں مذہبی باتیں زیر بحث آ گئیں اور کچھ سیاسی معاملات بھی ورطۂ تحریر میں آ گئے۔سمجھ لیجئے کہ ایک قلمی جنگ چھڑ گئی۔نہ ہی مرحوم آزادؔ میرے دلائل سے متفق ہو گئے اور نا ہی یہ راقم ان کی باتوں سے متفق ہو سکا۔خط وکتابت کا یہ سلسلہ طویل عرصہ تک چلتا رہا اور یہ کشمیری زبان میں ہی ہوتا رہا۔یہ سارے خطوط اور جوابی خطوط آج بھی میرے پاس بحفاظت موجود ہیں۔اس دوران محفلیں سجتی رہیں۔فراق صاحب، شیخ محمد حسین (اب دونوں مرحوم ہو چکے ہیں) اور میں ناچیز اپنے خطوط اور ان کے موصولہ جوابات اکٹھے بیٹھ کر پڑھ کر اُن دونوں کو سناتا تھا اور وہ میرے دلائل کے ساتھ اتفاق کرتے تھے۔مجھے آج بھی طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود یاد آ رہا ہے کہ کس طرح پروفیسر فراقؔ بلند قامت ادیب اور کشمیری شاعر ہو کر بھی میری کشمیری نگارشات اور تحریروں سے متاثر ہوتے تھے اور اپنے باغیچے میں کرسیاں لگوا کر بیٹھتے تھے اور اپنا دایاں ہاتھ اپنے منہ کے دائیں رخسار پر رکھتے تھے۔پھر وقت آ پہنچا کہ عبدالرحمن آزادؔ بیمار ہو کر اپنی ابدی زندگی کو سدھار گئے۔میں نے اپنی طرف سے خط وکتابت کا یہ سلسلہ بند کیا تھا۔میں آج مرحوم آزادؔ کے حق میں اللہ سے دعا گو ہوں کہ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

بحیثیتِ ہمسایہ کے پروفیسر فراق ایک فرض شناس شخص تھے۔ہمسایوں اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے تھے۔جب بھی کوئی ہمسایہ مرجاتا تو وہ اس کے جنازہ میں شرکت

کرتے تھے۔کسی کی تعزیہ پرسی کے لیے اس کے گھر جاتے تھے۔مجھے بہت ہی عزیز رکھتے تھے۔ایک دفعہ مرحوم نے کلمہ شریف پڑھ کر قسم کھائی اور مجھ سے یہ فرمایا تھا ’’کہ مجھے آپ کے ساتھ دلی محبت ہے‘‘۔اللہ تعالیٰ اس کے عوض ان کو اجرِ عظیم عطا کرے۔ایک دفعہ بذات خود قربانی کا گوشت لے کر اپنے خادم کے ہمراہ میرے بھائیوں کے گھر اور میرے گھر آگئے۔میں یہ بھی لکھتا جاؤں کہ ہمسائیگی اور باہمی تعلقات کی ذمہ داری کو سمجھ کر بہت ہی حساس تھے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں ایک محلہ کی دوری پر اپنے نئے تعمیر شدہ مکان میں منتقل ہو گیا تو موصوف بہ نفسِ نفیس مبارک بادی کے لیے بڑے سائز کا بادام سے بھرا لفافہ لے کر میرے پاس آگئے اور یہ مجھے نذرانہ کے طور پر پیش کیا۔

یہ غالباً ۲۰۱۵ء کا سال تھا کہ ہماری تنظیم یعنی انجمن فروغِ علم و ادب سرینگر جس کا یہ راقم السطور صدر ہے نے مرحوم فراقؔ صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے پیش نظر اُن کے اعزاز میں اُن ہی کے دولت خانہ واقع لکھری پورہ نوشہرہ میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔اس تقریب سعید میں وادی کے کئی نامور ادیب اور قلم کار موجود تھے جن میں قابل ذکر معروف براڈ کاسٹر عبدالاحد فرہادؔ، ناظر کولگامی، شہباز ہاکباری، غلام محمد تبت بقال پرنسپل اسلامیہ کالج سرینگر وغیرہ شامل تھے۔اس کے علاوہ علاقہ نوشہرہ کے جانے پہچانے حضرات بھی مدعو تھے۔اس موقعہ پر پروفیسر فراقؔ کی شاعرانہ زندگی اور دیگر علمی و ادبی سرگرمیوں کے حوالہ سے بات کی گئی اور مرحوم کی خدمات کو سراہا گیا۔

جب جب بھی کوئی تنظیم یا ادارہ مثلاً ریڈیو کشمیر، جموں و کشمیر کلچرل اکادمی یا دوردرشن سرینگر فراقؔ صاحب کی زندگی میں ان کے اعزاز میں کسی قسم کا پروگرام منعقد کرتے تھے تو صاحب موصوف کے فرزند جناب ناصر منصور ہر وقت اس ذرہ ہیچ میدان کو بھی بُلا کر استفادہ کرنے کا موقعہ بخشتے تھے۔ایسی یادگاری محفلوں میں فراقؔ مرحوم کی عالمانہ و فاضلانہ زندگی کے بہت سارے کارنامے زیر بحث آتے تھے۔ایسے پر رونق موقعوں پر کشمیری موسیقی کی ہلکی پھلکی محفلیں بھی سجتی تھیں اور حاضرین محظوظ ہوتے تھے۔

اپنی زندگی میں اس نامور اور بلند پایہ ادیب کو اپنی اہلیہ کی وفات سے بھی ایک صدمۂ جانکاہ سے گذرنا پڑا اور بہت سال قبل اُن کی شریک حیات اُن کو داغِ جدائی دے کر غم کے ایک اتھاہ سمندر میں ڈال کر دنیا سے رخصت ہوئی۔مگر اس صدمہ کے باوجود بھی اس بلند ہمت انسان نے ہمت کا دامن نہیں چھوڑا اور اپنی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھاتا رہا۔اپنی باقی ماندہ صاحب زادیوں کی شادیوں کا پورا بندوبست کیا اور دیگر لوازمات سے نبرد آزما ہوا۔

میں نے وقتاً فوقتاً اس قلم کار کو اپنے مکان کے ملحقہ باغ میں باغبانی بھی کرتے دیکھا ہے اور پھولوں کے ساتھ اس کی دل بستگی بھی دیکھی ہے۔دنیاوی کاروبار کی گہما گہمی میں بھی دلچسپی لیتے ہوئے دیکھا ہے۔اپنی رفیقہ حیات کی جدائی پر پروفیسر فراقؔ نے ایک طویل نظم قلم بند کی ہے اور راوَن تیول کے تحت اس کو کتابی صورت میں زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔اس میں زندگی کے حقائق سے بہت ساری باتوں کی پردہ کشائی کی ہے۔

طویل انتظار کے بعد اس فردِ فرید نے اپنی شاعری اور نثری نگارشات پر مشتمل اپنی کتابیں چھپوا کر علم و ادب کے خزانے میں قابل قدر اضافہ کیا۔کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں۔صداتہ سمندر، رنگ نظرن، ہنڈ پرنیہ پیتہ، ڈُ ڈ فکر ہُندسُہ اکھ صداتہ، خیر البشر‘‘ اپنی دوستی اور تعلق خاطر کی بنا پر مرحوم نے مجھے ان علمی جواہر پاروں کو مرحمت فرما کر اپنی بلند ظرفی کا ثبوت پیش کیا۔اگرچہ بقول ناصر منصور (فرزندِ فراقؔ) ابھی بہت سارا مواد طباعت کا منتظر ہے۔

بالآخر کشمیری شعر و شاعری، تنقید۔(باقی ص 64 پر)

حُباب

میری یہ افتادِ طبع ہے کہ میں پرانی اور قدیم چیزوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اس ذوق کے پیش نظر کچھ پرانی چیزیں محفوظ کر چکا ہوں۔ ان نادر و نایاب اشیاء میں فارسی ترجمے اور تفسیر والے قرآن کے پرانے نسخے جن میں بطور خاص حضرتِ شاہ ولی اللہ دہلوی کی قدیم تفسیر بھی شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وفات یافتہ مشائخین، علمائے کرام، مشرقی ممالک اور مغربی دنیا سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کی تصویریں بھی میرے اَلبموں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ اپنے اس شوق و ذوق کو پروان چڑھانے کے لیے اپنے بچپن سے سالہا پیشتر رائج شدہ سکوں کی خاص تعداد بھی سنبھال کے رکھی ہے۔ ماضی قریب سے تعلق رکھنے والے کچھ بزرگوں، ادیبوں اور شاعروں کے خطوط بھی اپنی تفریح طبع کے لیے موجود رکھے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی یہ عادت بھی رہی ہے کہ اپنے بچپن اور پر شباب زندگی کی یادوں کو تازہ کر کے کسی اور دنیا میں کھو جاتا ہوں اور کبھی کبھی چشم تصور کو وا کر کے نم دیدہ ہو جاتا ہوں۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب

چنانچہ گذشتہ سال یعنی ۲۰۱۴ء میں پاکستان سے یہاں آئے ہوئے ایک مہمان سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا جو کہ اصلاً کشمیری النسل ہیں او روہاں مہاجرت کی زندگی گذارتے ہیں۔ موصوف ریڈیو آزاد کشمیر میں ملازمت کرتے تھے۔ ان کے ساتھ بات چلی پرانے وقتوں کی اور ریڈیو آزاد کشمیر سے نشر ہونے والے مختلف پروگراموں کے بارے میں دوران ملاقات اس بات کا بھی تذکرہ ہوا کہ پرانے زمانے میں آزاد کشمیر ریڈیو سے علامہ اقبال کی اسرار خودی کا کشمیری منظوم ترجمہ بھی نشر ہوتا تھا اور شائقین اقبال اس کو غور سے سنتے تھے۔ چونکہ معزز مہمان کے پاس ناز کولگامی کا یہ ترجمہ کشمیری کتابی صورت میں موجود تھا۔ بڑھاپے اور ضعیف العمری کی وجہ سے وہ اب اس کتاب سے استفادہ کرنے سے قاصر تھے اور پاکستان واپس پہنچ کر انہوں نے یہ کتاب یعنی کشمیری منظوم ترجمہ اسرار خودی راقم الحروف کو بھیجنے کا وعدہ کیا۔ اپنے اس وعدہ کو نبھاتے ہوئے موصوف نے پاکستان سے مجھے یہ کتاب کسی جانکار آدمی کے ہاتھ میرے لیے روانہ کر دی۔ اس طرح یہ کتاب حاصل کر کے میری آتش شوق اور بڑھک اٹھی کیونکہ یہ بھی کئی دہائیاں قبل چھپ چکی تھی اور اس کا مقدمہ مرحوم طاؤس بانہالی نے لکھا ہے۔ میرے لیے یہ بھی وجہ افتخار ہے۔ پاکستان سے آئے ہوئے اس شخص کا نام غلام رسول بٹ ہے (اصلاً ملک ہے) جواب مرحوم ہو چکے ہیں۔

ہاں اپنے پرانے زمانے کی ولولہ انگیز مگر ستم رسیدہ یادوں کی حرارت اور تپش کے ساتھ ساتھ بادِ نسیم کے جھونکوں اور عطر بیزیوں کو بھی محسوس کرتا ہوں کیونکہ ہمارا حال ہمارے ماضی سے جڑا رہتا ہے اور مستقبل میں امید کی روشن اور دلآویز کرنیں پھوٹنے کی بھی اُمید رہتی ہے۔

اس قدرے طویل تمہید سے ہٹ کر اپنے اصلی مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں کیونکہ ان تمہیدی کلمات کے بیان کرنے سے میرے پیش نظر کتاب ''حُباب'' کا تعلق بھی کوئی نصف صدی قبل یعنی ۱۹۵۴ء سے ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''حباب'' ہمارے سماج کے ایک کہنہ مشق اور آزمودہ کار شاعر نامی گرامی کی تصنیف ہے جو کہ وچار ناگ نوشہرہ میں تولد ہوئے تھے اور زندگی کے بہت سارے سال اسی محلہ پنڈتان میں گذارے تھے۔ اس کے بعد اپنے

ذاتی وجوہات یا کسی مجبوری کی بناء پر آپ نئی پورہ سرینگر منتقل ہوئے تھے۔ پھر بادِ سموم کے تھپیڑوں سے وہاں سے اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہہ دیا اور دیگر ہم وطن لوگوں کی طرح آپ بھی کشمیر سے باہر گرگاؤں ہریانہ میں آج کل سکونت پذیر ہیں اور اپنے بڑھاپے کے ایام وہاں گذارنے پر مجبور ہیں۔

اپنے اس قدآور شاعر گرامی کا نام ہے پیتامبر ناتھ درفانی کشمیری جنہوں نے کشمیری زبان کے دوش بدوش اردو کی بھی حتی المقدور خدمت کی ہے۔فانی کشمیری فطرتاً شریف النفس انسان ہے اور انہوں نے اپنی علم دوستی اور ادب نوازی کے جذبہ کے تحت راقم السطور کے نام حباب کا یہ گلدستہ درج ذیل عبارت لکھ کر بطور نذرانہ بھیجا ہے۔

کشمیر کے سن رسیدہ اہل قلم وشاعر محترم مرزا بشیر احمد شاکر صاحب کی خدمت میں ایک مشفقانہ پیش کش۔۔۔دستخط مصنف

محترم فانی کشمیری نے اس شاعری کے حسین گلدستہ کے ساتھ راقم کے نام ایک مکتوب بھی بھیجا ہے اور اس میں میری ایک کشمیری نظم پر اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔کتاب زیر تبصرہ کا ٹائٹل یوں ترتیب دیا گیا ہے۔

حباب مصنفہ

پیتامبر ناتھ درفانی کاشمیری۔بی اے

حالی پبلشنگ ہاوس، دہلی

یہ کتاب اکتوبر ۱۹۵۴ء میں یونین پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپ چکی ہے اس میں صاحب کتاب فانی کاشمیری کا جوانی کے زمانے کا بھی ایک فوٹو گراف ہے۔انتساب کے الفاظ یوں درج ہیں:

’’میں انتہائی محبت وعقیدت کے ساتھ اپنے اس مجموعہ کلام کو فلاکت زدہ کشمیر کے شاعروں ،ادیبوں ،مورخوں، صحافیوں، مصوروں، موسیقاروں، سنگتراشوں، معماروں، دست کاروں، کاریگروں، محنت کشوں اور راہِ آزادی میں شہید شدہ مردوں اور عورتوں سے منسوب کرتا ہوں‘‘۔۔۔۔فانی کشمیری

کتاب میں گذارش احوال کے تحت موصوف یعنی فانی کشمیری کی عبارت کا یہ حصہ بھی ہمیں دعوتِ فکر وعمل دیتا ہے:

’’جذبہ حب وطن کو صحیح طور پر نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک محب وطن صرف اپنے ملک کی سرزمین اور آب وہوا‘ جھیلوں‘ جھرنوں‘ ندیوں اور آبشاروں‘ ٹیلوں‘ پربتوں اور پہاڑوں‘ جنگلوں اور مرغزاروں‘ ویرانوں اور گلزاروں‘ پھلوں اور پھولوں اور پرندوں‘ حیوانوں اور انسانوں کے ساتھ ہی اظہار محبت نہ کرے بلکہ اس زبان سے بھی پیار کرے جو کہ اس سے مہد سے لے کر لحد تک اپنے خیالات اور احساسات کے اظہار کے لیے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہو اور یہ امر بھی کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ جس زبان سے آدمی بچپن ہی سے مانوس ہوا ہو اور جس کے ذریعے وہ اپنے محسوسات اور واردات قلب کا اظہار روانی اور بے تکلفی کے ساتھ کرکے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہا ہو۔اسی زبان کے ساتھ وہ نفرت کرنے لگ جائے۔یہ اس کی ترقی سے بے رخی اور بے اعتنائی برت لے۔کیا مادری زبان سے نفرت کرنے والے آدمی پر اس شخص کی مثال لاگو نہیں ہوگی جو کہ خود ہی اپنی زبان کو کاٹ کر اپنے آپ کو قوتِ گویائی اور گونا گوں لذتوں اور نعمتوں کے تلذذ سے محروم کرے یا اپنی ناک کاٹ کر اپنے چہرے کو بدنما اور کریہہ المنظر بنا ڈالے؟‘‘

س طرح یہ اندازہ کرنے میں کوئی مشکل نظر نہیں آتی کہ اس قسم کا دردمند دل رکھنے والے اپنی مادری زبان کے ساتھ پیار کرنے والے اور حب وطن کے جذبات سے سرشار دل رکھنے والے اپنے وطن سرزمین کشمیر سے بہت دور بود وباش کرنے والے فانی کشمیری کے حساس دل پر کیا گذرتی ہوگی۔بقول غالب ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائیں کیوں

حباب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کشمیری شعر وشاعری کا ایک حسین وخوب صورت لہلہاتا ہوا گلشن نظر آتا ہے۔ اس میں بہت ساری نظمیں درج ہیں۔ نظم کے ساتھ ساتھ ہر دوسرے صفحے پر اس کا اردو ترجمہ بھی طباعت سے آراستہ کیا گیا ہے۔ کشمیری ٹائپنگ کی کچھ تکنیکی دقتوں کو ملحوظِ نظر رکھ کر میں صرف چند اردو نظموں کے عنوانات درج کرنے پر اکتفاء کرتا ہوں جو کہ یوں ہے:

نظمیں:

۱۔ کیا ہمارا وطن (کشمیر) بھی کوئی کعبہ ہے؟ کلیسا ہے؟ یا بت خانہ ہے؟

۲۔ ترانۂ وطن ۳۔ یہ تو بیچارے مسکین کا خون ہے

۴۔ جوانی یا شباب

۵۔ لیکن میں انقلابوں کا کس قدر شور سنتا ہوں۔

۶۔ محبت ۷۔ بہار ۸۔ انقلاب نے تاجداروں کے محل گرا ڈالے! ۹۔ چاندنی اور برف

۱۰۔ مذہب ۱۱۔ کتنے اشراف زار و قطار رو رہے ہیں لیکن گدھوں (ظالموں) کو اس بات کا کیا غم؟

۱۲۔ بھلا شیخ اور برہمن کو بھی کس نے ہم آہنگ بنایا؟

اس کے علاوہ کتاب میں اور بھی بہت کچھ شاعرانہ مواد ہے جن کو پڑھ کر فاتیؔ کشمیری کے شدید الاحساس اور ذکی الحس ہونے کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ کشمیری اشعار کو بطور ثبوت یہاں پیش کرنا مصلحتاً نظر انداز کیا گیا ہے۔ یقیناً راقم کا یہ تبصرہ ایسا کرنے سے زیادہ صحت مند اور پُرکشش بن سکتا تھا۔ دراصل اصلی کتاب پڑھنے سے ہی قارئین لطف اندوز اور بہرہ وَر ہو سکتے ہیں۔ کتاب کے آخری صفحات پر مندرجہ ذیل مصنفوں اور اُس زمانے کے اخبارات کے نام درج کیے جاتے ہیں جنھوں نے کتاب کے بارے میں آج سے نصف صدی قبل اپنے تاثرات لکھے تھے۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی سابقہ رجسٹرار دہلی یونیورسٹی ومصنف تواریخ کشمیری (بزبان انگریزی) الموسومہ کشمیر (کشیر)

اخبارات:

۱۔ 'امر' جموں مورخہ ۲۶ / اگست ۱۹۵۴ء

۲۔ 'آوازِ حق' راولپنڈی پاکستان مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۵۴ء

۳۔ 'سویرا' جموں مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۴ء

۴۔ 'ہماری آواز' راولپنڈی پاکستان مورخہ ۱۳ ستمبر

ان تاثرات اور آراء سے کتاب کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور اتنا عرصہ گذرنے کے باوجود بھی یہ عصری معنویت رکھتی ہے۔ کیونکہ شاعر کی دُور رَس نگاہیں آئندہ زمانے کی مسافتوں کو طے کر کے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے باخبر رہتی ہیں۔

سب سے بڑی قابل توجہ یہ بات ہے کہ زیر تبصرہ کتاب مصنف کی ایک جگہ سے دوسری جگہ اور پھر تیسری جگہ منتقلی کے دوران اور پریشان کن حالات میں کس طرح زمانے کی دست بُرد سے محفوظ رہ سکی ہے۔ فاتیؔ کشمیری آج بھی اپنے اس لازوال کام اور ادبی گلدستہ کو اس زمانے میں زیور طباعت سے آراستہ کرنے کے لیے مبارک بادی کے مستحق ہیں جب کہ طباعت اور چھپائی کے ذرائع آج کی طرح دستیاب نہیں تھے اور کشمیری باشندے عُسرت، تنگ دستی اور مفلوک الحالی کی زندگی گذارتے تھے۔ سن ۱۹۵۴ء میں چھپنے والی اس کتاب پر درج قیمت دو روپے ہے۔

اپنے ماضی کے جھروکوں سے جھانکتے ہوئے اس نصف صدی قبل کی طبع شدہ کتاب کی منظومات کو پڑھتے ہوئے اس زمانے کے حالات و واقعات، حکمرانوں کے ظلم وستم، عوام لوگوں کی مفلوک الحالی اور دوسری حقیقتوں سے پردہ سرک جاتا ہے اور آج کے اس نام نہاد ترقی یافتہ دور کے حالات، ظلم وستم ناانصافیوں، لاچارگیوں وغیرہ سے جوڑ کھاتی ہیں۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف

ماہنامہ ''حکیم الامت'' سری نگر

پروفیسر اکبر حیدری صاحب کشمیری برصغیر کے ایک معروف ادیب اور محقق تھے۔ اردو زبان وادب کی تئیں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ غالبیات' اقبالیات' انیسیات اور دیگر اردو فارسی ادب کے نامور اور جگمگاتے ستاروں پر ان کے مقالات اور تحقیقی مضامین سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی تحقیق اور تنقید ٹھوس بنیاد پر ہوتی ہے۔ اردو ادب کے سر پرست ہونے کے ناطے ان کے قلم گہر بار سے درجنوں کتابیں منظر عام پر آ گئی ہیں۔ جنہوں نے ادبی اور علمی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ کتابوں' مقالات اور دیگر علمی مضامین کے ساتھ ساتھ پروفیسر مرحوم نے اگست ۲۰۰۶ء میں سرینگر کشمیر سے ایک ادبی رسالے ''حکیم الامت'' کا اجرا بھی عمل میں لائے۔ رسم رونمائی کی تقریبِ سعید کلچرل اکادمی سرینگر کے سمینار ہال میں انجام دی گئی تھی اور اس موقعہ پر کشمیر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور دانشوروں کی ایک کہکشاں موجود تھی۔ سمینار ہال ادبی ذوق رکھنے والوں سے بھرا پڑا تھا۔ اولین شمارے کے لیے اس وقت کے صدر ہند مرحوم اے پی جے عبدالکلام کا تہنیتی پیغام بھی آیا تھا جو انگریزی میں تھا۔

اس کے بعد کئی سال تک پروفیسر اکبر حیدری کی ادارت میں اس جریدہ کے کم سے کم بہتر (۷۲) شاندار شمارے زیور طبع سے آراستہ ہو کر دادِ تحسین حاصل کرتے رہے۔ مرحوم ''حکیم الامت'' کے شماروں میں بہت عمدہ قسم کے مقالات اور تحقیقی مواد پر مشتمل مضامین قلم بند کرتے رہے۔ خاص کر علامہ اقبال کی شعر وشاعری' فن اور فکرِ اقبالؒ کے فروغ کے لیے مرحوم حیدری صاحب نے بہت کچھ مواد فراہم کیا۔ غالبؔ اور قدیم زمانہ کے شعرائے کرام کے بارے میں بھی رسالہ ''حکیم الامت'' نے قابل قدر کام کیا۔ بہت سارے غیر مطبوعہ مضامین بھی رسالہ کی زینت بنے۔ بیرونی ممالک سے بھی نامور ادیبوں اور قلم کاروں کے مضامین آتے رہے اور اس طرح مختصر وقت کے اندر اندر اس دیدہ زیب جریدہ نے اپنے بال و پر پھیلائے اور دور دور تک اپنا پیغام پھیلا کر شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا۔ بانیٔ رسالہ یعنی ڈاکٹر اکبر حیدری رسالہ کے محاضرات والے صفحوں پر قلم کاروں اور شاعروں کے فوٹو گراف بھی چھاپتے رہے۔ اس طرح یہ رسالہ اور بھی دل کش بنتا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ قدیم وقتوں کے شعراء کرام وسلاطین کی نایاب یا کمیاب تصویریں بھی کبھی کبھی اس میں شائع کیں۔ مثلاً واجد علی شاہ مرحوم' محمد حسین آزادؔ' والی حیدر آباد دکن میر عثمان علی خان کی تصویروں سے بھی اپنے رسالہ کو چار چاند لگائے۔ مگر اے وائے بقول غالبؔ:

رو میں رخش عمر دیکھئے کہاں تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ ہے پا رکاب میں

بالآخر برصغیر ہندو پاک کا یہ نامور ادیب اور یکتائے زمانہ قلم کا مردِ آہن بھی موت کے تیز پنجوں کا شکار ہو گیا اور فرمانِ الٰہی کُلُ نَفْسٍ ذائقۃُ الْموت کی روشن حقیقت بن کر بہت سے چاہنے والوں کو غم زدہ چھوڑ کر عالم عقبیٰ کو سدھار گیا۔

اِنا لِلّٰہِ وَاِنا الیہِ راجعوْن!

پروفیسر اکبر حیدری کی وفات کے بعد رسالہ ''حکیم الامت'' کو جاری وساری رکھنے کی ساری ذمہ داری ان کے فرزند جناب

والد مرحوم کی وفات کے بعد اس قابل اور باصلاحیت بیٹے نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ آپ والد کے مشن کو برابر کامیابی کے ساتھ آگے بڑھاتے رہے۔ والد کی وفات کے غم واندوہ کے عمیق سمندر میں ڈوب کر بھی اس جواں سال ایڈیٹر نے رسالہ ''حکیم الامت'' کا معمول کا شمارہ اپنے وقت پر شائع کیا۔

ڈاکٹر ظفر حیدری کے کندھوں پر آ گئی۔ گو کہ اکثر قارئین کا یہ خیال تھا کہ ظفر صاحب اس عظیم ذمہ داری کو شاید نبھا نہیں پائیں گے اور باپ کے مشن کو غالباً ادھورا چھوڑیں گے۔ مگر بقول شاعر ؎

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

والد مرحوم کی وفات کے بعد اس قابل اور باصلاحیت بیٹے نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ آپ والد کے مشن کو برابر کامیابی کے ساتھ آگے بڑھاتے رہے۔ والد کی وفات کے غم واندوہ کے عمیق سمندر میں ڈوب کر بھی اس جواں سال ایڈیٹر نے رسالہ ''حکیم الامت'' کا معمول کا شمارہ اپنے وقت پر شائع کیا اور آج بھی اپنی ہمت وجوانمردی سے وہ یہ رسالہ اپنے وقت بلکہ کبھی کبھی Scheduled time سے قبل بھی نکالتے رہتے ہیں۔

وقتاً فوقتاً دانشور اور علمی شخصیات نے پروفیسر اکبر حیدری کے مبارک ہاتھوں سے اجرا شدہ ماہنامہ ''حکیم الامت'' کے بارے میں اپنی آرا اور زرین خیالات کا اظہار کیا ہے جس میں قابل ذکر فرزند اقبال مرحوم جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب ہیں انہوں نے لکھا تھا:

''جہاں تک میری نظر ہے کہ بھارت کا مجھے معلوم نہیں البتہ پاکستان بھر میں مجھے اس جیسا (یعنی رسالہ 'حکیم الامت') رسالہ نظر نہیں آتا ہے۔''

اسی طرح دیگر اہل دانش جیسے محترم ظہیر الدین اثر یزدانی جمالی، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ڈاکٹر سید عباس علی شاہ، عرفان علی اور بہت سارے ادیبوں اور شاعروں نے اس رسالہ کی اپنے مکتوبات، مراسلات اور پیغامات کے ذریعہ سراہنا کی ہے اور اس کے ادبی معیار کو پرکھا ہے۔ ہنوز یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ یہ سارے مراسلات بطور ثبوت ماہنامہ متذکرہ کی فائلوں میں چھپ چکے ہیں۔ دراصل یہ مرحوم حیدری صاحب کی علم وادب اور اردو زبان وادب کے ساتھ والہانہ الفت اور شیفتگی تھی کہ دبستانِ اردو کا یہ سرسبز اور تناور درخت لہلہاتا نظر آتا ہے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ڈاکٹر ظفر حیدری کے سر یہ سہرا بھی بندھتا ہے کہ آپ نے حال ہی میں ایک خصوصی شمارہ ''نعت رسول نمبر'' بھی شائع کیا ہے۔ یہ شمارہ جنوری ۲۰۱۶ء کا ہے۔ اس خصوصی شمارے کی اپنی علیحدہ اہمیت اور پہچان ہے۔ سب سے بڑھ کر اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ سرتاج انبیاء امام الاولیا تاجدار نبوت جناب محمد مصطفیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہٖ) وسلم کی شانِ اقدس میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ ان کی ذات مقدس کے بارے میں یہی کیا کچھ کم ہے کہ فرمایا گیا ہے ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ پہلے بھی مختلف علمی اداروں، اکادمیوں اور عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نعتیہ ادب اور صنفِ نعت پر خصوصی شمارے نکلے ہیں۔ مگر ماہنامہ ''حکیم الامت'' کا نعت رسول ﷺ نمبر انفرادی ہے۔ یہ نمبر بہت ہی جاذب نظر اور دیدہ زیب ہے۔ اس کے ٹائٹل پر علامہ اقبال کے یہ نعتیہ اشعار درج ہیں:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغِ وادئ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

اس کے حروف جلی میں اسم مقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو رنگوں سرخ اور سفید میں ڈیزائن کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ محاضرات والے صفحے پر اس شمارے کے اہل قلم کی تصویریں ان کے ناموں کے ساتھ موجود ہیں اور اسی کے پشت پر قدیم وجدید شعرائے کرام کی خوبصورت تصویروں سے نعت نمبر کو سجایا گیا ہے۔ رسالے کا اداریہ نعت رسول نمبرؐ کی شان نزول پر مشتمل ہے۔ اس نعتیہ گلدستہ کے صفحہ نمبر ۲ پر مرحوم نعت نگاروں کی فہرست کے ساتھ بقید حیات اردو شعراء کے اسماء گرامی کی فہرست دی گئی ہے۔ پھر ابتدائی پانچ صفحات پر عربی زبان کی بیش بہا نعتیں درج ہیں۔ نعتوں کے اختتام پر ان کی اردو زبان میں تشریح کی گئی ہے۔ دورِ رسالت سے تعلق رکھنے والے نعت نگاروں کے اسمائے گرامی یوں ہیں:

ا۔ سیدنا ابو طالب ۲۔ حضرت خدیجتہ الکبریٰ

''حکیم الامت'' نے اپنی دس سالہ اشاعت میں جو دیگر خصوصی نمبرات شائع کیے ان میں پیغمبر اسلام رحمتہً للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، مولود کعبہ حضرت علی مرتضیٰؑ، خاتون جنت فاطمۃ الزہرا اسلام اللہ علیہا، حضرت خدیجتہ الکبریٰ، ابو طالب، سید الشہداء امام حسینؑ، ثانئ زہرا زینب سلام اللہ علیہا، حضرت اُم کلثومؑ، جناب فضہؑ، اصحاب باوفا نمبر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ میر نمبر، جوش نمبر، اکبر حیدری نمبر، کشمیر نمبر، گوشۂ اشفاق نجمی اور گوشۂ گلشن خطائی قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اور بھی بہت سارے قابل قدر شمارے اور خصوصی نمبرات نکالے گئے ہیں۔

''حکیم الامت'' کے مستقل اہل قلم میں برصغیر اور مغربی ممالک کی معروف شخصیات شامل ہیں جن میں ڈاکٹر جاوید اقبال (لاہور) ڈاکٹر سید تقی عابدی (کنیڈا) ڈاکٹر علی عباس شاہ (دُبئی) نصر ملک (ڈنمارک) پروفیسر سعید اختر درانی (برطانیہ) عرفان علی (امریکہ) سلطانہ مہر (برطانیہ) سید محبوب الرحمن نیازی (جے پور) ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق (لکھنؤ) ظہیر الدین اثر یزدانی (جے پور) مجیب احمد صدیقی (گونڈا) بشیر آثم (سری نگر) قابل ذکر ہیں۔ الغرض یہ علمی اور ادبی رسالہ گذشتہ چودہ سالوں سے اپنا سفر کسی رکاوٹ اور تھکاوٹ کے بغیر جاری رکھے ہوئے ہے اور امید ہے کہ یہ آئندہ بھی گلستانِ اردو میں مہکتے ہوئے پھولوں کو اور بھی عطر بیزیوں اور مشک ختن سے مہکاتا رہے گا۔ اس جریدے پر درج ذیل شعر صادق آتا ہے ؎

میں کہاں رُکتا ہوں عرش وفرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

یادِ یارِ مهربان همی آید

(باقی ص 75 سے آگے)

چھوڑ گئے، شعر وشاعری کی کتابیں چھوڑ گئے، نثری نگارشات چھوڑ گئے، اسی کی وجہ سے وہ زندہ جاوید رہیں گے۔ ان کے عزیزوں اور شاگردوں نے اپنے آنسوؤں کا خراج ان کی خدمت میں پیش کیا، جان ودل سے شب وروز ایک کرکے ان کی خدمت اور تیمارداری کی وہ اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑ گئے۔ اپنی اہلیہ کو یکہ وتنہا چھوڑ اگر اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو اپنے نور سے بھر دے اور ان کی مغفرت کرے۔ مرحوم کے رسم چہارم پر اُن کی رہائش گاہ کے قریب دوسرے ہمنوا احباب کے ساتھ راقم نے بھی بزبان کشمیری فرید پربتی کے لیے اپنا ایک منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

یادِ یارِ مہربان ہمی آید

یہ کوئی تیرہ یا چودہ سال قبل کی بات ہے کہ کلچرل اکیڈیمی کے سرینگر کے کتاب گھر میں جناب ڈاکٹر فریدی کے ساتھ میری تھوڑی سی شناسائی ہوگئی۔ بات بذریعہ ڈاک بھیجنے والی کتابوں کے پیکٹز پر ڈاک ٹکٹ لگنے کی شرحوں پر ٹھہری اور بس۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ راقم کی تبدیلی ڈاک خانہ کشمیر یونیورسٹی میں ہوگئی اور وہاں مجھے بحیثیت پوسٹ ماسٹر تعینات کیا گیا۔ اندھے کو اور کیا چاہیے دو آنکھیں۔ مجھے بھی وہاں جانے میں دلچسپی تھی کیونکہ کشمیر یونیورسٹی ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں چشم بینا رکھنے والوں کے لیے حضرت بل درگاہ کی رحمتیں ہر وقت ضیاء بار رہتی ہیں جہاں اس مقدس اور روحانی مرکز سے بلند ہونے والی اذانوں کی صدا کانوں میں گونجتی رہتی ہیں اور خدا کے نیک اور اطاعت شعار بندے ان رحمتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کا اردگرد کا ماحول بھی بہت ہی خوش نما لگتا ہے۔ یونیورسٹی کے ساتھ ہی ساتھ نسیم باغ میں صدیوں پرانے چناروں کے درخت موسم بہار میں اپنے جوبن پر ہوتے ہیں اور کشمیر کی عظمتوں کے گواہ ہیں۔ یونیورسٹی میں وسیع وعریض رقبے پر پھیلے ہوئے رنگارنگ پھولوں کی بہتات ہے اور صفائی وستھرائی کا دیدہ زیب منظر بھی خوب ہوتا ہے۔ پھر جھیل ڈل کا حسین نظارہ اور پہاڑوں کی بلندی بھی نظروں کو فرحت بخشتا ہے۔

راقم السطور ابتداء سے ہی علم وادب کا شوق رکھتا ہے اور کتابوں وغیرہ کا رسیا بھی ہے۔ اس لیے موقعہ کو غنیمت جان کر یونیورسٹی کے ڈاک خانے میں اپنے عہدے کا چارج سنبھالا۔ ڈاکٹر فرید پربتی کا ڈاک خانے میں میرے آنے سے پہلے آنا جانا رہا تھا۔ کئی روز کے بعد کرسی پر دیکھ کر اندر آگئے اور مجھے مبارک باد دے کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے چائے کے ایک کپ سے آں محترم کی مہمان نوازی کی۔ پھر یہ سلسلہ اکثر وبیشتر جاری رہا اور ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ڈاک خانہ سے واپس نکلنے پر میں فرید صاحب کو غور سے دیکھتا تھا اور ان کے وجیہہ چہرے اور بلند قامتی سے اندر ہی اندر محظوظ ہوتا تھا۔ ان کی زودروی اور تیز رفتاری سے ان کی شخصیت اور بھی جاذبِ نظر لگتی تھی۔ ان کی صحت مندی پر بھی رشک آتا تھا۔ فرید صاحب میرے علمی مزاج او ادبی ذوق سے واقف ہوگئے تھے۔ ایک روز ممبئی سے نکلنے والا رسالہ ''شاعر'' کا ایک نسخہ ہاتھ میں لیے میرے ٹیبل پر رکھ دیا۔ جونہی میری نظر اس رسالے پر پڑی تو اس کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔ ٹائٹل صفحے پر فرید پربتی کی تصویر نمایاں تھی اور خوبرو اور وجیہہ صورت کا چہرہ نظر آرہا تھا جو کہ بہت ہی دیدہ زیب لگتا تھا۔ پھر اندر والے صفحات میں مرحوم کی شخصیت اور ان کی شاعری اور فن سے مضامین اس میں نظر آئے۔ رسالہ آج بھی میری لائبریری میں موجود ہے۔ اسی طرح ملاقات کے دیگر مواقع پر گفتگو چاند سے اور شعر، شعور و شعریات والی کتابیں تحفتاً عنایت فرمائیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

فرید صاحب کو اس زمانے کے ریاستِ جموں وکشمیر کے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل جناب دیپک بدکی کے ساتھ گہری دوستی تھی اور اکثر ان کے دفتر واقع بنڈ سرینگر ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے ہمراہ ہوتے تھے جب دیپک بدکی

کوئی لیکچر دینے کی غرض سے یونیورسٹی تشریف لاتے تھے۔ایک روز چیف صاحب کو یونیورسٹی آکر لیکچر دینے کا پروگرام تھا کہ فرید صاحب نے مجھے تین روز قبل اس پروگرام سے آگاہ کیا اور وقت کی پابندی رکھنے کا بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دے دی۔

چونکہ نامساعد حالات کی وجہ سے کبھی کبھی دیر بھی ہوجاتی تھی اور بدکی صاحب کی آمد کے دن میں بالکل ٹھیک وقت پر حاضر ہوگیا اور اپنے ماتحت عملے کو بھی ہدایات دے دیں۔ میں ٹھیک نو بجے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوگیا اور ہمارے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل ساڑھے نو بجے میرے ڈاک خانے میں وارد ہوگئے۔اس چیز سے فرید پربتی کا جذبہ ہمدردی اور دوست نوازی کا اظہار ہوتا ہے۔ماضی کے دریچوں سے جھانکتے ہوئے کتنی یادوں کو تازہ کیا جائے اور اس مہربان دوست کی کس کس ادا اور علم دوستی کی داد دی جائے کبھی کبھی ٹیلی فون پر بھی بات چیت ہوتی تھی ایک روز بدقسمتی سے میں اپنے مکان کی تیسری منزل سے گر گیا کیونکہ باہر سے لمبی سیڑھی کھسک گئی میں زخمی ہوگیا اور میرے دائیں پاؤں کا فریکچر ہوگیا۔ڈاکٹر پربتی کو اس کا پتہ چل گیا تو ٹیلی فون پر ہی سہی میری خیریت دریافت کی اور اظہار ہمدردی کیا۔

کوئی دو سال کے بعد ترقی کا حکم نامہ پاکر میری منتقلی ڈاک خانہ جواہر نگر سرینگر ہوگئی۔وہاں کچھ مدت کام کرنے کے بعد ایک روز ڈاکٹر فرید یکا یک نمودار ہوگئے۔ہم بغلگیر ہوگئے اور علیک سلیک کے بعد میں نے ان کو احترام اور شفقت کے ساتھ بٹھایا اور چائے سے ان کی مہمان نوازی کی۔پھر کچھ دیر کے بعد آنجناب نے ایک دعوت نامہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔اس کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ آں محترم کے اعزاز میں کلچرل اکادمی سرینگر میں ایک تقریب کا انعقاد ہونے والا تھا اور اس روز ان کی تازہ تصنیف ''مقدمہ صنف رباعی'' کی رسم رونمائی ہونے والی تھی۔ میں نے حامی بھر لی اور حاضر ہونے کا وعدہ کیا پھر تقریب منعقد ہونے کے دن اپنے بڑے آفیسروں سے اجازت لے کر اور وقت نکال کر میں کلچرل اکادمی کے ہال میں مدعو سامعین کے ساتھ شامل ہوگیا۔جہاں اور بھی سرکردہ ماہرین علم و ادب موجود تھے۔مثلاً قدوس جاوید، شفق سوپوری وغیرہ۔مجلس میں مقالات پڑھے گئے اور اجراء ہونے والی کتاب پر روشنی ڈالی گئی۔مجلس کے اختتام پر میں نے بھی راقم کو کتاب کی اجرائی پر مبارکباد دے دی۔جواباً موصوف نے فرمایا کہ یہ آپ ہی لوگوں کو مبارک ہے۔

میری ہمسائیگی میں قدیمی طور پر بسنے والے معراج الدین انصاری ایک ہمسائے کا انتقال ہوا تھا وہ کسی دوسری جگہ منتقل ہوگئے تھے اور ان کو اپنے پہلے محلہ کے مقبرہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ان کی رسم فاتحہ خوانی پر میں بھی مقبرے پر بیٹھا تھا کہ مرحوم فرید پربتی کو بھی آتے ہوئے دیکھا۔وہ فاتحہ خوانی سے فارغ ہوئے تو میں نے ان کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔فرید صاحب آکر میرے پہلو میں بیٹھ گئے اور ہم اجتماعی فاتحہ خوانی کا انتظار کرنے لگے۔اتنے میں بات شروع ہوئی، فرید صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ کہیے آج کل کیا کر رہے ہیں۔جواباً میں نے عرض کیا کہ بس اخبارات میں فرید پربتی کے چھپے مضامین پڑھ رہا ہوں اور لطف لے رہا ہوں۔یاد رہے کہ جوش ملیح آبادی سے متعلق اور کئی دیگر ادبی مضامین، جو کہ انہوں نے سپرد قلم کیے تھے اخباروں کی زینت بن چکے تھے۔

پھر فاتحہ خوانی کے بعد موصوف مرحوم انصاری صاحب کے گھر کی طرف عمر کالونی روانہ ہوگئے۔کس کو معلوم تھا کہ موت کا فرشتہ اس جیالے فرزند کی زندگی کی کچھ پچاس سے اوپر ہی بہاریں دیکھنے کے بعد ان کے تعاقب میں لگا ہے۔ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوکر ڈاکٹر فرید پربتی ۱۴ دسمبر کو صورہ سرینگر کے اسپتال میں انتقال کر گئے۔موت سے کس کو رستگاری ہے، آج وہ کل ہماری باری ہے۔

فرید پربتی اپنے پیچھے یادیں۔۔۔(باقی ص 73 پر)

مرحوم نُور محمّد

کتابی دنیا کا متوالا

کتابوں کی یہ دنیا بھی ایک نرالی دنیا ہے۔ گویا یہ ایک طلسم خانہ ہے۔ ابتدائے آفرینش سے ہی بنی نوع انسان کو علم کی اہمیت وافادیت سے آگاہ کیا گیا ہے اور اس کے حصول کے لیے ترغیب دی گئی ہے۔ بہت سارے انبیاء کرام پر کتابیں نازل کی گئی ہیں، اگر چہ ان میں سے چند ہی کتابوں کے نام منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ مثلاً انجیل، زبور، تورات اور آخری نبی اور پیغمبر یعنی جناب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر آخری آسمانی صحیفہ یعنی قرآن نازل ہوا۔

کتابوں کے بارے میں عالمی شہرت یافتہ اہل قلم او ردانشور حضرات کے مقولات اور فرمودات زیبِ قرطاس بنے ہوئے ہیں جن میں سے چند ایک یوں درج کیے جاتے ہیں۔

ایک یہودی کہاوت ہے کہ تمہارے بچے تمہیں یاد رکھیں تو ایک جھونپڑی بناؤ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے پوتے، پوتیاں تمہیں یاد کریں تو پتھروں کا ایک مکان تعمیر کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے پڑ پوتے، پڑ پوتیاں تمہیں یاد کریں تو فصیلوں والا ایک شہر آباد کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ آنے والی ساری نسلیں تمہیں یاد کریں تو ایک کتاب لکھو۔۔۔۔۔ (نامعلوم)

جس دن سے مجھے کتابوں سے جدا کر دیا جائے وہ میرا آخری دن ہوگا۔۔۔۔۔ (شیکسپیئر)

میری تمنا ہے کہ مرنے کے بعد میرا بس چلے تو اپنی قبر میں کتابیں ہی کتابیں رکھوں تا کہ میں انہیں پڑھا کروں۔ (مولانا مودودیؒ)

یہ دنیا کتنی پُر اسرار دنیا ہے اس میں وسعت بھی ہے اور حیرت انگیز گہرائیاں بھی۔ یہاں بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل، ملک و قوم، زبان ومکان پاک روحوں سے ملاقات ہوتی ہے ان روحوں کا تخلیقی کام کبھی رُکتا نہیں۔۔۔۔۔ (آغا اشرف علی)

The world of books is the most remarkable creation of man nothing else that he builds everlasts.

(Clearence Day)

Books are the ever burning lamps of accumulated wisdom.

(George William Curtis)

الغرض کتابوں کے یہ روشن مینار ہر وقت اندھیرے میں اپنی تابناکی سے روشنی بکھیر کر اندھی راہوں کو روشن کرتے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ لکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ جس خوش نصیب انسان کو فیاضِ ازل نے کتابیں پڑھنے، لکھنے اور ان کے چھپوانے کے شوق سے سرفراز کیا ہو وہ کس قدر قابل رشک اور باعث عزت ہے۔ ان ہی نیک بختوں اور بلند اقبال علم دوست حضرات میں سے ایک شخص پیدا ہوا ہے جس کا اسم گرامی نور محمد ہے۔ آں محترم اگر چہ کئی دہائیاں قبل مرحوم ہو چکے ہیں مگر آج بھی ان کا نام علمی اور ادبی دنیا کی تاریخ میں ایک روشن ستارے کی مانند نظر آتا ہے۔ وادیٔ کشمیر اور اس سے باہر آپ اپنی کتابی دکان غلام محمد نور محمد تاجران کتب مہاراج گنج سرینگر کے نام سے آج بھی مشہور ومعروف ہے۔ اس مناسبت

سے راقم السطور کو اپنی ایک طویل نظم کے دو اشعار بے ساختہ یاد آتے ہیں کہ ؎

کہاں ہیں تاجران کتب کتابیں چھاپنے والے
غلام محمد و فرزند نور وہ مہاراج گنج والے

اندھیرے میں کتابیں چھاپ کر انوار پھیلائے
نول کشور لکھنؤ کے یہاں دونوں وہ کہلائے
(شاکر)

دراصل یہ مرحوم نور محمد کا خلوص دل اور علم دوستی کا جذبہ تھا کہ آپ نے اپنے زمانے میں درج بالا نام سے ایک دکان سجائی اور ایک ایسے زمانے میں یہاں کے لوگوں کو علم و ادب کی چاشنی سے بہرہ ور کیا۔ یہ زمانہ مفلسی کا زمانہ تھا۔ آج کی طرح سائنس اور ٹیکنالوجی کا عروج پذیر زمانہ تھا اور نہ ہی کمپیوٹر والی چھپائی کا زمانہ تھا۔ اکثر اخبارات اور کتابیں لتھو پریس پر چھپ جاتی تھیں۔ لوگوں کی قوتِ خرید بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ مگر اس مہذب اور علم و ادب کے شیدائی یعنی نور محمد نے اپنے جذبۂ صادق اور ہمت مردانہ سے کام لے کر علم کی روشنی کو یہاں ہر سو پھیلایا۔ آپ غیر منقسم ہندوستان کے راولپنڈی اور لاہور جیسے علم و ادب کے گہواروں سے کتابیں چھاپ کر لاتے تھے۔ یہ کتابیں اکثر و بیشتر کشمیری صوفی شعراء کرام کے کلام پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً کلام شمس فقیر' کلام نیامہ صاب' کلام سچھ کرال' کلام رسول میر' شاہ قلندر' شاہ غفور وغیرہ اس کے علاوہ جنگ ناموں اور داستان جن و عشق وغیرہ پر مشتمل آپ کتابیں چھاپتے تھے۔ جیسے داستان امیر حمزہؒ، ہی مال ناگرائے، قصہ یوسف زلیخا، شیریں فرہاد وغیرہ۔

لوگ بھی ان کتابوں کے عاشق تھے اور یہ کتابیں گھر گھر پڑھ کر دوسروں کو بھی سنا کر ایک پُر لطف زندگی گذارتے تھے مرحوم نور محمد بہت سارے لوگوں کو یہ کتابیں معمولی کرایہ پر بھی فراہم کرتے تھے اور اس طرح یہ نور رفتہ رفتہ کشمیر کے شہر و دیہات بلکہ اس سے بھی باہر پھیلتا گیا۔ کسی نے بجا فرمایا ہے کہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آہستہ آہستہ غلام محمد نور محمد کی دکان اہل علم و اہل دل حضرات کے لیے ایک نشست گاہ بن گئی۔ یہاں بہت سارے حضرات جمع ہو جاتے تھے اور علم و ادب کی پُر بہار محفلیں جم جاتی تھیں۔ تاریخی شواہد کے مطابق یہاں کشمیر کے انقلابی شاعر عبدالاحد آزادؔ آتے تھے۔ شاعر کشمیر مہجورؔ بھی رونق افروز ہوتے تھے۔ صوفی شاعر مرحوم احد زرگر بھی اس دکان پر آتے تھے۔ اسی طرح بعد میں آنے والوں میں نوجوان شعراء رحمان راہیؔ غلام نبی فراقؔ دلسوزؔ غلام رسول کاوسہ اور فاضل کشمیری بھی شامل احباب ہوتے گئے اور اس کتابی دکان نے بھی ایک تاریخی اہمیت پائی۔ اسی طرح بعد میں یہ نشست لال چوک میں پرانے سینما گھر پلیڈیم گلی کے نزدیک بھی مرحوم غلام قادر صاحب المعروف لورہ کھار کی دکان پر سجتی تھی اور وہاں زمانے کے شعراء اور ادیب حضرات بیٹھ کر علمی مباحث چھیڑتے تھے جن میں قابل ذکر مرحوم غلام محی الدین حاجنیؔ، مرحوم میر غلام رسول نازکیؔ، مرزا غلام حسن بیگ عارفؔ بقید حیات پروفیسر شیخ اقبال صاحب وغیرہ ہوتے تھے مگر زمانے کی کج رفتاری کا کیا کیجے اب اس قسم کی محفلیں عنقا ہوئی ہیں اور کتابوں میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان یارانِ محفل میں سے بہت سارے زیر خاک آسودہ ہیں اور ان کی وہ پُرلطف یادیں دلوں کو تڑپاتی ہیں بقول غالبؔ ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

بذاتِ خود مغفور نور محمد کی شخصیت تھی جنہوں نے اپنی

محنت اور علمی ذوق وشوق سے اہل علم حضرات اور عام لوگوں میں مطالعہ کا یہ ذوق پروان چڑھایا اور اس کو فروغ بخشا۔ چنانچہ ہمارے ایک قلم کار عمر مجید صاحب مرحوم نور محمد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حمد ونعت، منقبت وسلام کے بے شمار گلدستے نور محمد صاحب نے اشاعت کی دنیا میں سجائے نہ جانے وہ کہاں کہاں سے شاعروں کو ڈھونڈ لاتے تھے۔ وہ طرح طرح کے تجربات کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے مجھے بتایا کہ وہ قرآن شریف کی تفاسیر پر کام کر رہے ہیں اور ان کو شائع کرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں پچاس سال کے صبر آزما لمحات میں اشاعت، تشہیر، ترغیب اور پھیلاؤ کو جو فرائض آج کل کے زمانے میں ریڈیو کشمیر، کلچرل اکادمی، یونیورسٹی آف کشمیر اور اخبارات ورسائل، ویب سائٹ اور دیگر اشاعتی ادارے انجام دے رہے ہیں۔ نور محمد اکیلا تن تنہا ان دنوں ان اداروں سے کہیں زیادہ سرگرم عمل تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ کشمیر کے نول کشور تھے۔ وہ نہ صرف کشمیری شعراء کے اور کلیات اہتمام کے ساتھ شائع کرتے بلکہ زبان دانی اور اشعار کی شیرازہ بندی کے رموز پر تصحیح بھی کرواتے یا خود کرتے تھے۔ کشمیری زبان کی شاعری کو انہوں نے اولاد کی طرح سینے کے ساتھ لگا کے رکھا اور پھر اس کی اشاعت اور پھیلاؤ میں ایسا کام کیا جو کشمیر کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں رقم کیا جانا چاہیے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر نور محمد کشمیری زبان وادب کی طباعت کے ساتھ منسلک نہ ہوتے تو اس صورت میں کشمیری زبان کا بیشتر سرمایہ ضائع ہوگیا ہوتا اور آج جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے وہ اس طرح شہر ودیہات کے اطراف میں پہنچ کر مقبول نہیں ہوا ہوتا لیکن ان کی شکر گذار قوم نے ان کی بے لوث خدمات کو یکسر نظر انداز کرکے ان کو بالکل فراموش کردیا۔ مرحوم نور محمد کا علمی ذوق اس طرح نکھر گیا اور ان کی شب و روز کی محنت بالآخر اس طرح رنگ لائی کہ سن ۱۹۵۵ء میں آپ نے اپنا چھاپ خانہ قائم کیا اور یہ ایک کشمیری مسلمان کا اولین چھاپ خانہ تھا۔ حالانکہ وادی کے غیر مسلموں کے چند چھاپ خانے اگرچہ اس سے پہلے بھی تھے۔ آپ نے یہاں کے کشمیری شعراء کا کلام بلا امتیاز مذہب وملت چھاپ کر دادِ تحسین حاصل کی''۔

نور محمد مرحوم کی علمی شخصیت کا ایک خاص پہلو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اکثر لوگ ان کو کتب فروش یا کتابیں چھاپنے یا چھپوانے والے کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر موصوف کی شخصیت ان چیزوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ وہ نوآموز تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی کیفیت کو بھانپنے کی کوشش کرتے تھے اور ان میں سنجیدہ مطالعہ کرنے کی صلاحیت اجاگر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ وادی کے قدآور شاعر اور محقق پروفیسر رحمان راہیؔ نور محمد کی علمی صلاحیتوں کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

''غلام محمد نور محمد تاجران کتب سری رنبیر گنج بازار سرینگر کے دکان سے کتابیں کرایہ پر بھی ملا کرتی تھیں اور ایک دن کے لیے وہ کرایہ دو پیسے لیا جاتا تھا میں نے پہلی کتاب اس دکان سے کرایہ پر لی تھی وہ تیرتھ رام فیروز پوری کا کوئی جاسوسی ناول تھا۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد جب میں اسے واپس دینے آیا تو دوکان پر خود نور محمد بیٹھے تھے۔ انہوں نے کتاب لیتے ہوئے میرے سراپا پہ ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور پوچھا کیوں میاں پڑھ لی کتاب؟ میں نے کہا جی ہاں پڑھ لی۔ اس پر پوچھا کیا پایا اس میں؟ میں نے اپنی دانست میں داستان کا خلاصہ پیش کرنا شروع کیا۔ انہوں نے ٹوکتے ہوئے پوچھا نہیں صاحبزادے تم مجھے اتنا بتاؤ کہ اس کتاب کے مصنف کا مطمع نظر کیا ہے؟ میں لاجواب ہو کے رہ گیا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے پہلی بار کسی کتاب میں ڈوب کر مطالعہ کرنے کا احساس دلایا گیا ہو جیسے درسی کتابوں کے بغیر بھی کچھ ایسی کتابیں ہوں جن کی انسان کی زندگی سے نہایت سنجیدہ وابستگی ممکن ہو۔ یہ لمحہ بڑا قیمتی تھا۔ بڑا جاودانی تھا کیونکہ

اسی لمحے میرے وجود کی کایا پلٹ گئی۔ یہ ایک ''ٹرننگ پوائنٹ'' تھا اور ٹھیک اسی لمحے میں نے مرحوم نور محمد کو من ہی من میں اپنا استاذ اپنا رہبر تسلیم کیا۔ میں نئی نئی کتابیں کرایہ پر لیتا رہا اور وہ مجھ سے نت نئے سوالات پوچھتے رہے اور اس طرح انہوں نے مجھے غیر شعوری طور کتابوں کا زبردست عاشق بنایا۔ اب کتابیں ہی میری ہم کلام اور واحد دوست تھیں۔ ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر لذت کلام کا سلسلہ چلتا رہا اور مجھ پر متعدد و اسرار و رموز کی گرہیں کھلنے لگیں''۔

اس طرح نور محمد جیسے علم دوست اور ادب نواز بزرگوں نے نو آموز اور علم و دانش کے متلاشی اشخاص کے دلوں میں کتاب بینی کا ذوق پروان چڑھایا اور کتابوں کی اہمیت اور عظمت سے ان کو واقفیت دلائی۔ زمانے کا تیز رفتار سرپٹ گھوڑا اگرچہ بہت آگے نکل چکا ہے اور نئی نئی ایجادات اور سائنسی کرشموں نے آج کے انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ آج کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور دیگر جدید قسم کی سہولیات دستیاب ہیں۔ مگر سب کے ہوتے ہوئے مطالعۂ کتب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور کتاب ایک استادانہ رول نبھا سکتی ہے۔

پڑے گی جب بھی ضرورت کتاب حاضر ہے
تیرے سوال کا اس میں جواب حاضر ہے
ہر اک مقام پہ کرلے گی رہبری تیری
طرح طرح سے سنوارے گی زندگی تیری
اندھیری رات میں یہ ماہتاب حاضر ہے

بالآخر کتابی دنیا کا یہ متوالا اور علم و دانش کا چمکتا ہوا ستارہ یہاں کے ادبی افق پر مارچ ۱۹۶۵ کو غروب ہوگیا مگر اپنے پیچھے ایسی کرنیں چھوڑ دیں جن کی روشنی میں بھٹکنے والے راستہ تلاش کرتے رہیں گے۔

یارب وہ ہستیاں اب کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

سلمیٰ کے نام

مرزا بشیر احمد شاکر

ہوا کے دوش پر لاہور سے یہ کیا ندا آئی
میرے کانوں کے پردوں سے تیری آواز ٹکرائی

نویدِ جان فضاء پیغام تھا یہ اے بہن میری
رہے امن و امان میں اور سلامت زندگی تیری

میرے دل کے کنول پر تھی بہت ہی افسردگی چھائی
چمن میں میرے پھولوں پر بہار آئی اور رنگ لائی

بہت ہی متمنی ہوں میں کہ دیکھوں شہرِ خوباں کو
جہاں رہتے ہیں زندہ دل میں دیکھوں اُن نگاروں کو

رہا یہ شہر ہے علم و ادب کا ایک گہوارہ
یہاں کی رونقیں یہ زیب و زینت اور یہ نظارہ
فضیلت ہے بہت اس کو یہاں ہے سیدِ ہجویرؒ
کیا ہے سرنگوں باطل پرستوں، دشمنوں کو زیر
یہ کیا کم ہے اسی لاہور میں آسودہ ہے اقبالؒ
ستارہ ہے بلند جس کا مر کر بھی وہی اقبالؒ

قلندر کھینچتا ہے اپنی جانب لوگ آتے ہیں
جو آتے ہیں لحد پر اسکی اکثر فیض پاتے ہیں

مجھے بھی یہ شرف حاصل ہوا ہے شکر کرتا ہوں
قبر پر حاضری دی میں نے بھی اور حمد پڑھتا ہوں

وہ بھی کیا دِن تھے کہ جب ڈاکیہ چِٹھی لے کر آتا تھا

ڈاک اور ڈاک خانہ کی اہمیت ہر دور میں مُسلّم رہی ہے۔ زمانہ کبھی بھی ایک ہی ڈگر پر اور یکسان نہیں رہتا ہے۔ یہ دُور کی بات نہیں ہے بلکہ دو تین دہائیوں کی قبل کی طرف جب ہم چشم تصور سے جھانکتے ہیں تو صاف طور پر یہ نظر آتا ہے کہ آج کی جدید ترین سہولیات کی نسبت بہت کچھ ڈاک پر ہی منحصر ہوتا تھا۔ متوسطہ درجے کے لوگ عمومی طور پر بینکوں سے زیادہ اپنی چھوٹی چھوٹی رقمیں بچا کر ڈاک خانہ میں کھاتہ کھول کر ان رقوم کو محفوظ رکھتے تھے۔ Small Saving Scheme کے تحت اکثر غریب اور نادار لوگ اپنی بچت شدہ رقم کو ڈاک خانہ میں کھولے گئے کھاتوں میں ڈال کر بوقتِ ضرورت ایک بڑی رقم سے استفادہ کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہزاروں اور لاکھوں کی رقوم سے بھی کھاتہ کھول کر یہ معیاد بند سرٹفکیٹ کی صورت میں لوگ روپیہ جمع کرتے تھے۔ بچت بنک کے علاوہ ڈاک خانوں میں کثیر المقاصد خدمات میسر رہتی تھیں۔ جو کہ آج بھی بہت حد تک جاری وساری ہیں۔ مثلاً منی آرڈر بکنگ اور اس کی ادائیگی، ڈاک ٹکٹوں کی فروخت پوسٹل آرڈر، لائف انشورنس اور کچھ دیگر خدمات۔

مگر اس سب کے باوجود محکمۂ ڈاک کی چِٹھیوں کی ترسیل اور تقسیم کاری کی وجہ سے ہی اس کی اپنی ایک الگ پہچان رہی ہے۔ ڈاک کی شمولیات میں عام چِٹھیوں کے ساتھ رجسٹرڈ خطوط سپیڈ پوسٹ خطوط، پوسٹ کارڈ، درمیانی اور چھوٹے سائز کے رجسٹرڈ اور غیر رجسٹرڈ پیکٹز اور پارسل بھی آتے ہیں۔ ماضی قریب میں اس مقصد کی انجام دہی میں نہ کوئی پرائیویٹ ایجنسی ہوتی تھی اور نہ کسی قسم کی کوریر Courier سروس ہوتی تھی بلکہ یہ خدمات محکمۂ ڈاک میں کام کرنے والے اہلکار انجام دیتے تھے۔

ایسے پُر رونق دنوں کو یاد کرتے ہوئے یہی لگ رہا ہے کہ گویا سب کچھ کھو گیا ہے۔ کاروباری حضرات اور تجارت پیشہ لوگوں کی نظریں اکثر ڈاکیوں کی طرف لگی رہتی تھیں۔ اس زمانہ کے ڈاکیے بھی بڑے حساس اور ذمہ دار ہوتے تھے۔ ڈاکیوں کا محکمہ کی وردی میں ملبوس رہنا ایک معمول ہوا کرتا تھا۔ ڈاکیہ اپنی ڈیوٹی کے دوران خاکی رنگ کی وردی میں نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر خاکی رنگ کا دستار ہوتا تھا یا اسی رنگ کی ٹوپی ہوتی تھی جس پر محکمے کا برنگ سرخ نشان ہوتا تھا۔ محکمہ کی طرف سے اس کو چمڑے کا سیاہ رنگ کا مضبوط جوتا بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ڈاک وغیرہ رکھنے کے لیے ایک بیگ بھی دیا جاتا تھا۔ سردی کے موسم اور گرمی کے موسم میں الگ سے وردیاں فراہم کی جاتی تھیں۔ بارش میں کام آنے والے لمبے سائز کی برساتی بھی ڈاکیوں کو اپنے محکمے کی طرف سے فراہم کی جاتی تھی۔ سرکاری دفاتر، دکانوں اور بازاروں میں ڈاکیہ حضرات کی ایک الگ پہچان ہوتی تھی۔ کاروبار سے وابستہ اور دیگر متعلقین ڈاکیوں کے ساتھ احترام اور حُسنِ سلوک سے پیش آتے تھے اور نذرانے یا دیگر تحائف دے کر ان کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کو یہ خدشہ رہتا تھا کہ ناراضگی کی صورت میں کہیں ان کی متوقع چِٹھی یا ضروری دستاویز وغیرہ چھوٹ نہ جائے۔

محکمۂ ڈاک کے افسران بالا بھی بااختیار ہوتے تھے

اور اپنے فرائض منصبی کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے تھے۔ وہ بھی ہمہ وقت ڈاک کی نگرانی کرتے تھے اور اپنے ماتحت عملہ کو چاک وچوبند رکھتے تھے۔ بابو لوگوں کے ذمہ یہ ہوتا تھا کہ عام یا رجسٹرڈ ڈاک دفتر میں پہنچنے پر اس کو تاریخ رسید کی مہر لگا کر چھاپتے تھے۔ تا کہ چٹھی اور خطوط وغیرہ کی رسیدگی کی تاریخ بطور ثبوت موجود رہے۔ روزانہ بنیادوں پر اپنی اپنی مہر کی تاریخ بدل دی جاتی تھی اور ان کا Book of Post Marks پر ایک عکس لے کر دستخطوں کے ساتھ رکارڈ پر رکھا جاتا تھا۔

رجسٹرڈ خطوط کو گن کر ساتھ والی لسٹ کے ساتھ نمبروں کے ساتھ ایک ایک کر کے ٹِک کیا جاتا تھا اور یہ ایک کٹھن کام ہوتا تھا۔ پھر باضابطہ ان خطوط کو درج کر کے رسید کے تحت ڈاکیہ کے سپرد کیا جاتا تھا۔

ایسے خطوط کے لیے بہت سارے لوگ ڈاک خانوں پر بذاتِ خود آتے رہتے تھے۔ کیونکہ بہت سارے خطوط میں گراہکوں کے آڈر، سامان کی بلٹی یا ڈرافٹ ہوتے تھے۔ یہ رجسٹرڈ خطوط ان سے دستخط لے کر تقسیم کیے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور سپیڈ پوسٹ کا Volume بہت حد تک بڑھ گیا ہے۔ سپیڈ پوسٹ خطوط، پارسل، پیکٹ وغیرہ بھاری تعداد میں ڈاک خانوں میں موصول آج بھی ہوجاتے ہیں۔

عام قسم کی ڈاک گذشتہ وقتوں میں بھی بھاری تعداد میں آتی تھی اور بروقت تقسیم کی جاتی تھی۔ نام اور پتہ نامکمل ہونے کی صورت میں یہ ڈاک ایسے ہی ہفتوں پڑی رہتی تھی کہ کہیں کوئی ڈھونڈنے والا آجائے۔ بصورت دیگر ایسی ڈاک کو D.L.O (Dead Letter Office) یا R.L.O (Returned Letter Office) بھیجا جاتا تھا اور اس طرح اس کو ٹھکانے لگایا جاتا تھا۔ وہ زمانہ بھی یاد کرنے کے لائق ہے کہ جب یہاں سے حاجی حضرات سعودی عربیہ بغرضِ ادائیگی

وہ زمانہ بھی یاد کرنے کے لائق ہے کہ جب یہاں سے حاجی حضرات سعودی عربیہ بغرضِ ادائیگی حج روانہ ہوجاتے تھے۔ وہاں پہنچ کر وہ بذریعۂ خط اپنے گھر والوں اور عزیز و اقارب کو اپنی خیریت سے آگاہ کرتے تھے۔ اس دوران ڈاک خانہ جات میں لوگوں کی آمد و رفت ہوتی تھی اور وہ حاجی صاحبان کے خطوط کی تلاش میں ہوتے تھے۔ خط ملنے پر وہ بہت ہی خوش ہوجاتے تھے اور گھر پہنچ کر وہ احباب اور ہمسایوں کو یہ پیارے پیارے خطوط پڑھ کر سناتے تھے۔

حج روانہ ہوجاتے تھے۔ وہاں پہنچ کر وہ بذریعۂ خط اپنے گھر والوں اور عزیز و اقارب کو اپنی خیریت سے آگاہ کرتے تھے۔ اس دوران ڈاک خانہ جات میں لوگوں کی آمد و رفت ہوتی تھی اور وہ حاجی صاحبان کے خطوط کی تلاش میں ہوتے تھے۔ خط ملنے پر وہ بہت ہی خوش ہوجاتے تھے اور گھر پہنچ کر وہ احباب اور ہمسایوں کو یہ پیارے پیارے خطوط پڑھ کر سناتے تھے۔ والدین یا بہنیں اور دوسرے عزیز ان خطوط کو چومتے تھے اور کبھی کبھی خط کی عبارت سن کر وہ اشکبار بھی ہوتے تھے۔ جوابی خطوط میں سبھی لوگ رشتہ دار، ہمسائے وغیرہ کو سلام لکھنے کو کہتے تھے اور دعاؤں کی درخواست کرتے تھے۔ اسی طرح تاریخ میں انسانوں کے درمیان محبتوں اور عشق کا رشتہ بھی برقرار رہا ہے۔ آپسی محبتوں کے مارے اور ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار لوگ بھی خطوط کا سہارا لے کر ایک دوسرے سے پیار و محبت کرتے تھے۔ خطوط کی صورت میں وہ ایک دوسرے کو اپنی

صورت حال اور ان پر گذرے شب و روز کی کیفیات سے باخبر رکھتے تھے۔ ایسے خطوط کے لیے وہ باہمی طور پر تڑپتے تھے۔ کبھی وہ اپنے ہاتھ میں سوئی چبھو کر خون کے ایک قطرے سے ایک سطر یا دو سطریں تحریر کر کے محبتوں کا نذرانہ بھیجتے تھے۔ کبھی گلاب کی پنکھڑیوں کے ساتھ خط اندر ڈال کر اپنے محبتوں کی جوت جگاتے تھے۔

ان کی نظریں ڈاکیوں پر لگی رہتی تھیں۔ یہ زمانہ خطوط نویسی اور خطوط رسانی کا ایک انقلابی اور عجیب زمانہ تھا۔ مگر زمانے کا یہ سلسلہ کبھی ساکت و صامت نہیں رہتا ہے۔

سلسلہ روز و شب نقش گر حیات
سلسلہ روز و شب اصل ممات و حیات

موجودہ زمانے نے اپنی کروٹ بدل کر یہ سب کچھ بدل کے رکھ دیا ہے۔ آج نہ وہ خطوط آتے ہیں اور نہ لوگوں کا وہ شدید انتظار، آج دنیا انسان کے ہاتھ میں سمٹ کے آئی ہے۔ انٹرنیٹ اور دیگر ذرائع نے یہ سب کچھ ماضی کی داستانوں میں رکھا ہے۔ خطوط نویسی پھر جوابی خطوط، انتظار، کشمکش، ڈاکیوں اور ہرکاروں کی وہ پھرتی احساس ذمہ داری، ربط وضبط۔ یہ ایک قصۂ پارینہ نظر آتا ہے۔ ڈاک خانے عام قسم کی ڈاک سے بہت حد تک سبکدوش ہو گئے ہیں۔ ڈاک ڈبے Letter) (Boxes ایسے ہی خالی اور رنگ و روغن سے عاری نظر آتے ہیں۔ بہت سارے ڈاک ڈبے تالوں اور Time Plates کے بغیر دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاک خانوں میں وہ گرماہٹ کھوئی کھوئی سی لگتی ہے۔ کیا ماتحت اور کیا افسران بالا یہ سب کمپیوٹر پر مصروف نظر آتے ہیں۔

سمٹ گئے ہیں سبھی علم انگلیوں میں میری
اس آگہی نے تو جاہل بنا دیا ہے مجھے
(شمس کمال انجم)

خطوط، پوسٹ کارڈ، اخبارات اور رسالہ جات کو الگ الگ چھانٹتے ہوئے بے رنگ چٹھیوں (بغیر ٹکٹ لگے ہوئے) کو الگ سے نکال کر ڈاکیہ حضرات کو درج کر کے دیا جاتا تھا اور ان کے علاقہ جات سے واپس لوٹنے پر ایسے چٹھیوں پر وصول شدہ رقم کو دفتر کے روزانہ اکونٹ میں باضابطہ درج کیا جاتا تھا گو کہ اس سسٹم میں بعد میں کچھ تبدیلیاں بھی لائی گئی تھیں۔

ڈاک رسانی اور اس کی تقسیم کاری کا ایک مضبوط اور قابل مواخذہ طریقہ کار تھا۔ کسی بھی عام چٹھی یا رجسٹرڈ چٹھی وغیرہ کی تقسیم نہ ہونے کے اس کی پشت پر ڈاکیہ کی طرف سے وجوہات لکھے جاتے تھے اگر چہ یہ طرزِ عمل آج بھی قانونی طور پر موجود ہے مگر بہت حد تک یہاں کے رواں نا مساعد سیاسی حالات سے ذمہ داریوں کا احساس بہت کم ہو گیا ہے۔ اکثر و بیشتر ملازمین اور افسرانِ بالا بس دن بھر کمپیوٹر کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ راقم الحروف کی نظر میں پرانا سسٹم کمزور نظر آرہا ہے۔ راقم (بشیر شاکر) کے نام ایک رجسٹرڈ خط زیر نمبر RE899108197 مورخہ 14-10-2020 کوٹھی باغ سے میرے گھر تک (15 کلومیٹر کا سفر) پہنچنے میں 9 دن لگ گئے۔ جب کہ زمانہ قدیم میں اگر آج لاہور یا راولپنڈی سے چٹھی روانہ کر دی جاتی تھی تو یہ چٹھی زیادہ سے زیادہ دوسرے یا تیسرے دن سرینگر میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ ایسے ہی دہلی سے ارسال کردہ ایک رجسٹرڈ پیکٹ مورخہ 16-6-2020 مجھے آج تک یعنی 5 مہینے گذرنے پر بھی نہیں ملا ہے اور نا ہی یہ فریسندہ کو واپس پہنچ گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ موجودہ جدید ذرائع کے ساتھ ساتھ ایسے دور دراز دیہات اور پس ماندہ علاقہ جات کی طرف بھی ڈاک سہولیات میسر کرنے کی طرف توجہ دی جائے جہاں جدید قسم کی آسانیاں مثلاً کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ای میل جیسی خدمات کا فقدان ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی بحیثیتِ مدوّن کلیاتِ حالی

اردو زبان نے اگرچہ زمانۂ ماضی میں بہت سارے ادیب، افسانہ نگار، انشاء پرداز اور شعرائے کرام پیدا کیے ہیں جن کی ادبی خدمات سے اردو زبان و ادب کا گلستاں صدیاں گذرنے کے باوجود آج بھی لہلہاتا نظر آتا ہے۔ ان سخنورانِ ادب کی کاوشوں سے آج بھی زمانہ فیض رسانی حاصل کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ماضی قریب اور عصرِ رواں میں اس ہر دلعزیز اور دلکش زبان کے حصے میں ایسے ایسے ادیب آگئے ہیں جن کی قلم کاری اور علمی و ادبی نگارشات سے اردو زبان کا یہ مہکتا ہوا گلشن سرسبز و شاداب ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ عصرِ رواں کے انہی جگمگاتے تاروں کی کہکشاں میں سید تقی عابدی بھی ہیں جنہوں نے اپنی مہارت اور زبان دانی سے اپنا نام روشن کیا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ادبی شخصیت کے بارے میں راقم السطور کو بالکل کوئی واقفیت اور جانکاری نہیں تھی۔ بس اتنا ہے کہ جب برصغیر کے نامور ادیب پروفیسر اکبر حیدری صاحب نے ۲۰۰۶ء میں اپنے ماہانہ رسالہ حکیم الامت کا اجرا عمل میں لایا تو آنجناب کے حسب ارشاد ناچیز راقم نے بھی اس کی ممبر شپ خریداری کا ذمہ لیا۔ الحمد للہ اس مؤقر رسالہ کے تاریخ اجرا سے آج تک برابر اس کے مطالعہ سے فیض پاتا رہا ہوں۔ بلکہ اپنی محدود صلاحیت کے مطابق راقم کے کچھ ادبی مضامین اور منظومات بھی اس جریدہ کے مختلف شماروں میں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ اسی رسالہ حکیم الامت کی وساطت سے مجھے وقتاً فوقتاً ڈاکٹر سید تقی عابدی کے مضامین پڑھنے کا موقع ملتا رہا اور ان کے بصیرت افروز اور پُر مغز مضامین بلکہ شعریات سے مستفید ہو کر میں ذہنی طور پر موصوف کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ حکیم الامت رسالہ کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ یہ ہر شمارے میں لکھنے والے قلم کاروں اور شاعروں کی تصاویر کو بھی چھاپتا رہا ہے اور اس طرح بار بار ڈاکٹر تقی عابدی کی خوب صورت تصویر دیکھ کر میرے دل و دماغ میں ان کے چہرے بشرے کا ایک نقشہ بیٹھ گیا ہے۔

اپنے اس زیر تحریر مضمون میں یہ بھی لکھتا جاؤں کہ جناب ڈاکٹر تقی عابدی سال ۲۰۱۰ء میں وارد کشمیر ہوئے تھے اور ان کے اعزاز میں سرینگر کے ایک ہوٹل میں ایک پُر وقار تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ مئی ۲۰۱۰ء کی ۳۱ ویں تاریخ تھی۔ پروفیسر اکبر حیدری کے فرزند ارجمند ڈاکٹر محمد ظفر حیدری موجودہ ایڈیٹر حکیم الامت نے مجھے بھی اس پُر رونق تقریب میں حاضر ہونے کی دعوت دی تھی مگر اسی تاریخ (۳۱ مئی ۲۰۱۰ء) کو میری ملازمت سے سبکدوشی کا دن تھا اور میں اپنے ملازمتی فرائض منصبی سے فراغت پانے والا تھا۔ میرے دفتر میں بھی اس یادگاری موقع کی مناسبت سے ایک الوداعی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے میرے لیے تقی عابدی کی محفل احباب میں شرکت ناممکن بن گئی تھی اور میں اس عظیم المرتبت ادب نواز اور اقبال شناس کی روبرو ملاقات سے محروم رہا۔

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان ابتدائی اور تمہیدی کلمات کے بعد اپنے موضوع گفتگو کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتا ہوں اور نامور ادیب کی ادبی خدمات پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی دیگر تصانیف کے ساتھ ساتھ محسنِ قوم وملت مرحوم الطاف حسن حالیؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر خصوصی اشاعت یعنی کلیات حالیؔ کو مدوّن کر کے منظر عام پر لایا ہے اور اس طرح ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بھی مولانا حالیؔ کے چاہنے والوں اور علم وادب سے وابستہ حضرات اور ناشرین نے کلام حالیؔ کو چھاپ کر کچھ حق ادائی کی ہے۔ مگر میری رائے میں جس طرح کا یہ کام ڈاکٹر تقی عابدی نے انجام دیا ہے' وہ کچھ اور ہی بات ہے۔ یہ کتاب یعنی کلیات حالیؔ ایک ضخیم کتاب ہے جو ۱۲۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب جلد بند ہے اور سیاہ رنگ کے جاکٹ کور کے ساتھ مزّین ہے۔ جلی حروف میں 'کلیات حالیؔ' کے نیچے یہ شعر درج ہے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

پھر مولانا حالیؔ کی تصویر نظر آتی ہے اور وہ سرخ رنگ کی ٹوپی پہنے ہوئے اپنے گلے میں گلوبند پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے۔ تحقیق' تدوین و تشریح..... ڈاکٹر سید تقی عابدی۔

یہ دیدہ زیب کتاب دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ کی طرف سے شائع شدہ ہے۔ ایک دو ورق چھوڑ کر ہی اردو زبان کے اس محسن کے تعارف کے سلسلے میں قارئین کرام کے مطالعہ کے لیے درج ذیل احوال لکھ دیئے گئے ہیں:

☆۔ نام: سید تقی حسن عابدی
☆۔ ادبی نام: تقی عابدی
☆۔ تخلص: تقی
☆۔ والد کا نام: سید سبط نبی عابدی مرحوم
☆۔ تاریخ پیدائش: یکم مارچ ۱۹۵۲ء
☆۔ مقام پیدائش: دہلی
☆۔ پیشہ: طبابت
☆۔ ذوق: شاعری' ادبی تحقیق وتنقید
☆۔ قیام: ہندوستان' ایران' برطانیہ' نیویارک' کینیڈا

اس کے بعد اور بھی کچھ معلومات ہیں جن کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے بارے میں اسی شخصی تعارف کے بعد کتاب میں ایک فہرست مرتب کی گئی ہے جس کے باب اول میں مولانا حالیؔ مرحوم کے بارے میں ابتدائیہ شخصیت وفن کے عنوان کے تحت درج ذیل سرخیاں ہیں۔

عکس مولانا حالی:

اس کے تحت اس ضخیم کتاب کے صفحہ نمبر ۳۶ پر مولانا حالیؔ بیٹھ کر ایک چادر اوڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے پیچھے شلفوں پر کچھ کتابیں ہیں اور تصویر کے نیچے مولانا الطاف حسین حالیؔ مشہور مصور آفتاب ظفر کی نظر میں لکھا ہوا ہے۔ صفحہ نمبر ۳۶ پر حالیؔ کی ایک خوش نما تصویر ہے اور اس کے نیچے مولانا الطاف حسین حالیؔ ۱۸۳۶۔ ۱۹۱۴ء تحریر ہے۔ صفحہ نمبر ۳۷ پر راست سے چپ۔ مولانا حالیؔ' ڈپٹی نذیر احمد' محسن الملک' وقار الملک' تھامس آرنلڈ' شبلی نعمانی کی تصاویر ہیں۔ صفحہ نمبر ۳۸ پر مولانا حالیؔ مرحوم کا عکس تحریر ہے جو کہ موجودہ دور کے عرائض نویس کی تحریری صورت میں ہے اور عام آدمی کے لیے اس کا پڑھنا قدرے محال ہے اس کے بعد صفحہ نمبر ۳۹ پر سرسید اور حالیؔ کی تصویروں کے نیچے یہ سرخی ہے عکس مکتوب سرسید بنام مولانا حالیؔ۔ اس کا پڑھنا بھی مشکل ہی نظر آتا ہے مگر جناب تقی عابدی نے علم دوستی کے جذبے کے تحت کتاب ہٰذا کے صفحہ ۴۰ پر اس کی کمپیوٹر کتابت کرا کے عام قارئین کے لیے صاف وشفاف طرز تحریر سے چھپوایا ہے۔ اس صفحہ کے آخر پر بھی باریش بزرگ سرسید احمد خان کی تصویر چھپی ہے۔ یہ مکتوب ۱۰ جون ۱۸۷۹ء کا تحریر شدہ

ہے۔اس کے بعد کتاب کے صفحہ نمبر ۴۲ پر شجرہ مولانا حالیؔ درج کیا گیا ہے۔

اس طرح کتاب ''کلیات حالیؔ'' کے ان ابتدائی صفحات کو دیکھ کر مطالعہ کرنے والے حضرات کی توجہ ایک صدی سے زیادہ قبل کے زمانے کی طرف مرکوز ہو جاتی ہے اور ایک حساس دل و دماغ رکھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ زمانے کی آغوش میں کیسے کیسے لعل و گوہر اور دُر ہائے تابدار رہے ہیں جنہوں نے اپنی محبتوں اور اپنی قلمی جولانیوں سے بہت سارے انمٹ اور یادگاری نقوش چھوڑے ہیں۔

جناب تقی عابدی کا یہ کام کیا کم ہے کہ انہوں نے ان تصاویر اور نایاب نگارشات و تحریرات کو بازیافت کر کے قارئین ادب کے شوق کو مہمیز کرنے کی کوشش کی ہے۔حالانکہ دیدہ ور اور شاعر مشرق علامہ اقبال نے بھی مولانا حالی کی ادبی عظمتوں کا اعتراف کیا ہے اور انہیں اپنا خراج عقیدت پیش کیا ہے

مشہور زمانے میں ہے نام حالیؔ
معمور مے حق سے ہے جام حالیؔ

آج کے اسی چاپلوسی اور خود غرضانہ دور میں مولانا حالیؔ یا سرسید جیسے مفکر ملت درِ دل رکھنے والے نظر نہیں آئیں گے۔جنہوں نے بلا لالچ قوم و ملت کی خدمات انجام دینے کی غرض سے اپنے خون جگر سے ملت بیضاء کے عروج و ارتقاء کے لیے اپنے شب و روز میں انتھک محنت کی تھی۔ان جیسے رہنمایانِ ملت کی عظمتوں کے سامنے ہمارے سر آج بھی جھک جاتے ہیں۔

کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر تقی عابدی نے مولانا حالیؔ کی عالمانہ شخصیت کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مرزا غالبؔ اور شیفتہؔ کے شاگرد رہے تھے یعنی:

حالیؔ سخن میں شیفتہؔ سے مستفید ہے
غالبؔ کا معتقد ہے، مقلد ہے میر کا

محمد حسین آزادؔ، شبلیؔ، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کے مصاحب رہے تھے۔حالیؔ تنقید اور جدید نظم کے پیشوا بھی تھے۔نثری کارناموں میں وہ حیات جاوید، حیات سعدی اور یادگار غالب اپنے پیچھے چھوڑ گئے اور شعر و شاعری کے میدان میں مولانا حالیؔ نے ساڑھے نو ہزار اشعار قلم بند کیے تھے۔مگر مولانا حالیؔ کا اصلی کارنامہ شعر و ادب میں جدت و مقصدیت اور سماجی شعور کو بیدار کرنا ہے جو ان کا منظمح نظر تھا۔

اس عنوان یعنی پیش لفظ کے تحت تقی عابدی رقم طراز ہیں کہ حالیؔ نے اپنی زندگی کے آخری سال یعنی ۱۹۱۶ء میں اپنی فارسی و عربی نثر و نظم کا مجموعہ ضمیمہ اردو کلیاتِ نظم حالیؔ مرتب کر کے شائع کیا۔مگر کلیات کی ترتیب اور طباعت نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی اس بیش بہا کتاب کے صفحہ نمبر ۵۳ پر حالیؔ کی کہانی حالیؔ کی زبانی کے تحت ایک اور مضمون درج ہے جو کہ نواب عمادالملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کی فرمائش سے لکھی گئی تھی۔اس میں مولانا حالیؔ اپنی ولادت اور دوسری سوانحی کیفیات سے اپنی خود نوشت رقم کرتے ہیں۔دیباچہ دیوانِ حالیؔ دیباچہ مسدس مدوجزر اسلام دیباچہ متعلق بہ ضمیمہ مسدس مدوجزر اسلام مرقومہ ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء دیباچہ نظم حالیؔ (مولانا حالیؔ) مرقومہ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ئ ء دیباچہ ضمیمہ اردو کلیات و نظم حالیؔ (مولانا حالیؔ) کے مضامین کے بعد مولانا حالیؔ کی حیات اور شخصیت والا عنوان کتاب میں موجود ہے۔اس عنوان کے تحت مولانا حالیؔ کا نام، تخلص، تاریخ ولادت، مقام ولادت، والد، والدہ، دادا، پردادا، جد خاندان، بھائی بہن کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔سوانحی تفصیلات پر مبنی یہ مضمون طویل ہے اور ۴۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔اس میں اور باتوں کے علاوہ اس درددل رکھنے والے شاعر کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں لکھی گئی ہیں۔مثلاً تلاشِ علم

شریک حیات، اولادیں، حالی اور فیملی، اخلاق و کردار، نوکروں سے برتاؤ، مذہب، قناعت، مسافرت، شمس العلماء کا خطاب، پوشاک، خوراک، آغاز شاعری، پڑھنے کا انداز، شیفتہ کی مصاحبت، جیسی سرخیاں لگا کر تحقیق کرنے والے اسکالروں کے لیے کتاب کا یہ مضمون بہت ہی معلوماتی اور کارآمد ہے۔ ان چیزوں کی تفصیل میں جا کر یہ اندازہ لگانے میں کوئی مشکل نظر نہیں آتی کہ صاحب کتاب نے کس محنت شاقہ سے کام لیا ہوگا اور کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہوں گے۔ جبھی تو اتنی معلومات پر مشتمل کلیات حالی ترتیب دی گئی ہے۔

مولانا حالی کی سوانح اور شعر و شاعری پر مشتمل اس گنجینۂ علم و ادب کے صفحہ نمبر ۱۳۱ / پر ایک عنوان کی سرخی ہے۔ ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' اس عنوان کے تحت ڈاکٹر تقی عابدی نے ان باتوں کا جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ حالی نے اپنی ۷۷ سالہ زندگی میں بہت سے مثبت کام کیے اور بہت سے کام گردش دوراں سے نہ ہو سکے۔ ان میں سے چند ایک کا بیان اس طرح درج کیا گیا ہے۔

۱۔ حالی چاہتے تھے کہ دہلی میں ایک بڑا مطبع جاری کریں جس میں عمدہ مصنفوں کی کتابوں کو شائع کیا جائے۔ قدما کی عربی اور فارسی تصنیفات جو شائع نہیں ہوئیں نہایت حسن اہتمام کے ساتھ چھپوایا جائے اور ایک ماہانہ رسالہ بھی اجرا کریں جس میں ہندوستانیوں کو یورپ کی ترقیات کی طرف مائل کریں۔ یہ آرزو پوری نہ ہو سکی کیونکہ اس عمدہ کام کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی جو حالی کے پاس نہ تھا۔

۲۔ اردو زبان کی تذکیر و تانیث کے اصول مرتب کر کے ایک کتاب لکھنے کا خیال پورا نہ ہو سکا۔

۳۔ عمدہ ناول اور شاہکار ڈرامے جو دوسری زبانوں میں ہیں ان کو اردو میں ترجمہ کروانا چاہتے تھے جو نہ کر سکے۔

۴۔ حالی عورتوں کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجہ دیتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے پانی پت میں اپنے خاندان اور ہمسائے کی لڑکیوں کے لیے ایک مکتب کھولا لیکن بہت جلد استانی کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ مکتب بند ہو گیا۔

بیماریاں والی سرخی کے تحت تقی عابدی تحریر کرتے ہیں کہ:

''حالی جوانی سے کئی امراض سے دوچار تھے اس کی وجوہات ان کی صحت کی دیکھ بھال سے غفلت، ورزش وغیرہ سے دوری اور پان تمباکو اور حقے کا استعمال تھا، چونکہ طبیعت میں اعتدال تھا اس لیے ان تمام مسائل کے باوجود اپنے زمانے اور مقام کے لحاظ سے اچھی عمر بسر کی''۔

جوانی میں اس حال نے بہت کمزور کیا تھا۔ اسی زمانے میں انہیں بواسیر کی بھی شکایت تھی، نزلہ کھانسی، دمہ اور سانس کی تنگی شاید تمباکو اور حقے کے استعمال کے باعث برونکائٹس کے سبب ہو۔ حالی کے اپنے بازو میں درد و سوزش کی وجہ سے پلاسٹر وغیرہ بھی لگایا گیا تھا۔ سوزشِ سینہ اور دردِ معدہ قلب کی وجہ سے ہو سکتا تھا۔ دانتوں کی تکلیف، مسوڑھوں میں سوجن وغیرہ دانتوں کی حفاظت سے غفلت اور پان وغیرہ کے باعث تھی۔ کم خونی بے وجہ فصد کھولنے کے باعث تھی۔ نیند کا کم ہونا دماغی Stress یا کم قوتی کا سبب ہو سکتی ہے۔ چونکہ محترم تقی عابدی صاحب بذات خود طبابت کے پیشہ سے وابستہ ہیں اس لیے اپنے تجربات اور مہارت کی بناء پر آپ نے حالی کی بیماریوں کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کیا ہے۔

مرض الموت:

اس سرخی کے تحت مولانا اسماعیل پانی پتی، خواجہ عبدالحمید اور صالحہ عابد حسین کی تحریروں سے حالی کے آخری زمانے کے حالات کی

واقفیت ہوتی ہے اور آخر کار ۳۱ دسمبر 1914ء رات کے ایک بجے حالیؔ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

انتقال کے بارہ گھنٹے بعد یعنی یکم جنوری ۲ بجے دن حالیؔ کو شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کی درگاہ میں مدفون کر دیا گیا۔ حالیؔ کے لوحِ مزار پر علامہ اقبالؔ کا فارسی شعر کندہ ہے:

طوافِ مرقد حالیؔ سزد ارباب معنی را
نوائے او بہ جانہا فگند شوری کہ من دارم

یعنی حالیؔ کی قبر کا طواف اہلِ فہم کو جچتا ہے کیونکہ ان کے کلام کی آواز لوگوں کی زندگی میں انقلاب بپا کر دیتی ہے جس سے میں واقف ہوں۔ پھر کتاب کے صفحہ نمبر ۱۳۸ پر حالیؔ کے (منظوم کلام) جدول اشعار حالیؔ درج ہے۔

اس کے بعد باب دوم سے لے کر کتاب کے آخر تک اس بلبل ہزار داستان یعنی الطاف حسین حالیؔ کا منظوم کلام مختلف عنوانات کے تحت غزلیات، نظمیں، رباعیات، قصائد و مراثی جمع کر کے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ درج کر کے اس سارے کلام کو کتاب کی زینت بنایا گیا ہے۔

اس ضخیم ترین، مبسوط اور پر از معلومات کتاب کو دیکھ کر اور پڑھنے کے بعد شیدائیاں مولانا حالیؔ اور علم و ادب کے میدان میں سرگرداں پھرنے والے اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر تقی عابدی جیسا صحرا نورد کس طرح آبلہ پا ہو کر اور علم و ادب کی خارزاروں کی خاک چھان کر ایسی پُر بہار کتاب لکھنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ طبابت کے پیشے سے وابستہ رہنے کے باوجود بھی تعالیٰ نے اس کو موجودہ زمانے میں لیلائے اردو کی پریشاں حال گیسو سنبھالنے اور سنوارنے کی توفیق بخشی ہے۔ مولانا حالیؔ کی ذاتی اور ادبی کارناموں پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ عظیم کتاب ایک راہنمایانہ رول ادا کر سکتی ہے۔ بقول اقبالؔ:

راقم السطور یعنی شاکرؔ ایک بہترین علمی کتاب ڈاکٹر تقی عابدی بطور اقبالؔ شناس کے مطالعہ سے بھی بہرہ ور ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اقبالیاتی ادب اور سوانح اقبالؔ پر گہری نظر ہے اور آپ نے اس جہت سے بھی قابل قدر کام انجام دیا ہے۔

ڈھونڈنے والوں کو ہم نئی دنیا بھی دیتے ہیں

اس کے علاوہ بھی اس ادبی شہسوار کی اور بھی بہت ساری تصانیف ہیں جن کو پڑھ کر بھرپور استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: شہید، جوش مودّت، اقبالؔ کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خان انشاؔ، رموز شاعری، ابواب المصائب، مصحف فارسی دبیرؔ، روپ کنوار کماری، دربار رسالت، غالبؔ دیوان نعت و منقبت، چوں مرگ آید، حالیؔ فہمی، دیوان غالبؔ فارسی، دو شاہکار نظمیں وغیرہ۔

راقم السطور یعنی شاکرؔ ایک بہترین علمی کتاب ڈاکٹر تقی عابدی بطور اقبالؔ شناس کے مطالعہ سے بھی بہرہ ور ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اقبالیاتی ادب اور سوانح اقبالؔ پر گہری نظر ہے اور آپ نے اس جہت سے بھی قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ جب تک اردو زبان کو تقی عابدی جیسے اشخاص میسر ہیں تب تک زمانے کی تند و تیز ہوا کے زہریلے جھونکوں سے اس کو تحفظ ملتا رہے گا۔ انشاء اللہ۔

ورق تمام ہوا مدح ابھی باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

پروفیسر اکبر حیدری مرحوم کی یاد میں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

یوں تو راقم السطور پروفیسر اکبر حیدری کی میٹھی یادوں سے اکثر اپنے ذہن ودِل کو بہلاتا رہتا ہے مگر اس فنا پذیر دنیا کے دھندوں اور افکار و پریشانیوں میں الجھ کر میری توجہ اور چیزوں کی طرف بھی مبذول ہوجاتی ہے اور ایسی الجھنوں کو سلجھانے کی فکر بھی مجھے دامن گیر ہوجاتی ہے۔ مگر حال ہی میں سرینگر سے شائع ہونے والے ماہوار رسالے یعنی حکیم الامت کے قابلِ احترام ایڈیٹر جناب ڈاکٹر ظفر حیدری نے اپنے والد گرامی پروفیسر اکبر حیدری کی یاد میں اس موقر رسالے کا خصوصی شمارہ محقق اعظم ''پروفیسر اکبر حیدری'' نکال کر میری گذشتہ یادوں اور میرے جذبات کو از سرِ نو مہمیز کر کے مجھے کچھ لکھنے پر آمادہ کیا۔ اور اردو زبان وادب کے سرپرست اور محسن کی یادوں کو میرے دل میں تازہ کردیا۔

دراصل یہ آج سے کوئی اٹھارہ سال یعنی سن ۲۰۰۴ء کی بات ہے کہ میں نے کلچرل اکیڈمی سرینگر سے ماہانہ شائع ہونے والے شیرازہ اردو کے ایک شمارے میں پروفیسر اکبر حیدری کا ایک شائع شدہ مضمون 'اقبال اور شاد حیدر آبادی' پڑھا تھا۔ اس مضمون میں موصوف نے حیدر آباد میں منعقد ہونے والے ایک اردو مشاعرے کا بھرپور ذکر کیا تھا۔ ذکر کرنے کی بات ہی کیا ہے بلکہ اس مشاعرے کی کارروائی اور اس میں موجود شعرائے کرام کا بہت ہی خوبصورتی اور دلچسپی کا اس طرح حال احوال قلمبند کیا تھا کہ پڑھنے والا دھنگ رہ جاتا تھا اور وہ خود کو اس تاریخی اور شاندار مشاعرے کو ایک حصہ تصور کرتا تھا۔ ان دنوں میں ملازمت کرتا تھا۔ دوسرے روز وادی کے معروف اور سربرآوردہ کشمیری شاعر گیان پیٹھ رحمان راہیؔ صاحب بھی میرے دفتر میں کسی دفتری ضرورت کی بناء پر حاضر ہوئے تھے اور انہوں نے بھی مجھ سے ہمکلام ہو کر اسی موضوع پر گفتگو کر کے پروفیسر اکبر حیدری کی قلمکاری کی سراہنا کی تھی۔ بہر کیف مضمون کی اہمیت اور دلچسپی سے متاثر ہو کر میں نے پروفیسر اکبر حیدری کی خدمت میں براہ راست ایک عریضہ تحریر کر کے روانہ کیا تھا۔ جس کے جملے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

''حرف آغاز کے بعد آنجناب کا مقالہ بعنوان اقبال اور شاد حیدر آبادی شروع ہوجاتا ہے۔ راقم نے شمارہ میں درج دو چار مقالات پڑھنے کے بعد اس مقالہ کا مطالعہ شروع کیا۔ دوران مطالعہ کس قدر لطف اندوز ہوگیا وہ میرے بیان سے باہر ہے۔ آپ کا تحریر کردہ مقالہ بہت ہی قابل قدر ہے بہت ساری معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ راقم کو شاد حیدر آبادی سے متعلق کوئی واقفیت نہیں تھی۔ ان کی عالمانہ اور صوفیانہ شخصیت سے کما حقہٗ واقف ہوگیا۔ مشاعرے میں ان کے ناز و ادا کے ساتھ خراماں خراماں تشریف لانا واہ! یقیناً پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ علامہ اقبال اور شاد حیدر آبادی کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ وہ بھی بے تکلف دو دوستوں کے درمیان اپنی اپنی اور گھریلو زندگی کے حالات و کوائف ایسی خط و کتابت چھپوا کر آپ نے اس تاریخی دستاویز کو مجھ جیسے کم علم اور عام قارئین تک پہنچا کر محظوظ کیا ہے۔ کتنی گرہیں کھلتی ہیں۔ راقم کے اس ناچیز خط کے جواب میں

جناب اکبر حیدری کے خط سے درج ذیل چند جملے قارئین کے مطالعہ کے لیے نقل کیئے جاتے ہیں۔

جناب بیگ صاحب 22.3.2004 تسلیمات

گرامی نامہ مورخہ ۲۶ جنوری سال رواں تقریباً تین مہینے کے بعد مجھے موصول ہوا۔ یاد آوری کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ میں ۱۸ مارچ سرینگر پہنچ گیا ہوں۔ پہنچتے ہی آپ کا خط دیکھ کر مسرت ہوئی۔ خط کا جواب دینا میرا اخلاقی فرض ہے۔ آپ نے جوابی لفافہ لکھ کر مجھے شرمندہ کیا۔ آئندہ ایسی زحمت نہ کریں۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ کو میرا مضمون 'اقبال اور شاد حیدر آبادی' پسند آیا۔ حالانکہ اس میں کتابت کی غلطیاں در آئی ہیں۔ میری کتابیں اور مضامین زیادہ تر پاکستان میں چھپتے ہیں۔ اب تک ستر (۷۰) سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ مضامین کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے۔ جب آپ کسی دن غریب خانے پر تشریف فرما ہوں گے تو اپنی آنکھوں سے یہ چیزیں دیکھ سکتے ہیں۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ آپ کے خط سے ہی مجھے معلوم ہوا ہے میرا متذکرہ بالا مضمون شیرازہ میں شائع ہوا ہے۔ میں نے کتاب گھر، لال چوک سے بیس روپے میں منگوایا۔ اس کے لیے کس سے شکایت کروں۔ کون کسی کی سنتا ہے۔۔۔۔

جناب پروفیسر اکبر حیدری کے ان جوابی جملوں سے قارئین کرام بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ مرحوم میں کس قدر خوبیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اخلاق حمیدہ کی دولت سے نوازا تھا۔ یہ مقام غور و فکر ہے کہ ایک طرف دبستان اردو و فارسی وغیرہ میں ان کا اتنا اعلیٰ مقام۔ اتنی کتابوں کے مصنف۔ مضامین نویسی اور مقالہ جات کا انبار۔ بڑے بڑے ادیبوں اور محققوں میں ان کی تحقیق معتبر تحقیق اور دوسری طرف اس قسم کی ندامت اور انکساری کہ مجھ جیسے ادنیٰ قلمکار اور ہیچمید ان کے خط کا مشفقانہ اور حوصلہ افزا جواب۔

میری نظروں میں ایسے بھی ادیب اور دانشور ہیں کہ وہ کسی کے خط کا جواب لکھنا اپنی کسر شان سمجھتے ہیں۔ بلکہ سلام کے جواب میں ہوں ہاں کر کے اپنی بڑائی جتاتے ہیں۔ اللہ ان پر رحم کرے۔

میں وثوق کے ساتھ یہ لکھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ پروفیسر حیدری صاحب سے ان کی دو عظیم اور شاندار کتابیں :

(۱) اقبال نادر معلومات (۲) اقبالیات کے نئے گوشے جو کہ حضرت علامہ اقبال کی زندگی و علمی اور ادبی کارناموں پر مشتمل ہیں اور یہ دونوں کتابیں اردو ادب میں شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔

جب راقم نے رسم رونمائی کے بعد ان سے ان دونوں کتابوں کی فرمائش کی تھی تو آپ نے بالکل صاف دلی اور کسی لیت و لعل کے بغیر ان کی قیمت ادا کرنے کی بات کہی تھی۔ چنانچہ اقبالیات کے عشق میں، میں نے حامی بھر لی اور مطلوبہ رقم ان کو روانہ کر کے دونوں کتابیں حاصل کی تھیں تو پھر ٹیلیفون کر کے آپ نے مجھے یہ کہا تھا کہ بھائی شاکر آپ یہی سمجھیں کہ آپ نے عشق اقبال میں اپنی محنت سے کمائی رقم صرف کی ہے۔ اور میں نے بھی دل کی گہرائی سے اس بات کی تصدیق کی تھی۔ اسی طرح آپ نے اپنے جاری ہونے والے رسالہ حکیم الامت کی اجرائی سے پہلے ہی مجھ سے اس کا سالانہ فیس ادا کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور بصد شوق میں نے یہ سالانہ چندہ بھی پہلے ہی بعوض رسید حیدری صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔ بحمد اللہ ۲۰۰۶ء سے جاری ہونے والے اس حکیم الامت کے عنوان سے معنون ہونے والے ادبی اور علمی رسالے سے میں برابر مستفید ہوتے آیا ہوں۔ اور اس میں مجھ جیسے کم سواد کے بھی بہت سارے مضامین اور منظومات چھپ چکے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پروفیسر حیدری کے اکثر و بیشتر لکھے گئے اقبالیاتی مضامین سے اس ماہنامہ رسالے نے اپنی

الگ پہچان بنائی ہے جس کا اعتراف برصغیر میں رہنے والے یا باہر رہنے والے اقبال شناس اور دیگر ادبی شخصیات نے اپنے مکتوبات کے ذریعہ کیا ہے جو کہ حکیم الامت کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔ یہ نیک اور بارآور کام کر کے حیدری مرحوم نے تحقیق کاروں اور اردو ادب میں نئے وارد ہونے والوں کے لیے راستہ متعین کیا ہے چنانچہ بہت سارے سکالرز اس رسالہ کے پرانے رسالوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور اس کے موجودہ اڈیٹر کو خطوط وغیرہ لکھتے ہیں مگر نایابی کی وجہ سے موجودہ اڈیٹر ان کی خواہشات کو پورا کرنے سے معذرت خواہ نظر آتے ہیں۔

حیدری مرحوم نے اپنی حیات مستعار میں اقبالیات سے وابستہ رہ کر کئی کارنامے انجام دیئے ہیں مثلاً اس حوالہ سے ان کی کچھ کتابیں تحریر میں آئی تھیں۔ مثلاً اقبال احباب اور آثار اقبال اور زمانہ کانپور۔ معرکۂ اسرارِ خودی۔ مگر ''بہت نکلے میرے ارمان پھر بھی کم نکلے'' کے مصداق ان کی زندگی میں یہ کتابیں منظر عام پر نہیں آسکیں۔ مگر جہاں کوئی بھی کام نیک نیتی اور خلوص و محبت کی بناء پر انجام دیا گیا ہو وہ ایک نہ ایک دن ضرور اپنا رنگ لاتا ہے۔ اور مرنے والے کے لیے سرمایۂ آخرت بن جاتا ہے۔ بقول اقبالؒ:

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر بادہ و جام سے گزر

موصوف کی وفات کے بعد ان کے فرزند ڈاکٹر ظفر حیدری نے معرکۂ اسرار خودی اور اقبال اور زمانہ کانپور والے دونوں مسودات کو اپنے خصوصی رسالہ جات حکیم الامت کی شکل میں محنت شاقہ سے شائع کیا اور منتظر قارئین اور تشنہ گانِ اقبالیات کی پیاس بجھائی۔ جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی نے اقبال، احباب و آثار شائع کی۔ مگر بدقسمتی سے بہت سارے سال گزرنے کے باوجود بھی اکیڈمی اس گرانمایہ اور بیش بہا کتاب کی دوسری جلدیں شائع کرنے سے بالکل قاصر رہی ہے۔ کاش اکیڈمی کے ارباب اقتدار اپنا وعدہ نبھا کر اس اقبالیاتی کتاب کی دیگر جلدوں کو بھی شائع کرنے کا وعدہ پورا کرتے۔

اپنے علمی اور ادبی ذوق وشوق کے پیش نظر کئی سال پہلے میں نے مرحوم اکبر حیدری سے اپنی ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی جس پر انہوں نے لبیک کہہ کر مجھے اپنے گھر واقع ہمدانیہ کالونی بمنہ سرینگر بلایا تھا۔ سلام ودعا اور چائے نوشی کے بعد مجھے آں محترم نے اپنی لائبریری دکھانے کی غرض سے مکان کی دوسری منزل میں لیا۔ ایک لمبا کمرہ کتب خانہ کی شکل میں سجایا گیا ہے۔ جہاں اردو اور فارسی کے علاوہ عربی زبان کی بھی سدابہار کتابیں موجود تھیں۔ اقبالیات، غالبیات، انیسیات، مرزا دبیرؔ، داغ دہلوی، سوداؔ، ناسخؔ، میر ضمیر، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ، مولانا حالیؔ، سرسید احمد خاں اور ہجوں قسم کے دیگر قدیم شعرائے کرام سے متعلق سینکڑوں کتابیں ایک خاص سلیقہ سے شلفوں اور الماریوں میں سجی سجائی نظر آتی ہیں۔ پرانے وقتوں کے رسالہ جات مثلاً زمانہ کانپور، صوفی پنڈی بہاوالدین، حدنگ نظر، مخزن اور غیر منقسم ہندوستان کے پرانے اخبارات کے شمارے اس لائبریری میں آج بھی موجود ہیں۔ یہ نادر و نایاب چیزیں دیکھ کر گلستان اردو کے اس عاشق زار اور صحرانورد کی آبلہ پائی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے کہ یہ مجنون صفت اور دیوانہ ادب کن کن خارزاروں سے گزرا تھا اور کس طرح اپنے آپ کو لہولہان کر کے اس گلستان ادب کو سجانے میں کامیاب ہوا تھا۔

چنانچہ راقم مضمون ہٰذا نے حیدری صاحب کے اس کام سے متاثر ہو کر ایک مضمون بھی تحریر کیا ہے جس کا عنوان کتب خانۂ اکبر حیدری کاشمیری ہے۔ میرا یہ مضمون رسالہ حکیم الامت کے ایک شمارے کے علاوہ میری کتاب گلرنگ میں بھی چھپ چکا ہے۔ ----------(باقی ص 175 پر)

تبصرے اور تاثرات

مبصر: مرزا بشیر شاکر

اقبالؒ نادر معلومات

مصنف: پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

زیر نظر کتاب شائع کر کے پروفیسر اکبر حیدری نے یقیناً قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ حالانکہ اقبالیات پر سینکڑوں کتابیں، رسالے اور اخبارات شائع کیے گئے ہیں لیکن حیدری صاحب کی یہ کتاب کچھ عجیب شان اور نرالا انداز رکھتی ہے۔

راقم کی بساط ہی کیا ہے کہ اس کتاب کے بارے میں کچھ لکھے۔ یہ اہل قلم اور دانشور حضرات کا کام ہے۔ میں کوئی پیشہ ور قلم کار نہیں ہوں کہ اس پر تبصرہ یا رائے زنی کروں۔ اپنے ہی ذوق علم اور تفریح طبع کے لیے عریضہ مصنف کی خدمت میں لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

راقم الحروف کو حال ہی میں اس کتاب کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ میں نے اپنے سب کاموں کو مؤخر کر کے ترجیحی بنیادوں پر اسی کتاب کا مطالعہ پورے ذوق وشوق اور انہماک کے ساتھ کیا۔ حیدری صاحب نے جس محنت اور لگن کے ساتھ اقبالؒ پر یہ کام انجام دیا ہے وہ میرے بیان سے باہر ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا مقدمہ ہی ایک گرانقدر، بسیط اور رخاصے کی چیز ہے۔ کوئی ایک صدی قبل یا اس سے کم مدت کے رسالوں کی بازیافت اخباروں کی دریافت اور ان کی روشنی میں اقبالؒ کے سوانحی حالات وواقعات لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اہل قلم اور علامہ مرحوم کے مصاحب اور ہم عصر حضرات کی تخلیقات کو ڈاکٹر صاحب نے مختلف کتب خانوں اور لائبریریوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر قارئین اور شائقینِ اقبال کے لیے محفوظ کیا ہے۔ نادر خطوط اور نایاب مضامین کی بازیافت بہت ہی قابلِ داد اور رلائق ستائش ہے۔ زمانۂ اقبالؒ اور ران کے مصاحب او راساتذہ وغیرہ کی تصویریں اور وہ بھی رنگین اور صاف ستھری شائع کر کے پروفیسر صاحب نے اپنی اہلیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

کتاب میں درج مضامین، نادر وبیش بہا خطوط، غیر مطبوعہ کلامِ اقبالؒ اور اشعار پڑھ کر مبصر حیدری صاحب کی عالمانہ اور ادبی شخصیت کے بارے میں یہ لکھنے کو حق بجانب سمجھتا ہے کہ انہوں نے گویا مونٹ ایورسٹ کی بلندیوں کی مہم کو سر کر کے کوہ پیمائی کی ہے اور وہ کامیاب ترین کوہ پیما قرار دیئے جانے کے حقدار ہیں۔ کتاب کے حوالہ سے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ اور اُن کے ہمعصروں کے حالات وواقعات پڑھ کر مجھ جیسا قاری زمانۂ ماضی کی یادوں میں کھو جاتا ہے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیسے اور کس قسم کے رجال اللہ رہے ہوں گے۔ ان کے مبارک اور روشن زمانے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے دھندلانے لگتا ہے۔ جب انسانی اور اخلاقی قدروں کا بول بالا رہا ہوگا اور علم وادب کی سرمستیوں کی بہار جوبن پر رہی ہوگی۔ کیسی کیسی ہستیاں اور اکابر زیرِ خاک پیوند ہو گئے ہیں۔

پروفیسر اکبر حیدری کی زیر تبصرہ کتاب دیکھ کر یہ اندازہ کرنے میں کوئی دقت نہیں آتی ہے کہ وہ سنگلاخ اور سخت زمین کو پاٹ کر کس قسم کے قدیم اور تاریخی اہمیت کے حامل دُرِ

بے بہا نکالنے کی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر پرانے یادوں کی کہکشاں پھر رنگ بدلنے لگتی ہے۔ کیا کہنا کیسے کیسے مضامین صفحۂ قرطاس پر از سرنو پھیلائے گئے ہیں۔ مثلاً محمد عبداللہ قریشی کی آپ بیتی۔ سر ذوالفقار علی خان کا مضمون کتابچہ A Voice from the East مرزا سلطان احمد کا ''پاسبان عقل'' اور ''حضرت اقبالؒ کی طرزِ جدید'' اور سب سے بڑھ کر سید علی خامنہ ای کا مدلل اور بصیرت افروز خطاب۔ یہ سب جواہر پارے ہیں ایسی چیزوں کو موجودہ اندھیرے کی گھٹا ٹوپ ہواؤں میں ہاتھ میں چراغ لیے ہوئے حاصل کرنا بس حیدری صاحب کی ہمت اور قلب وجگر والا معاملہ ہے۔ دراصل خدا تعالیٰ نے اُن کو اس کام کے لیے پیدا کیا ہے۔

ہر کسے را بہر کارے ساختہ اند
میلِ او را دُر دِلش انداختہ اَند

پھر بھی اندازہ نہیں ہے کہ حیدری صاحب جس طرح اپنے کام میں مصروف نظر آتے ہیں اُس کو دیکھ کر پتہ نہیں کہ ان کے قلم سے اور کیا کیا ایسی کرامتیں جیسی صادر ہو جائیں گی۔

دیکھیئے! اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا؟
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا؟

کس کس زاویہ سے اس بے بہا کتاب پر نگاہ دوڑائی جائے یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اندر کی تحریک سے درج بالا سطور لکھنے پر مجبور ہوا۔ یہ کام دراصل اہلِ دانش حضرات ہی انجام دے سکتے ہیں۔ مگر اے واحسرتا! یہاں اپنی اس وادی مینو نظیر میں علم وادب کا فقدان نظر آنے لگا ہے۔ اب نئی اور زہریلی ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ کلچر کے نام پر انسانی اور اخلاقی قدروں کی پامالی نظر آتی ہے۔ عوام کو چھوڑ کر اہلِ دانش وبینش مادی ترقی کی دوڑ دھوپ اور سیم وزر کی تلاش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ حیدری صاحب صاحبان علم و عرفان کا وجود بسا غنیمت ہے۔ اللہ اُن کا حامی وناصر۔

ماہنامہ حکیم الامت سری نگر کا

''معرکۂ اسرارِ خودی''

مصنف: پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

بالآخر طویل انتظار اور شدید تقاضوں کے بعد رسالہ ''حکیم الامت'' نے اپنے وعدوں کا ایفا کرتے ہوئے ''معرکہ اسرارِ خودی'' کو منظر عام پر لایا۔ رسالہ ہٰذا کا یہ شمارہ بابت اکتوبر سن عیسوی ۲۰۱۷ء ہے۔ شیدایانِ اقبالؒ اس کے لیے بڑی بے تابیوں کے ساتھ منتظر تھے اور رسالہ ''حکیم الامت'' کو اس کے لیے اکثر و بیشتر بذریعہ ٹیلی فون یا خط وکتابت یاددہانی کرتے تھے۔ یہ اس رسالہ کے ایڈیٹر ڈاکٹر محمد ظفر حیدری کی کوششوں او رمحنت کا ثمرہ ہے کہ انہوں نے اپنے والد مرحوم پروفیسر ڈاکٹر اکبر حیدری کی لاج رکھی اور ان کی اس آخری کتاب کو اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ پڑھنے والوں تک پہنچا ہی دیا۔

اگرچہ ماہنامہ ''حکیم الامت'' کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے دس سالہ جلوہ نمائی میں کسی قسم کی تاخیر نہیں کی اور خطۂ کشمیر جیسے نامساعد حالات کے نرغے میں اپنا علمی اور ادبی سفر برابر جاری و ساری رکھا۔ بلکہ یہ رسالہ کئی بار اپنے شیڈول (Schedule) سے پیشتر ہی اپنے قارئین تک پہنچتا رہا اور اُن کی پیاس بجھاتا رہا۔ اس علمی مجلہ کو یہ شرف بھی حاصل رہا ہے کہ عام شماروں کے علاوہ اس کے بہت سارے خصوصی اور یادگاری شمارے بھی نکلتے رہے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد راقم الحروف کے دل میں یہ داعیہ بھی پیدا ہوا کہ اس کے حالیہ شمارہ یعنی ''معرکہ اسرارِ خودی'' کے بارے میں بھی اپنے کچھ تاثرات ورطۂ تحریر میں لاؤں۔ اس کے بارے میں تفصیل سے کچھ لکھنا اور اس کا بھرپور جائزہ لینا دراصل اہل علم ودانش کا کام ہے۔ لیکن دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک آدمی کبھی کبھی بشریت کے ناطے اپنے

جذبات سے بھی مغلوب ہو جاتا ہے اور کسی نہ کسی صورت میں اپنے بے قابو جذبات اور احساسات کا اظہار کرنا چاہتا ہے اور اسی کے پیشِ نظر اپنے کمزور قلم کو تھامے ہوئے یہ سطور قلمبند کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اسرارِ خودی شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کی وہ مایہ ناز فارسی تصنیف ہے جس کے بارے میں حضرت علامہ نے خود فرمایا ہے:

''نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبالؔ۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبالؔ نے بویا ہے اُگے گا ضرور اُگے گا۔ اور علی الرغم مخالفت بار آور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے''۔

(اقبالؔ کے خط کا اقتباس بنامِ شادؔ مورخہ ۱۴/اپریل ۱۹۱۶ء)

اصل میں علامہ اقبالؔ نے اسرارِ خودی لکھنے کا آغاز ۱۹۱۳ء میں کیا تھا اور دو سال کے عرصے کے بعد یہ چھپ کر ۱۹۱۵ء میں منظر عام پر آگئی تھی۔ حضرت حافظؔ کے بارے میں اقبالؔ نے چند شعر لکھے تھے جو کہ ان کی مخالفت میں لکھے گئے تھے۔ مثلاً:

ہوشیار از حافظؔ صہبا گذار
جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
— — — — —
نیست غیر از بادہ در بازار اُو
از دو جام آشفتہ شُد دستارِ اُو

یہ اشعار پڑھ کر صوفی حضرات کا ایک گروہ اور ان کے عقیدت مند بہت ناراض ہوئے تھے اور انہوں نے ان اشعار کو حضرت حافظ شیرازی کی توہین سمجھا تھا اور اس کے علاوہ اپنی فارسی مثنوی میں خودی کی حقیقت کو آشکار کیا تھا اور اصلی اسلامی تصوف کی تعریفیں کی تھیں۔ اس کے برعکس عجمی تصوف کی کھل کر مخالفت کی تھی۔ جب یہ کتاب صوفی حضرات اور دیگر صاحبانِ علم تک پہنچی تو بہت شور وشر اور ایک معرکہ برپا ہوا۔ بہت سے صوفیائے کرام اور شعراء نامدار حضرت علامہ اقبالؔ کے مخالف ہوگئے۔ یہاں تک کہ ان کے قریبی دوست اور بزرگ احباب بھی بہت ناراض ہوگئے اور اس مثنوی کے جواب میں اپنی طرف سے طبع زاد مثنویاں لکھیں اور خط وکتابت کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

خواجہ حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی جیسی معروف شخصیتیں بھی علامہ اقبالؔ کی اس مثنوی سے بدظن ہوگئیں اور سارا علمی اور ادبی ماحول بگاڑ کا شکار ہوگیا۔ مگر یہ علامہ اقبالؔ کا قلب و جگر تھا کہ انہوں نے بہت صبر وسکون سے کام لیا۔ یہاں تک کہ اُن کو حضرت حافظؔ کے بارے میں کہے گئے گستاخانہ شعر حذف کرنا پڑے۔

اس طرح گرم گفتاری اور تیز وتند مقالوں کا آغاز ہوگیا اور تیر ونشتر جیسی تحریریں بھی معرضِ وجود میں آگئیں۔ مگر اس کے باوجود بہت سارے اہل علم ودانش نے اس مثنوی کو بڑی ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ پڑھا اور اس کے مطالب ومفاہیم پر غور وفکر کیا اور انہوں نے دانش مندی کے ساتھ علامہ اقبالؔ کے نقطۂ نظر اور فلسفۂ خودی کو سمجھ لیا اور انہوں نے بھی اقبالؔ کے دفاع میں اپنے مقالات لکھے اور منظوم نذرانہ کی صورت میں بھی اقبالؔ کی تحسین وتوصیف کی۔ یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا۔

انہی حالات، مکتوبات وجوابی مکتوبات کو مرحوم ومغفور پروفیسر اکبر حیدری نے جمع کرکے ایک کتابی صورت میں مدون کیا ہے اور اس کتاب کا نام ''معرکہ اسرارِ خودی'' رکھا۔ جس کا رسالہ حکیم الامت نے خصوصی ایڈیشن شائع کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں پروفیسر اکبر حیدری کا ایک بسیط اور پُر مغز مقدمہ ہے۔ اس کے بعد اسرارِ خودی کا نقشِ اول ستمبر 1915 والا مضمون درج ہے۔ پھر نمبر ۲ سے شروع ہوکر نمبر ۲۸ تک ۲۷ مضامین

درج ہیں۔میری نظر میں یہ تمام مضامین ومقالات (نثر و نظم) بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں اور سبھی مضامین دُرہائے بے بہا جیسے ہیں۔ان کی قدرو قیمت اس لحاظ سے بہت ہی اہم ہے کہ اکثر علمی وادبی جواہر پارے ایک سوسال سے بھی زیادہ پرانے ہیں جو کہ اُس زمانے میں غیر منقسم ہندوستان سے نکلنے والے معیاری اردو رسالوں میں چھپ چکے تھے۔

اسرارِ خودی اور ظفر الملک علوی ایڈیٹر ''الناظر'' لکھنؤ یکم جنوری ۱۹۱۶ء' اسرارِ خودی اور تصوف ''وکیل'' امرتسر ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء' اسرارِ خودی خواجہ حسن نظامی ''خطیب'' دہلی ۳۰ جنوری ۱۹۱۶ء' اسرار خودی کا جواب از محمد جہلمی ''سراج الاخبار'' جہلم ۲۴ جون ۱۹۱۶ء' تصوف وجودیہ' اسرارِ خودی از اقبالؔ ''وکیل'' امرتسر ۱۳ دسمبر ۱۹۱۶ء' ریویو مثنوی اسرار خودی منظوم فارسی پیر زادہ محمد یوسف ''صوفی'' پنڈی بہاؤ الدین گجرات اپریل ۱۹۱۸ء' اسرارِ خودی پروفیسر ڈکنسن ''معارف'' ستمبر ۱۹۲۱ء اسرارِ خودی کے بارے میں اقبالؔ کا خط پروفیسر نکلسن کے نام ''معارف'' اکتوبر ۱۹۲۱ء۔

اس کے علاوہ کتاب میں شامل اور دیگر مضامین جو کہ اُس زمانہ میں زندگی بسر کرنے والے ادیبوں اور رقادر الکلام شاعروں نے لکھے تھے۔ ان تمام مضامین کو جمع کرنا اور اپنے کتب خانہ میں سنبھال کے موجود رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یہ کتاب اور اس کا مواد دیکھ کر آدمی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اردو زبان وادب کے اس پرستار جناب پروفیسر اکبر حیدری نے بلاشبہ فرہاد کی طرح اپنے سر پر تیر وتفنگ مارنے کی ٹھان لی تھی۔ پھر یہ ان کا قلب وجگر ہے کہ کس طرح برصغیر کے علمی گلشنوں اور گلستانوں میں وارد ہوئے تھے اور برہنہ پائی کے ساتھ اپنے آپ کو خارزاروں سے گذار کر یہ مہکتے ہوئے اور خوشبودار پھول جمع کیے تھے۔

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

جناب پروفیسر اکبر حیدری یقیناً داد وتحسین کے مستحق ٹھہرے ہیں کہ آبلہ پائی کے ساتھ وہ ملک کے مختلف لائبریریوں میں گھومے پھرے تھے اور دل کی تڑپ کے ساتھ اسرارِ خودی کے تنازعہ سے متعلق یہ ادب پارے جمع کیے ہیں اور ایک گلدستے کی صورت میں ان قیمتی اور معلوماتی مضامین کو کتابی صورت دی ہے جس کا فیض آنے والی نسلیں بھی اٹھا سکتی ہیں۔ محققین اور ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ بہت ہی قیمتی اثاثہ ہے خاص کر یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالروں کے واسطے یہ نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یہ اسی باہمت اور جواں مرد ادیب کی جستجو اور تلاش کا نتیجہ ہے کہ سو سال سے زیادہ اور اس سے کم' علامہ اقبالؔ کے بلند فکر خیال اور تنگ نظر صوفیائے کرام اور کٹھ ملاؤں کی تنگ دلی اور علمی بے بصیرتی پر معرکۂ اسرار خودی والے مضامین دلالت کرتے ہیں۔ ہر ایک مضمون پر الگ الگ تبصرہ کرنا اور رائے زنی کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔ اس پر علیٰحدہ سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ مگر دیکھنے اور سمجھنے کی یہ چیز ہے کہ کس طرح حیدری صاحب جیسے ادب پرور اور اقبالؔ شناس نے خونِ جگر پی کر اس کام کو سرانجام دیا ہے اور کس طرح کتب خانوں کی خاک چھان کر پرانے زمانے کے رسالوں کو جمع کر کے ادب کا یہ خوشبو دار چمن آراستہ کیا ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر
(اقبالؔ)

آج کے شیدایانِ اردو کے لیے اس میں سبق ہے کہ محنت اور عرق ریزی سے انسان بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور عروج پا سکتا ہے۔ حالانکہ آج کل سائنسی علوم کا زمانہ ہے۔ کمپیوٹر انٹر

نیٹ اور موبائل کی سہولیات جگہ جگہ دستیاب ہیں۔ گھر بیٹھے ایک قلم کار بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ مگر پروفیسر اکبر حیدری جیسے صحرا نورد قلم کار کی محنت دادرسی کی طالب ہے کہ ان سہولیات کی عدمِ موجودگی میں کیسے کیسے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ سفری صعوبات، ملاقاتیں، منتیں، احسان اٹھانا، قلیل آمدنی مگر جذبہ صادق کے ہوتے ہوئے سبھی دشوار گذار مرحلے آسان ہو جاتے ہیں۔

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا
وہ کون سا عقدہ ہے جو حل ہو نہیں سکتا

یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اقبالؔ کے اس شیدائی نے ایک جوہری کی طرح لعل وجواہر جمع کیے ہیں۔ جو کہ کتاب کی صورت میں آج ہمارے سامنے اپنی تابانیاں اور شعائیں بکھیرتے ہیں۔ کتاب نما رسالہ معرکہ ٔ اسرارِ خودی شیدایانِ اقبالؔ، طلباء اور علمی و ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے یکساں طور پر قابلِ مطالعہ اور بہت مفید ہے۔

معرکہ ٔ اسرارِ خودی ایک مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل کر گئی ہے کیونکہ یہ معرکہ یعنی اسرارِ خودی کے نفسِ مضامین پر علامہ اقبالؔ کی حینِ حیات میں ہی اس کی مخالفت اور موافقت پر اہلِ تصوف اور مختلف دانشوروں کے خیالات اور آراء پر مشتمل یہ مضامین ملک کے معروف علمی و ادبی رسالوں میں چھپ کر منظرِ عام پر آئے تھے اور علامہ اقبالؔ نے اپنی طرف سے اسلامی تصوف اور غیر اسلامی تصوف و نظریات کی اپنے خطوط وغیرہ کے ذریعہ بھی پوری وضاحت کی تھی۔

کتاب مذکورہ میں شامل مضامین اور مکاتیب کے اختتام پر پروفیسر حیدری نے جو حواشی تحریر کیے ہیں ان کو پڑھ کر بھی معلومات کا ایک ذخیرہ فراہم ہو جاتا ہے اور حیرانگی ہو جاتی ہے کہ صاحب کتاب نے کس طرح اور کہاں کہاں سے نادر اور نایاب رسالے حاصل کیے تھے۔ ان نایاب یا کمیاب رسالوں کو پڑھ کر اور ان کی چھان پھٹک کر کے مرحوم حیدری صاحب نے اپنی مطلوبہ چیزیں حاصل کی تھیں۔ ان حواشی کا مطالعہ کر کے پتہ چلتا ہے کہ معرکہ ٔ اسرارِ خودی کے سلسلے میں کس قلم کار کا مضمون یا جوابی مضمون اور کس شمارے میں چھپ چکا تھا۔ بذاتِ خود علامہ اقبالؔ کی طرف سے بھی خطوط کی صورت میں وضاحتیں کی گئیں تھیں۔ ان رسالوں کا باضابطہ تاریخوں کے ساتھ حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ صبر آزما کام بھی مصنفِ کتاب نے بہ حسن وخوبی انجام دیا ہے۔

دراصل محمد عبداللہ قریشی کی طرف سے پروفیسر اکبر حیدری کو ترغیب ملی تھی کہ یہ دونوں صاحبان علم اور شیدایانِ اقبالؔ مشترکہ طور پر معرکہ ٔ اسرارِ خودی کا تصنیفی کام انجام دیں گے اور محمد عبداللہ قریشی نے فرزندِ اقبالؔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی فرمائش پر اسرارِ خودی کی مخالفت اور موافقت میں بہت سارے مضامین جمع کیے تھے۔ مگر وفات پانے کی وجہ سے محمد عبداللہ قریشی کے نصیب میں یہ تھا ہی نہیں۔ پھر قدرت نے اس نیک اور خوشگوار کام کا سہرا پروفیسر اکبر حیدری کے سر باندھا۔ ملک کے مختلف کتب خانوں اور دانش گاہوں مثلاً حیدر آباد، لکھنؤ، کتب خانۂ راجہ صاحب آف محمود آباد، ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ میں گھوم پھر کر انہوں نے قدیم رسالوں اور کتابوں کو دریافت کیا جہاں سے شب وروز کی محنت کے بعد ترتیب دے کر ان کو ایک یادگاری گلدستے کی شکل دے دی۔ حیدری صاحب کا یہ کٹھن کام ستاروں پر کمند ڈالنے کے مترادف ہے۔ ان رسالوں اور اخباروں کے نام پڑھ کر ایک باذوق اور قلبِ سلیم رکھنے والے ادیب اور شاعر کے دل میں کتنی ہی تمنائیں انگڑائیاں لیتی رہیں اور ایسے اعلیٰ معیار رسالوں یا ان کے مالکان اور مدیروں کی یادیں دل میں جگہ بنا لیتی ہیں۔

مثلاً رسالہ مخزن لاہور، صوفی پنڈی بہاؤ الدین

گجرات، خدنگِ نظر، زمانہ کانپور، خطیب دہلی، اخبار زمیندار، سراج الاخبار جہلم، وکیل امرتسر، الناظر لکھنؤ، نظام المشائخ دہلی، معارف علی گڈھ (یہ رسالہ یعنی معارف آج بھی جاری ہے) ہمایوں لاہور، نیرنگِ خیال لاہور، ذخیرہ حیدر آباد، نقاد آگرہ، ماہنامہ طور امرتسر وغیرہ۔

یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اردو زبان وادب کا یہ سرپرست اور محسن اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے کہاں کہاں پہنچا ہوگا۔ کس کس گلی کی خاک چھانی ہوگی۔ کتنی محنت اور مشقت کی ہوگی۔ جنگل جنگل اور صحرا صحرا پھر کر ایسے ادبی مجنون کے پاؤں میں چھالے پڑنا یقینی بات ہے۔

میرا ماضی ادب سے روشن ہے
میں بھی غالبؔ کے گھر میں رہتا ہوں

دراصل ماضی کی یادیں بھی ایک حساس انسان کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہوتی ہے اور ہمارا حال اور مستقبل بھی ہمارے ماضی سے جڑا رہتا ہے۔ اسی لیے ماضی کی یادوں کو کھنگالنا اور ان کا تذکرہ کرنا بھی بہت ہی سودمند ثابت ہوسکتا ہے ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خوان ایں قصۂ پارینہ را

پروفیسر موصوف نے معرکۂ اسرارِ خودی کو حواشی سے مزین کیا ہے۔ ان حواشی کو پڑھ کر محققین حضرات اور ریسرچرز کے لیے تحقیقی میدان میں کام کرنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ یہ حواشی پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح بات سے بات نکلتی ہے۔ گذرے ہوئے ادیبوں کی زندگی او ران کے روشن کارناموں سے قارئین واقف ہوجاتے ہیں اور بہت ساری پوشیدہ باتیں ظاہر ہوجاتی ہیں۔ اس کی مثال میں مثنویاتِ اقبالؔ اسرارِ خودی علامہ عبدالرحمن بجنوری کے عالمانہ مضامین کا ترجمہ صفحہ ۱۳۷ پر دیکھا جاسکتا ہے اور اس کے حواشی کے بعد مزید حواشی از اکبر حیدری گویا سونے پر سہاگہ۔ بقول اقبالؔ ؎

میں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام آرزو کھوئے ہوؤں کی جستجو

کتاب کے پانچ مضامین علامہ اقبالؔ کی دوسری مثنوی یعنی رموزِ بیخودی سے متعلق ہیں جن کے عنوانات اس طرح ہیں: دیباچہ رموزِ بیخودی نقش اول اپریل ۱۹۱۸ء، یہ دیباچہ سید سلیمان ندوی کا تحریر کردہ ہے جو کہ معارف اپریل ۱۹۱۸ء زینت قرطاس بنا تھا۔ دوسرے مضمون کا عنوان ہے 'اقبالؔ کی رموزِ بیخودی' از ہوش بلگرامی جو کہ ذخیرہ حیدر آباد کے مئی ۱۹۱۸ء والے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ تیسرے عنوان کے تحت مثنوی رموزِ بیخودی والا مضمون کتاب میں درج ہے جو کہ زمانہ کانپور بابت اگست ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا۔ چوتھا مضمون شیخ عبدالقادر مرحوم کا لکھا ہوا ہے جو کہ مخزن لاہور ستمبر ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا اور پانچویں مضمون کا عنوان 'ڈاکٹر اقبالؔ اور رموزِ بیخودی' ہے جو کہ رسالہ نقاد آگرہ اپریل ۱۹۱۹ء کے شمارے میں چھپ چکا تھا۔ یہ سبھی مضامین جو کہ مثنوی رموزِ بیخودی کے بارے میں تنقیدی مگر تعمیری تنقید کی نوعیت کے ہیں ان پرانے علمائے کرام اور ایڈیٹر صاحبان کے ہیں جنہوں نے اپنی اپنی علمی عظمتوں کا لوہا منوایا تھا اور خود علامہ اقبالؔ کے ان کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ یہ ریویو یا مبصرانہ مضامین بھی گوہر نایاب کی حیثیت رکھتے ہیں جو کہ پروفیسر اکبر حیدری صاحب نے چن چن کے اور جمع کر کے آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کیے ہیں۔

کتاب کے آخری مضمون کے بعد پروفیسر اکبر حیدری کا سوانحی خاکہ درج کیا گیا ہے جو کہ اس فرزندِ کشمیر او راقبالؔ شناس اور مجنون صفت اردو ادب کے سرپرست کی فاضلانہ زندگی کے بہت سے گوشوں سے پردہ ہٹاتا ہے۔ اس میں ان کی خانگی زندگی کے علاوہ علمی کارناموں، کتابوں کی تصنیف و تالیف،

اکیڈمیوں اور دیگر علمی وادبی اداروں کی طرف سے دیئے گئے انعامات کا بھرپور وتفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ان کی علمی اور استادانہ مہارت کا حال واحوال درج کیا گیا ہے۔غرض ؎

نہ دانم آں گلِ رعنا چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغے ہر چمنے گفتگوئے او دارد

ماہنامہ ''حکیم الامت'' سرینگر کے موجودہ ایڈیٹر اور پروفیسر اکبر حیدری صاحب کے فرزند ڈاکٹر محمد ظفر حیدری بھی صد مبارک کے مستحق اور لائق تحسین ہیں کہ اپنے والد کی وفات کے کئی سال بعد یہ کتاب منظرِ عام پر لانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔اللہ کرے زورِ قلم اور بھی زیادہ!

اقبالؔ: احباب وآثار

از پروفیسر اکبر حیدری

زیر تبصرہ کتاب پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کی اقبالیاتی ادب کے سلسلے میں ان کی ایک اہم ترین کتاب ہے۔اس کتاب کا مسودہ مصنف نے سالہا سال پہلے تحریر کیا تھا اور اپنی زندگی کی راتوں کی نیند حرام کرکے اس کو محنت شاقہ سے تیار کیا تھا۔یہ سارا مسودہ موصوف نے کلچرل اکادمی کے اہلکاروں کے حوالے کیا تھا مگر کافی تاخیر کے بعد اس مسودہ کو بازیافت کیا گیا اور موجودہ عملہ کی دلچسپیوں اور کٹھن محنت سے اس کی اولین جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آگئی ہے۔پروفیسر اکبر حیدری نے ایک بار میرے ساتھ دورانِ ملاقات اس کتاب کی تاخیرِ طباعت پر اپنی بے چینی اور متفکری کا برملا اظہار کیا تھا۔یہاں تک کہ وہ اس کی طباعت سے پہلے ہی راہیٔ ملک عدم ہوگئے۔اب ان کی رحلت کے بعد اس کتاب کی جلد اول چھپ کر آئی ہے۔تو عالم برزخ میں مصنف کی روح یقینا شادمان ہوئی ہوگی۔دیر آید درست آید۔کتاب کا حصۂ اول اب تو منظر عام پر آ ہی گیا۔

کتاب ''اقبالؔ: احباب او رآثار'' ۳۴۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔چھپائی اور کمپیوٹر کمپوزنگ بہت ہی عمدہ اور جاذب نظر ہے۔کاغذ معیاری استعمال کیا گیا ہے۔سیکرٹری اکیڈیمی نے کتاب کا پیش لفظ تحریر کیا ہے۔اس کے بعد جناب پروفیسر اکبر حیدری کا اٹھارہ صفحات پر ایک بسیط مقدمہ درج ہے۔مصنف نے اپنے اس پُرمغز اور عالمانہ مقدمے میں ۷۰ مضامین جو کہ تحقیقی ہیں کا ذکر کیا ہے جن میں صرف ۳۰ مضامین شامل کتاب کیے گئے ہیں۔مصنف نے کتاب میں ان علمی اور نامور شخصیات کا تذکرہ کیا ہے جن سے علامہ اقبالؔ مانوس تھے۔اس جلد کے مقدمہ میں ان اہل علم و دانش کا ایک سرسری تعارف پیش کیا گیا ہے اور ان کی علمی کاوشوں اور کاموں کا تذکرہ ہوا ہے۔اس کے علاوہ اقبالؔ کی بعض نادر و نایاب تحریریں، اقبال اور مشاعرے، بمبئی میں شاندار ہفتہ اقبالؔ، اقبالؔ کی پہلی تصنیف اسرارِ خودی کا پہلا ایڈیشن، سر اسرارِ خودی، اقبالؔ کی ایک نادر الوجود نظم ''تاج''، اقبالؔ کی صحیح تاریخ پیدائش، اقبالؔ کے القاب، رحلتِ اقبالؔ اور معاصر رسالوں کی سرخیوں کے تحت مختصراً تعارفی طور پر لکھا گیا ہے۔

مقدمہ کے بعد کتاب میں درج اقبالؔ کے ایک اور استاد عنوان کے تحت علامہ شیخ عبدالعلی ہروی کے حالات زندگی درج کیے گئے ہیں۔بقول مصنف کتاب اکثر وبیشتر لوگ ان سے ہنوز ناواقف ہیں۔علامہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے والد حاجی شیخ احمد بن شیخ ابراہیم خان سے حاصل کی موصوف شہر ہرات افغانستان کے رہنے والے تھے۔علامہ ہروی بڑے پایہ کے عالم تھے۔کمال معلومات، وسعت بیان کہ ذہانت وروحانیت کا یہ حال تھا کہ جو بات ایک دفعہ بیان کردی۔وہ دوبارہ نہ آئی۔۹ دسمبر ۱۹۲۲ء شب شنبہ اس عالم فانی سے عالم بقا کو رحلت فرمائی۔بقول مصنف ڈاکٹر علامہ اقبالؔ علامہ شیخ عبدالعلی ہروی کے قیام لاہور کے دوران ان کی

صحبت میں بیٹھ کر اکتساب فیض کرتے تھے۔ علامہ اقبالؔ کے علاوہ سر ذوالفقار علی خان سر علی امام، مولوی محسن علی شاہ، عبدالمجید سالک، آغا شاعر قزلباش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اقبالؔ اکثر وبیشتر علامہ کے بیان کی اہم باتیں نوٹ کرتے تھے۔ مضمون کے آخر پر فاضل مصنف نے باضابطہ اس زمانے کے رسائل اور اخبارات کا حوالہ دیا ہے جن میں علامہ اقبالؔ اور شیخ عبدالعلی ہروی مرحوم کے باہمی روابط تھے۔

پروفیسر اکبر حیدری کے قلم سے کتاب میں مضمون بعنوان ''سر سید علی امام'' بھی درج ہے۔ سر سید علی امام کے بارے میں یہ مصنف کتاب کا ایک طویل اور بہت معلوماتی مضمون ہے۔ اس کی افادیت اور اہمیت اس چیز سے بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضرت علامہ اقبالؔ نے اپنی اسرار خودی کا انتساب جناب سر سید علی کی ذات والا صفات سے کیا ہے۔ متذکرہ مضمون میں سر سید کی عالمانہ اور دانشورانہ شخصیت سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ سر سید علی امام کی تاریخ ولادت سے متعلق ۱۱ فروری ۱۸۶۹ء کی تاریخ لکھی گئی ہے اور یہ سعادت مند بیٹا نواب سید امداد امام اثرؔ کے گھر میں پیدا ہوا تھا پھر تعلیم سے فراغت پا کر آپ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ یہاں تک کہ آپ حیدر آباد کی وزارت عظمیٰ کے منصب جلیل پر بھی فائز رہے۔ آپ نوابانِ اودھ کے خاندان کے فردِ فرید تھے اور اپنی قابلیت اور صلاحیتوں کا سکہ بھی بٹھایا تھا۔ علامہ اقبالؔ سر علی امام کو اپنا قابل اعتماد اور مخلص ترین دوست سمجھتے تھے۔ دونوں میں آپسی مراسلت بھی رہی ہوگی۔

شادؔ اور اقبالؔ کی خط وکتابت سے بھی سر علی امام کے کردار، حسن سیرت، تدبیر معاملہ فہمی، سلامت روی اور رواداری پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر اقبالؔ جب ستمبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے لیے لندن کے لیے سوار ہوئے تو ان کے ہمراہ اور لوگوں کے علاوہ سر علی امام اور ان کی بیگم صاحبہ بھی تھیں۔ یہ سب لوگ ایک ہی جہاز میں سوار تھے۔ اقبالؔ نے اس سفر کی روداد اپنے پیش کار منشی طاہر الدین صاحب کو ۲۱ ستمبر ۱۹۳۱ء کے خط میں تفصیل سے لکھی تھی ایسی ہی بہت ساری باتوں اور حقائق سے جناب اکبر حیدری کے نوشتہ مضمون سے پردہ سرکتا ہے۔ بالآخر اس علم و دانش کے پیکر اور محسن قوم وملت یعنی سر علی امام نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو انتقال فرمایا۔ مضمون کے آخر پر مضمون نگار نے باضابطہ حوالہ جات تحریر کیے ہیں۔

کتاب زیر تبصرہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مصنف مرحوم حیدری صاحب کا مطالعہ کتنا وسیع اور گہرا تھا۔ اس معتبر محقق نے کتنا خون جگر تھوکا ہوگا پرانے زمانے کے جریدوں، رسائل اور اخبارات کو کہاں کہاں سے ڈھونڈ نکالا ہوگا اور کتنی ہی راتوں کی نیند حرام کی ہوگی۔ جبھی تو کتاب میں شامل مضامین تحریر کیے تھے۔ اکبر الہ آبادی والے مضمون کا مطالعہ کر کے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؔ اور اکبر الہ آبادی کے درمیان پہلے بہت عرصہ تک خط وکتابت چلی تھی اور پھر ۱۹۱۳ء کے اوائل میں باہم ملاقات ہوئی تھی۔ مرزا سلطان احمد نے اقبالؔ کو اکبرؔ سے متعارف کرایا تھا۔ اکبرؔ اور اقبالؔ کے درمیان بے تکلف دوستی تھی باہمی الفت اور محبت کے باوجود اسرار خودی کے شائع ہونے پر اکبرؔ بھی مخالفین اقبالؔ کے صف میں شامل ہو گئے تھے اور دو ڈھائی سال تنازعہ چلا تھا پھر معاملات اور حالات اپنی ڈگر پر آئے تھے۔ اس جھگڑے کی تفصیل مضمون کے مطالعہ سے ٹھیک طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

کتاب کے صفحہ ۱۴۸ پر درج سرور جہاں آبادی مقالے کو پڑھ کر یہ پتہ چل جاتا ہے کہ پروفیسر اکبر حیدری ٹھیک ایک جوہری کی طرح علمی جواہرات اور لعل و گوہر کی تلاش میں

گھومے پھرے ہیں۔ انہوں نے تلاش کر کر کے گلستان ادب کے چمن زاروں سے شعر وشاعری کے مہکتے ہوئے پھول چن لیے ہیں اور ان کو اپنے گلدستوں میں سجا کے رکھا ہے۔ کہاں علامہ اقبالؔ کا زمانہ اور ۱۹۰۴ء، ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء کے مخزن اور دیگر رسالوں میں ان کا شائع شدہ کلام اور ساتھ ساتھ سرورؔ جہاں آبادی کا بھی کلام بلاغت نظام۔ یہ رسالے اور ان کی تلاش و جستجو دراصل حیدری صاحب جیسے بلند ہمت اور اولوالعزم محقق اور دانشور کا قلب و جگر ہی ہوسکتا ہے۔ ان رسالوں وغیرہ سے صاحب موصوف نے سرورؔ جہاں آبادی کی کیسی دل پذیر نظموں اور اشعار کا انتخاب کیا ہے اور ان کو زیب قرطاس بنایا ہے۔ یہ نظمیں اور ان کے پر تشبیہ اشعار پڑھ کر سرورؔ کی قادر الکلامی کا خوب اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بیر بہوٹی' حسرت دیدار' حسرت آلود یاد' سوز' بیوگی' ایک اجل رسیدہ تمنا' پدمنی کی چتا اور رخاک وطن جیسی نظموں کے منتخب اشعار کا مطالعہ کر کے ذوقِ سلیم رکھنے والوں کے لیے تفریح اور سرور کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ سرورؔ اور اقبالؔ کے باہمی تعلقات کے بارے میں پروفیسر حیدری لکھتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ذہنی افکار اور خیالات کی اعلیٰ صلاحیتوں سے واقف تھے۔ سرورؔ جہاں آبادی نے ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء کو اسی جہانِ فانی سے کوچ کیا۔

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ حیدر آبادی اور علامہ اقبالؔ کے درمیان کس قسم کے گہرے اور استوار مراسم اور تعلقات تھے اور دونوں آپس میں ایک دوسرے کا کس قدر عزت واحترام کرتے تھے۔ پروفیسر اکبر حیدری نے زیر نظر کتاب میں اس پر ایک بسیط مقالہ بعنوان مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ حیدر آبادی تحریر کیا ہے۔ اس تحقیقی مقالہ میں مقالہ نگار نے شادؔ حیدر آبادی کے عقیدہ کے تعلق سے پوری تفصیل سے مقالہ کو دلچسپ بنایا ہے۔ شادؔ حیدر آبادی اپنے مسلک کے بارے میں کہتے ہیں:

میں ہوں ہندو میں ہوں مسلمان — ہر مذہب ہے میرا ایمان
شادؔ کا مذہب شادؔ ہی جانے — آزادی' آزاد ہی جانے

شادؔ اقبالؔ کے دلدادہ تھے۔ تمام معاصر شعرائے اردو میں وہ کلام اقبالؔ سے اتنا متاثر ہوئے تھے کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ شادؔ عظیم آبادی نے اقبالؔ کے تتبع میں ایک غزل بھی کہی تھی۔ اقبالؔ کی غزل کا مطلع ہے

انوکھی وضع ہے سارے زمانے میں نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

شادؔ نے اس کے تتبع میں درج ذیل مطلع تحریر کیا ہے:

یہ سب دیر و حرم کے لوگ اپنے دیکھے بھالے ہیں
عدم آباد اک بستی ہے واں کے رہنے والے ہیں

چونکہ علامہ اقبالؔ شادؔ عظیم آبادی کے ساتھ اپنی عقیدت کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''گذشتہ مارچ میں مجھے حیدرآباد دکن جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستانہ وزارت پر حاضری ہوئی اور عالی جناب ہز ایکسلنسی مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ بہادر جی، سی، آئی، یمین السلطنت پیشکار وزیر اعظم دولت آصفیہ المتخلص بہ شادؔ کی خدمت بابرکت میں باریاب ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز ایکسلنسی کی نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا وہ میرے لوح دل سے کبھی نہیں مٹے گا''۔

(ص ۱۹۶۔۱۹۷)

پروفیسر اکبر حیدری نے باضابطہ حوالہ دے کر لکھا ہے کہ جب ڈاکٹر اقبالؔ وفات پا گئے تو مہاراجہ نے اپنے جذبات غم کا اظہار اِن الفاظ میں کیا تھا:

''ڈاکٹر سر اقبالؔ' فقیر کے مخلص دوست تھے۔ ان کی بے وقت مفارقت سے شعر و سخن کا ایک درخشاں ستارہ غروب

ہوگیا۔ مرحوم نے فلسفے کی گتھیوں کو نظم کے ذریعہ آسان اور عام فہم بنادیا ہے۔ دنیا کی فضائیں ان کے منظوم نغموں سے گونجتی اور آنے والی نسلوں کے دلوں میں مرحوم کی یاد ہمیشہ تازہ کرتی رہیں گی“۔ (صفحہ نمبر ۲۰۳)

شاد عظیم آبادی حیدر آباد دکن میں وزارت عظمیٰ کے منصب عالی پر فائز تھے اور اس کے باوجود علم دوست، ادب نواز، شاعر اور اخلاق کریمانہ کے مالک تھے اور علامہ اقبالؔ کے ساتھ ان کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ اکبر حیدری مرحوم نے یہ مقالہ لکھ کر ادب لطیف کا ذوق رکھنے والوں کے لیے دونوں شخصیات کا تعارف کرایا ہے اور کئی دہائیاں قبل علم و ادب اور اردو اور فارسی زبانوں کے بول بالا اور عروج کا نقشہ دکھایا ہے۔

یارب وہ ہستیاں اب کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

خواجہ حسن نظامی عنوان کے تحت مقالے میں مصنف نے زیادہ تر ۱۹۱۵ء میں اقبالؔ کی اسرار خودی شائع ہونے پر ایک ہنگامہ ہونے کی باتیں زیرِ تحریر لائی ہیں۔ علامہ مرحوم نے اگرچہ یہ مثنوی خواجہ حسن نظامی کے مشورے سے ہی لکھی تھی اور انہوں نے اس کے کئی نام بھی تجویز کیے تھے۔ مگر افلاطون اور حافظؔ شیرازیؒ کی مخالفت سے ادیبوں اور کٹھ ملاؤں نے ایک طوفان بپا کیا تھا۔ یہاں تک کہ اکبر الہ آبادی جن کے اقبالؔ کے ساتھ دوستانہ اور مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے وہ بھی اس رَو میں بہہ کر اقبالؔ کے مخالف بن گئے۔ غرض ایک تفصیل طلب بحث ہے۔ اس موضوع پر پروفیسر حیدری صاحب نے اس زمانے کی بہت ساری باتیں لکھی ہیں بلکہ اطلاعات کے مطابق آپ نے اس موضوع پر الگ سے ایک کتاب ”معرکہ اسرار خودی“ لکھی ہے جو کہ ابھی طباعت کی منتظر ہے۔ کتنی پرانی کتابوں، کتنے رسالے، اخبارات اور خطوط کا مطالعہ حیدری مرحوم نے کیا ہے۔ اس کا باضابطہ حوالہ انہوں نے مقالے کے اختتام پر دیا ہے۔ یہ ان ہی کا قلب وجگر تھا اور یہ ان کی انتھک محنت کا نتیجہ کہ قارئین کے لیے آپ نے اس قسم کا لٹریچر فراہم کیا۔ مقالے میں مرحوم حیدری صاحب نے ایک Confidential خط کی عبارت بھی نقل کی ہے جو کہ اقبالؔ نے شاد عظیم آبادی کے نام لکھا تھا اور اس میں یہ ذکر کیا ہے اور خدا کی قسم کھا کر کہا گیا ہے کہ مثنوی اسرار خودی میں نے خود نہیں لکھی ہے بلکہ مجھ سے لکھائی گئی ہے۔

اقبالؔ کی برہمنیت سے بھی ایک دلچسپ واقعہ مقالے میں درج ہے اور ان کا قلمی چہرہ بھی خواجہ حسن نظامی کے قلم سے شامل مقالہ ہے۔ یہ مقالہ بھی بہت ہی غور طلب اور قابل مطالعہ ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے خواجہ حسن نظامی کا ایک مضمون شامل کیا ہے جس میں نظامی مرحوم نے اقبالؔ کی کتاب اسرار خودی کی مخالفت میں بہت کچھ تحریر کیا ہے جو کہ تصوف کی حقیقت اور اس کی بنیادی باتوں سے متعلق ہے۔ کہیں کہیں پسندیدگی کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ہی لکھا گیا ہے کہ علامہ اقبالؔ کے بقول اسرار خودی انہوں نے خود نہیں بلکہ ان سے یہ کتاب لکھائی گئی تھی اور شاد عظیم آبادی کے نام خود علامہ کا ایک خط کتاب کے صفحہ نمبر ۲۳۳ پر درج ہے جو کہ Confidential تھا اس بارے میں دلیل فراہم کرتا ہے کہ خواب میں مولانا رومؒ نے ان کو یہ مثنوی اسرار خودی لکھنے کی ترغیب دی تھی۔ اس معاملے کو طول دیئے بغیر اسی ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں کہ

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

دیگر عنوانات کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں ایک اور عنوان نظر سے گذرتا ہے یعنی ابوالکلام آزاد اور الہلال، اہل علم و

دانش سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ مولانا آزاد مرحوم کے رسالہ الہلال نے برصغیر میں اپنے زمانے میں اپنی عظمتوں اور شہرتوں کا ڈنکا بجایا تھا۔ اس رسالے میں آزاد کے قلم سے فکر انگیز اور انقلابی نوعیت کے مضامین چھپتے تھے اور ادبی حلقوں میں اس کی بہت مقبولیت تھی۔ یوپی اردو اکیڈیمی نے سالہا گذرنے کے بعد الہلال کے تمام شماروں کو بازیافت کر کے نئے سرے سے طباعت کے زیور سے آراستہ کیا تھا۔ اپنے اس مقالے میں پروفیسر حیدری نے اس کی پوری جانکاری فراہم کی ہے اور وہ یوپی اردو اکیڈیمی کے اس اہم ترین کام کو حوصلہ افزا اور اچھے الفاظ کے ساتھ سراہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ الہلال کے ان علمی نوادرات کی تلاش میں پروفیسر حیدری ایک عرصہ تک جستجو کرتے تھے۔ الہلال سے متعلق اس مقالے میں زیادہ تر ''جنگ طرابلس'' کے احوال قلم بند کیے گئے ہیں۔ آزاد کے طرزِ اسلوب کے طور پر ناموران غزوۂ طرابلس کے تحت فاطمہ بنت عبداللہ پر ذیل کا دلخراش اور نادر و نایاب مضمون درج کیا گیا ہے جس کو پڑھ کر مولانا آزاد کی اردو زبان اور طرز نگارش کا ایک عمدہ نمونہ نظر آتا ہے:

''چند دل کے ٹکڑے، میں جن کو صفحوں پر بچھانا چاہتا ہوں، کیونکر بچھاؤں۔ چند آنسو ہیں جن کو کاغذ پر پھیلانا چاہتا ہوں کیونکر پھیلاؤں آہ! ان لفظوں کو کہاں سے لاؤں جو دلوں میں ناسور پیدا کر دیں۔

آہ! اپنے دل کے زخموں کو کیونکر دکھاؤں کہ اوروں کے دل بھی زخمی ہو جائیں۔ پتھر میں سوراخ ہو جاتا ہے مگر جب دل پتھر کے بن جاتے ہیں تو ان کا پگھلنا محال ہے اور کائنات انسانیت میں جتنی زندگی ہے دل کے ناسوروں اور جگر کے زخموں کے دم سے ہے۔

جب تک دل زخمی ہیں، روح تندرست ہے لیکن جس دن دلوں کے زخم بھر گئے ہیں اس دن یقین کیجیے کہ آپ زندگی سے بھی خالی ہو گئے۔ آج کے نمبر کے ساتھ ایک خاص صفحہ تصویر کا شائع کیا جاتا ہے مگر میں آنکھوں کا طالب نہیں ہوں جو اس کو دیکھیں۔ دل کا طالب ہوں جو اس کو پڑھیں۔ پھر کوئی ہے جو اپنے پہلو میں دل رکھتا ہو''۔

(صفحہ نمبر ۲۵۷)

مقالے میں پروفیسر اکبر حیدری نے اس ''غزوہ طرابلس'' میں شہادت پانے والی ایک گیارہ سالہ عرب لڑکی جو کہ جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت سے سرشار فاطمہ بنت عبداللہ کی ہمت اور جواں مردی کا عمدہ بیان کیا ہے۔ مثلاً یہ جملے اس شہادت پانے والی لڑکی کی تصویر دکھاتے ہیں:

''تمام ریگستان میں موت اور ہلاکت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس وقت اس بہشت زار شہادت کی حورعین فاطمہ کہاں ہے وہ بدستور اپنے ایک ہی کام میں مشغول ہے۔ اس کی دائمی رفیق مشک اور اس کی پیٹھ پر ہے دھوئیں اور تپش کی شدت سے چہرہ جھلسا ہوا ہے۔ بالوں پر سرخی مائل ریت کی تہہ جمی ہوئی ہے۔ کپڑے اس کے محبوب ''سرخ رنگ'' کے دھبوں سے رنگین ہو رہے ہیں اور اپنی مخصوص مجنونانہ محویت کے پروں سے فضائے جنگ میں اڑ رہی ہے...... ''۔

مقالہ نگار جناب اکبر حیدری کشمیری کی گہری نظر الہلال کے کس شمارے میں ٹھہری تھی اس کا اندازہ درج ذیل سطور سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تحقیقی کاوش اور تجسس کا کیا حال تھا۔ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئے ایک پرچے میں درج یہ عبارت پڑھنے کے قابل ہے۔

کئی شماروں میں (یکم جولائی ۱۹۱۴ء صفحہ ۲۴ وغیرہ) فہرست کتاب میں ان کے (اقبال) مجموعہ کلام کا بھی ذکر موجود ہے جو ۱۹۱۴ء (اقبال کی مختلف نظمیں) شائع ہوا تھا اور جس کی

قیمت ۸ آنے تھی۔اس کے علاوہ مطبوعہ ۱۵ جولائی ۱۹۱۴ء صفحہ.....میں اقبالؔ نے مینیجر دی مینوفیکچر ممبئی و دہلی کو'' تاج روغن و آملہ بنولہ'' کی شہرت کے اشتہار کے لیے جو خط لکھا تھا وہ درج ہے اور یوں ہے:

''یہ کہہ سکتا ہوں کہ تاج کے استعمال سے دماغ کو آرام اور قلب کو راحت ملتی ہے۔مجھے یقین ہے کہ یہ خوش رنگ اور مصفا تیل ہندوستان کے دل و دماغ پر حکومت کرے گا''۔

(صفحہ ۲۶۳)

یہ مقالہ پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزادؔ اور اقبالؔ کے درمیان باضابطہ خط و کتابت چلتی تھی اور دونوں حضرات ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔علامہ اقبالؔ ابوالکلام آزادؔ کا الہلال غور و فکر سے پڑھتے تھے۔

کتاب زیر مطالعہ میں مصنف کتاب پروفیسر اکبر حیدری کا آخری مقالہ'' خواجہ غلام السیدین'' ہے۔اس عنوان کے تحت مقالہ نگار نے خواجہ صاحب کا بھرپور اور تفصیلی تعارف دیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ خانوادۂ مولانا حالیؔ کے چشم و چراغ تھے۔یہ مقالہ پڑھ کر اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں سر زمین کشمیر کو کیسی کیسی علم دوست اور ادب نواز ہستیاں نصیب ہوئی تھیں۔جن میں محمد دین تاثیرؔ، خوشی محمد ناظرؔ جیسے نابغۂ روزگار شامل تھے۔خواجہ غلام السیدین نے اپنی قابلیت اور صلاحیتوں سے کشمیر کے تعلیمی نظام کو بہت بلندیوں تک پہنچایا تھا۔

مقالہ میں ۱۹۳۵ء میں پانی پت میں مولانا حالیؔ کی صد سالہ سالگرہ کا جشن منانے کی بھی کچھ روداد نظر آتی ہے جس میں علامہ اقبالؔ نے بھی شرکت کی تھی۔اس جشن میں تلاوت کلام اللہ کے بعد ماسٹر لئیق احمد صاحب ٹیچر حالیؔ اسکول نے اقبالؔ کے خیر مقدمی اشعار سنائے تھے۔ان میں سے دو اشعار اس طرح ہیں ۔

طواف مرقد حالیؔ سزد ارباب معنی را
نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگ گل افشانم

یہ مقالہ پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے سخنور ادیب اور شاعر حضرات ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔اگر کوئی باہمی اختلاف بھی ہوتا تھا تو اس کو نیک نیتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ رفع دفع کرتے تھے اور اس طرح ایک صحت مند ادب کی تخلیق عمل میں آئی تھی۔اس کے برعکس اگر دیکھا جائے کہ آج کے زمانے میں اکثر قلم کار حضرات ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچتے ہیں اور پگڑی اچھالتے ہیں۔زیادہ تر مادی منفعت کی دیوی کے گرد چکر لگاتے ہیں اور اپنی شہرت کے طالب نظر آتے ہیں۔

خواجہ غلام السیدین والا مقالہ واقعی پُر مغز ہے اور بہت تحقیقی ہے۔یہ مقالہ پڑھ کر انسان کی نظریں اُس زمانے پر ٹھہرتی ہیں کہ کس طرح اور کس انداز سے علم و ادب کے وہ چاند ستارے اپنی روشنی سے سب کو منور کرتے تھے۔مقالہ میں حضرت علامہ اقبالؔ کے کئی خطوط بھی شامل ہیں جو کہ سیدین کے نام لکھے گئے تھے۔یہ خطوط آج بھی اپنی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر قابل مطالعہ اور سود مند ہیں۔

اس مقالے میں ڈاکٹر نکلسن کے اسرار خودی کے انگریزی ترجمہ کا بھی ذکر ہے کہ وہ اسرار خودی سے متاثر ہو کر اس کا ترجمہ کرنے پر مائل ہو گئے تھے مگر کہیں کہیں فارسی الفاظ ٹھیک طرح سے نہ سمجھنے کی وجہ سے ترجمہ غلط کیا ہے جس سے معنی اور مفہوم بری طرح متاثر ہو گیا ہے۔ مقالہ کے آخر پر خواجہ غلام السیدین صاحب کا ایک مضمون'' ڈاکٹر اقبال دانائے راز'' کے عنوان سے شامل

کتاب کیا گیا ہے۔ یہ مضمون بہت ہی بصیرت افروز ہے اور ہیرے اور جواہرات سے تولنے کے قابل ہے۔ اقبالیاتی ادب میں یہ ایک خاصا اضافہ ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ کتاب اقبال احباب و آثار واقعی پروفیسر حیدری کشمیری کی ایک قابل ستائش تصنیف ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر یہ اندازہ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ مصنف مرحوم نے کتنی محنت کی ہوگی اور کس قدر تحقیق کی گہرائیوں میں اترے ہوں گے۔ زمانہ قدیم کی کتابوں، مسودات، رسائل، اخبارات وغیرہ تک رسائی حاصل کرنا انہی کا قلب وجگر تھا جبھی تو یہ دُرہائے تابدار ہاتھ آئے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حیدری صاحب کی روح کو جنت الفردوس نصیب کرے۔ کلچرل اکیڈیمی کے اردو سیکشن میں کام کرنے والا عملہ بھی مبارک بادی کا مستحق ہے کہ انہوں نے اس نادر الوجود مسودے کو بازیافت کر کے انتھک محنت سے زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ امید ہے کہ وہ عنقریب اس کی باقی جلدیں بھی منظر عام پر لائیں گے تاکہ تشنگان علم اور اقبالیات کے شیدائیوں کی علمی پیاس بجھائیں گے۔ کتاب بلا ریب اقبالین کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ موجودہ سیکرٹری کلچرل اکیڈیمی جناب خالد بشیر بھی اس نیک کام کے لیے تحسین کے مستحق ہیں۔

مگر بہت حسرت اور دل سوزی کے ساتھ راقم تبصرہ یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ تادم تحریر وعدوں اور یقین دہانیوں کے باوجود بھی اقبال، آثار و احباب ۳ جون ۲۰۲۰ء کتاب کی باقی جلدیں نہیں چھپ گئی ہیں۔ تب سے بہت سارے سربراہانِ اکیڈمی بھی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ بقول غالبؔ ے

تیرے وعدے پہ جئے ہم کہ یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اقبالیات اور "زمانہ" کانپور

از پروفیسر اکبر حیدری

پروفیسر اکبر حیدری نہ تعارف کے محتاج ہیں اور نہ ہی تعریفوں کے۔ آپ برصغیر ہندو پاک کے ایک قدآور ادیب اور اردو زبان وادب کے مسلمہ استاد تھے۔ اپنی علمی کاوشوں اور قلمی خدمات کا آپ نے دیر پا اثر چھوڑا ہے اور زمانہ آپ کی اردو زبان وادب کی تحقیق وتنقید کا معترف ہے ے

اکبر حیدری صاحب نے گلستانِ اردو کو اپنی محنت شاقہ اور شب و روز کی کوششوں سے نہال کیا ہے اور اس گلستان کو رنگا رنگ پھولوں سے سجایا اور سنوارا ہے۔ جس کسی بھی ذوق سلیم اور اردو ادب کے ساتھ محبت رکھنے والے کو اس گلستان اردو میں ذرا چہل قدمی کرنے کا موقعہ ملے تو بلا خوف تردید اس کا قلب وذہن ان پھولوں کی مہک اور عطر بیزیوں سے سرشار ہو جائے گا۔ حیدری صاحب نے جہاں شائقین اقبالیات کی تفریح طبع کے طور پر اقبالیات کے حوالے سے بہت سارا تحقیقی مواد کتابوں اور مقالات ومضامین کی صورت میں بہم کیا ہے وہاں غالبیات پر بھی آپ کا کام قابل قدر ہے۔ اسی طرح میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور میر تقی میرؔ خدائے سخن کے تئیں بھی آپ نے اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ اسی طرح اردو کے دیگر نامی گرامی شعراء اور ادباء کے حق میں آپ کے جادو نگار قلم سے ہزاروں کی تعداد میں مضامین پاک وہند کے رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔

حال ہی میں جناب پروفیسر اکبر حیدری کی ایک اور کتاب اقبالیات اور رسالہ "زمانہ" کانپور منصۂ شہود پر آئی ہے۔ یہ کتاب مرحوم نے اپنی حیات مستعار میں ہی تحریر کی تھی مگر ان کی زندگی میں نامعلوم وجوہات کی بناء پر کتاب کا یہ نسخہ چھپ نہیں سکا بقول شاعر ے

بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

دراصل دیر آید درست آید کے مصداق اب یہ کتاب مرحوم کے لائق فرزند ڈاکٹر ظفر حیدری نے اپنے ماہنامہ ''حکیم الامت'' کے رسالے میں بطور خصوصی شمارہ شائع کی ہے اور ستمبر ۲۰۱۴ء کے ماہنامہ میں یہ اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ ماہنامہ حکیم الامت کی اپنی خاص پہچان ہے اور یہ رسالہ حیدری صاحب نے اپنے ہاتھوں سے اجراء کر کے ایک قابل صد ستائش اور مستحسن کام کیا ہے۔ اب یہ رسالہ پوری شان اور بان کے ساتھ گذشتہ 9 سال سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اقبالیات کے حوالہ سے گذشتہ برسوں میں رسالہ ہذا نے بہت ہی مواد شائع کیا ہے۔ برصغیر کے علاوہ بیرونی ممالک سے بھی علامہ اقبالؔ کے تعلق سے نامور ادیبوں اور شاعروں نے اپنے مقالات اور منظومات شائع کرائی ہیں جن کی فہرست اگرچہ لمبی ہے مگر کچھ سربرآوردہ قلم کاروں کے نام یوں ہیں۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال فرزند علامہ اقبالؔ، جناب رفیع الدین ہاشمی ماہر اقبالیات، جناب سید تقی عابدی، جناب نصر ملک، پروفیسر تسکینہ فاضل، ظہیر الدین اثر یزدانی، عرش صہبائی، اشفاق نجمی وغیرہ۔

زیر نظر حالیہ شمارہ رسالہ ''زمانہ'' کانپور کو اقبالیاتی ادب سے زینت قرطاس بنایا گیا ہے۔ رسالہ زمانہ آنجہانی دیا نرائن نگم اور ان سے پہلے ان کے والد کی سرپرستی میں شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ کی طویل ترین یعنی غالباً چالیس سال سے بھی اوپر عمر رہی ہے۔ پروفیسر اکبر حیدری نے اس کی فائلوں کی چھان پھٹک کر کے اقبالؔ سے متعلق نگارشات بصورتِ نظم ونثر بڑی عرق ریزی سے چن لی ہیں اور ان تمام مضامین و منظومات کو ایک کتابی شکل دے کر عاشقانِ علم وادب اور عقیدت مندانِ اقبال کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ کی صورت میں علمی دسترخوان پر سجا کے رکھا ہے۔ اقبالیاتی ادب پر مشتمل یہ نادر علمی مواد ایک صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے کہ آج سے ایک صدی قبل اردو زبان وادب کی کیا شان و شوکت تھی۔ غیر منقسم ہندوستان میں کیسے کیسے نامورانِ اردو، شاہسواران قلم پیدا ہوئے تھے۔ اس زمانے میں اردو کا طوطی بول رہا تھا۔ کیا یہ وہی زمانہ تھا جب اردو زبان اپنے جوبن پر تھی اور اس کی آبیاری کے لیے مولانا شبلیؔ، مولانا حالیؔ، منشی پریم چند، چکبستؔ، نوبت رائے نظرؔ، دیا شنکر نسیمؔ، سرسید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، شیخ عبدالقادر مدیر مخزن، سرور جہاں آبادی او رعلامہ اقبالؔ جیسے سربرآوردہ شخصیات موجود تھیں۔

دیگر علمی وادبی نوعیت کے اخبارات ورسائل کے ساتھ ساتھ ''زمانہ'' نے اپنی چھاپ بٹھائی تھی اور اپنا لوہا منوایا تھا۔ قادر الکلام شاعر اور تجربہ کار ادیب و انشاء پرداز اپنی نگارشات اس رسالہ میں طبع کراتے تھے۔ چونکہ علامہ اقبالؔ کے الہامی کلام نے سب کو اپنی طرف مائل کیا تھا۔ جہاں ان کا کلام رسالہ مخزن میں چھپتا تھا وہاں زمانہ میں بھی ان کی شعر وشاعری اور شخصیت کے حوالہ سے کلام اور مضامین چھپتے تھے اور سخنورانِ وقت اپنی آراء و خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ زمانہ کی فائلوں میں اقبالیاتی علم وادب سے متعلق بہت کچھ مواد جمع ہو گیا اور اسی طرح زمانہ نے اس حوالہ سے بیش بہا خدمت انجام دی تھی۔

چنانچہ پروفیسر اکبر حیدری ایک آزمودہ کار اور کہنہ مشق ادیب تھے۔ اس کے ساتھ وہ محقق بھی تھے اور نقاد بھی۔ وہ ایک جوہری کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں وہ ہمہ وقت علم وادب کے جواہر ریزوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ جہاں تک ان کی زیست کا تعلق ہے اور ان کے علمی کارنامے متلاشیوں کے سامنے ہیں تو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی جھجک نہیں رہ گئی کہ وہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ فارسی کے بھی دلدادہ تھے اور اردو کے ساتھ ان کو عشق تھا۔ وہ روز وشب محنت کر کے علمی اور ادبی دریافتیں کرتے تھے۔ وہ معتبر محقق تھے۔ چنانچہ فرزند اقبال

ڈاکٹر جاوید اقبال اس طرح رقم طراز ہیں:

اکبر حیدری صاحب کے تحقیقی مضامین عموماً ٹھوس بنیادوں پر ہوتے ہیں۔''پروفیسر اکبر حیدری کی اکثر کتابیں میری نظر سے گذری ہیں۔ان کی وساطت سے اقبالیات کے کئی گوشے نمایاں ہوئے ہیں۔میں ان کے تحقیقی کاموں سے واقف ہوں۔تحقیقی ادب میں ان کے حوالے عموماً ٹھوس بنیادوں پر ہوتے ہی ہیں''۔

(بحوالہ حکیم الامت' ستمبر ۲۰۱۴ء)

چنانچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ علمی نوادرات کا یہ متلاشی آدم زاد عمر بھر ریاست کشمیر کے علاوہ بیرونی ریاستوں کے کتب خانوں سے استفادہ کرتا رہا مختلف مقامات اور مشہور ومعروف لکھنؤ وحید آباد کی لائبریریوں سے یہ فنافی العلم پرانے زمانے کے رسالے 'اخبارات وغیرہ کھنگالتا رہا جن میں''صوفی راولپنڈی''''مخزن لاہور'' ''خدنگ نظر'' اور ''زمانہ'' جیسے رسالے قابل ذکر ہیں۔

زمانہ کے رسالوں سے حیدری کشمیری نے کافی مواد جمع کر کے اقبالیاتی ادب ترتیب دیا او راس کتاب کا نام ''اقبالیات او رزمانہ کانپور'' رکھا۔ اس کتاب کی فہرست مضامین یوں ہے:

۱۔ پیش لفظ ڈاکٹر جاوید اقبال' لاہور
۲۔ مقدمہ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری
۳۔ دعائے خیر دیانرائن نگم' ایڈیٹر' زمانہ'
۴۔ یادرفتگاں دیانرائن نگم' ایڈیٹر' زمانہ'
۵۔ میرے والد سری نرائن نگم
۶۔ اقبال اور زمانہ
۷۔ انتقادیات ومضامین (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۴۲ء)
۸۔ منظومات

مقدمہ میں پروفیسر اکبر حیدری 'زمانہ' کی اہمیت کے تحت لکھتے ہیں کہ: غالباً یہ امر کسی کو معلوم نہ ہوگا کہ 'زمانہ' ابتداء سے ہی ایک شریف النفس فرشتہ خود اور ایثار پسند علمی شخصیت منشی راج بہادر کی آغوش شفقت میں پروان چڑھنے لگا۔موصوف اردو کے بے لوث خدمت گذار اور مخلص خیر خواہ تھے۔انہوں نے سالہا سال تک لگا تار'زمانہ' کی اشاعت کے لیے زرکثیر صرف کیا۔

'زمانہ' کی جلدیں ہر چھ ماہ کے بعد بدل جاتی تھیں یعنی جنوری سے جون تک پہلی جلد شمارہ نمبر ۱ اور جولائی سے دسمبر تک دوسری جلد شمار کی جاتی تھی۔'زمانہ' کے ابتدائی شمارے بریلی سے اشاعت پذیر ہوئے۔جنوری ۱۹۰۵ء سے آخر وقت تک دفتر زمانہ' نیا چوک کانپور سے چھپتا رہا۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد موصوف نے 'زمانہ' جولائی۔اگست ۱۹۰۴ء سے اس کی فائلوں سے سلسلہ وار انتخاب کیا ہے۔مختلف عنوانات کے تحت 'زمانہ' کی جلدوں سے علمی مضامین' علمی خبریں او رنوٹ شعرائے کرام کی منظومات درج کی ہیں۔ترتیب وار زمانہ کی جلد نمبر' مہینہ سن اور صفحہ نمبر باضابطہ درج کیا ہے۔اس طرح مؤلف کا یہ مقدمہ بہت ہی سود مند اور فائدہ بخش نظر آتا ہے۔دانشور حضرات اور شناسان اقبال اس سے بہت حد تک استفادہ کر سکتے ہیں۔یہ بسیط مقدمہ ۳۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔یہ پُر مغز مقالہ پڑھ کر ایک صدی قبل یا اس سے زیادہ علمی وادبی معیار کی بھی جانچ ہوتی ہے۔ادیبوں اور قلم کاروں کی باہمی خط وکتابت اور اخلاص مندی بھی نظر آتی ہے۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زمانہ نے کس قسم کے خصوصی نمبرات تواریخی نسخے اجرا کیے تھے مثلاً اکبر نمبر ۱۹۰۵ء' قومی نمبر ۱۹۲۵ء' جوبلی نمبر ۱۹۲۸ء' پریم چند نمبر اور حالی نمبر۔اس کے جوبلی نمبر کے حوالہ سے لسان القوم صفی لکھنوی نے یوں لکھا تھا۔ چند اشعار ہی نقل کیے جاتے ہیں ۔

زمانہ جسے جانتا ہے زمانہ
کہ حسنِ ادب کا ہے آئینہ خانہ
نکلتا ہے اب جوبلی نمبر اس کا
تیرا شکر اے کارساز یگانہ
ہے پچیسواں سال اک جشن عزت
نے فلاک سے موجزن شادیانہ
مبارک اسے روز افزوں ترقی
کہ اردوادب کا ہے نادر خزانہ
صفی مصدق دل سے دعا ہے یہ میری
زمانہ رہے قدر دان 'زمانہ'

رسالہ زیر تبصرہ میں زمانہ سلسلۂ جدید نومبر ۱۹۰۶ء جلد ۷ نمبر ۵ سے دعائے خیر نقل کی گئی ہے۔ یہ دعا پڑھ کر ہر بنی نوع انسان کی دعا معلوم ہوتی ہے اور مخلوقات کے خالق کی بارگاہ میں بندے کی تمناؤں اور عاجزی کا اظہار کیا گیا ہے۔

مؤقر جریدہ میں یادرفتگاں عنوان کے تحت زمانہ جبلی نمبر فروری ۱۹۲۸ء صفی نمبر (۱۹۸۔۲۱۶) سے ایک اور مضمون قارئین کے لیے قلم بند کیا گیا ہے دراصل یہ مضمون زمانہ کی فائلوں سے اس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے کہ اس میں اس رسالہ کے بانی آنجہانی جناب منشی راج بہادر کی شخصیت کے بارے میں قدرے وضاحتاً لکھا گیا ہے کہ وہ کن اوصاف اور خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے خاندان اوران کی ملازمت کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔ زمانہ جاری کر کے وہ چوبیس برس تک زندہ رہے تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنا نام ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ نقصانِ کثیر پر رسالہ چلاتے رہے تھے۔ منشی راج بہادر کو رفاہ عام کے کاموں کا دلی شوق تھا۔ وہ ملک کی قومی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے خواہاں تھے۔ چنانچہ ان کے فرزند لکھتے ہیں۔ منشی راج بہادر کی ذات گرامی پر اس رسالے کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔ دنیا میں کوئی شخص نہ ہمیشہ رہا ہے اور نہ رہے گا لیکن منشی راج بہادر کے اخلاص و حب الوطنی کی یاد عرصہ تک دلوں میں باقی رہے گی۔

یادرفتگاں کے ظہور پر مضمون نگار نے اکبر اللہ آبادی مرحوم کا بڑی دلسوزی کے ساتھ ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ اپنی تخلیقات زمانہ ہی میں شائع کراتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: ''اکبر مرحوم سرکاری ملازمت کے زمانہ میں کانپور رہ چکے تھے اور ایڈیٹر 'زمانہ' کے بزرگوں کے عنایت فرما تھے جس کی وجہ سے وہ اس پر ہمیشہ خاص طور پر مہربان رہے اور ان کا بہترین کلام زمانہ میں ہی شائع ہوا ہے۔ آہ! اب ایسے وضعدار و عالی خیال بزرگ کہاں دیکھنے کو نصیب ہوں گے۔ ادنیٰ ادنیٰ امور کا بھی لحاظ فرماتے تھے۔ نجی خط وکتابت میں ذرا ذرا سی بات کی داد دیتے تھے۔ ۱۹۰۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آپ ایسے قابل اور وسیع المشرب نوجوانوں کی درحقیقت ملک کو ضرورت ہے۔ خدا کامیاب کرے اس قدر انگریزی پڑھ کر شاید ہی ایسی طبیعت رہ جاتی ہے''۔

مضمون نگار نے اپنے مضمون میں بابو گنگا پرشاد ورما اور سوامی راج تیرتھ جی مہاراج کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''اپنے زمانے کے یہ مشہور و معروف ادیب کس طرح اپنی نگارشات اور تخلیقات سے رسالہ 'زمانہ' کو سرفراز کرتے تھے اور ان کی تخلیقات کی بھی کیا قدر و قیمت تھی''۔

اسی طرح مولانا شبلی نے اپنی غزلیں اور ایک خاص نظم بھیج کر 'زمانہ' کی قدردانی کا ثبوت دیا تھا۔ مولانا حالی جیسے یگانہ روزگار نے بھی سرسید کی زندگی پر اپنا مضمون 'زمانہ' کو ارسال کیا تھا۔ اپنے ایک خط میں ایڈیٹر کے نام یوں زمانہ کے بارے میں لکھا تھا:

''زمانہ' کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اور اس کو ان

منتشی رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو اردو لٹریچر کو شائستگی کے خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں۔ میری آرزو دلی ہے کہ 'زمانہ' نہ صرف اشاعت میں بلکہ شائستگی کے خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں اور جو صلح کل مسلک اس نے اختیار کیا ہے اس سے سر موتجاوز نہ کرے۔ زمانہ کی خوش نصیبی سے تمام بزرگان قوم و راہنمایان ملک کی امداد شامل حال رہی ہے"۔

اسی طرح متواتر مضمون ہٰذا میں ایڈیٹر "زمانہ" جناب دیا نرائن نگم صاحب نے آنریبل بشمبھر ناتھ، شاد عظیم آبادی، شمس العلماء خان بہادر، منشی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی اور کئی دیگر بلند قامت تخلیق کاروں اور ادب نوازوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے مضامین و منظومات کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ دو خاتون مضمون نگاروں یعنی شریمتی ہر دیوی جی بھارت بھگتی لاہور کی ایڈیٹر اور بزرگ قوم لالہ روشن لال صاحب کی اہلیہ محترمہ کا نام بھی لکھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آنجہانی چاند رانی کا نام بھی درج کیا ہے۔

جب زمانہ جیسے انمٹ نقوش چھوڑنے والے جیسے جریدہ میں اس معیار کے محبین ادب کی قلمی معاونت شامل حال رہ چکی ہو اور ایسے سربرآوردہ اور یادگار زمانہ لوگ اس کے لکھنے والوں میں شامل رہے ہوں تو زمانہ اپنی قسمت پر ناز نہ کرے تو کیا کرے۔ ایسے خلوص کیش اور دردمند دل رکھنے والے حضرات آج کے زمانے میں شاذ ہی نظر آتے ہیں اور اس طرح پروفیسر اکبر حیدری مرحوم مؤلف کتاب نے ماضی قریب کے ادیبوں کی ادبی کہکشاں سے اسی قسم کا لٹریچر فراہم کر کے اپنی حقیقی ادبی شناخت قائم رکھی ہے۔

ایسے ہی 'زمانہ' فروری و مارچ ۱۹۴۳ء یادگار نمبر سے "میرے والد" کے تحت جناب سری نرائن نگم ایم اے کا ان کے والد کے بارے میں آٹھ صفحات پر مشتمل ایک بصیرت افروز مضمون تحریر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون پڑھ کر ذوق سلیم اور قلب صادق رکھنے والے کے لیے حقیقی ادیبوں اور صحت مند ادب اور فن کی جان پہچان ہوتی ہے۔ صاحب مضمون نے اپنے آنجہانی والد کے گوناگوں انسانی صفات احترام آدمیت، اعلیٰ ظرفی، کسر نفسی، علمی دوستی، حلم، ہمدردی وغیرہ اقدار کا بھرپور تذکرہ عمل میں لایا ہے۔ آج کی دنیا ان فرشتہ صفات اور انسان دوست اشخاص سے بہت حد تک خالی نظر آتی ہے۔ مضمون میں درج ذیل سطور قابل مطالعہ ہیں۔

منشی راج بہادر صاحب ریاست رام پور کے سچے بہی خواہ اور سچے ہر دلعزیز، بے لوث افسر تھے۔ انتہائی دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے علاوہ وہ ریاست میں کسی سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔

منشی راج بہادر کا خاصہ تھا کہ جس کام کو شروع کرتے تہہ دل سے کرتے۔ ان کی آنکھ میں مروت اور دل میں درد تھا۔ وہ دولت مند نہ تھے لیکن خلوص اور نیک نیتی کی بدولت ان کے ہاتھ میں جیس اور ان کے روپے میں برکت تھی۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ صرف کام سے غرض رکھتے تھے نام سے نہیں۔

صاحب مضمون یاد رفتگاں میں رسالہ "زمانہ" کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں۔ "زمانہ" پر مولانا حالی کی مزید عنایات کا حال معلوم کرنا ہو تو ذیل کی سطور ملاحظہ فرمایئے:

" 'زمانہ' کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اور اس کو ان منتشی رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو اردو لٹریچر کو ناشائستگی اور خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں۔ "زمانہ" صرف اشاعت میں بلکہ شائستگی و تہذیب میں روز افزوں ترقی کرے اور جو صلح کل مسلک اس نے اختیار کیا ہے اس سے سر موتجاوز نہ کرے۔ زمانہ کی خوش نصیبی سے تمام بزرگان قوم و رہنمایان ملک کی امداد شامل حال رہی ہے"۔

غرض اس مضمون سے ''زمانہ'' کے خدوخال بہت حد تک واضح ہوجاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں سخن شناسان اردو ادب کی نظر میں اس رسالہ کی کیا قدرومنزلت تھی۔ مرحوم نے 'زمانہ' کو پروان چڑھا کر چمن اردو میں ایک نئے پود ے کو ایک پھلتا پھولتا درخت بنادیا۔ان کے زیر ادارت 'زمانہ' نے ملک کے رسائل کی پہلی صف میں ایک ممتاز درجہ حاصل کیا ہے۔گذشتہ چالیس سال میں ملک میں اردو کا کوئی اہل فن ایسا نہیں گذرا جس نے ''زمانہ'' کی قلمی معاونت سے دریغ کیا ہو۔

ان کے دم سے شعروسخن کے خوب چرچے رہتے تھے ۔راقم الحروف نے اپنے لڑکپن سے ناموران فن کی علمی صحبتوں کو دیکھا۔منشی پریم چند، سرور اور نظر کی صحبتیں بڑی پُرلطف ہوتی تھیں۔منشی پریم چند بڑے ہنس مکھ اور زندہ دل تھے۔ان کے قہقہوں کی صدا مکان کے تیسری منزل تک جاتی تھی۔نظر زیادہ سنجیدہ تھے لیکن چٹکیاں غضب کی لیتے تھے۔سرور رند بے ریا تھے۔کبھی روٹھتے کبھی منتے تھے اور طبعاً بڑے شرمیلے تھے ۔آخر پر سری نرائن نگم نے اپنے والد کی علامت کا حال اوران کی وفات سے متعلق لکھا ہے اور اس طرح پڑھنے والوں کے لیے اپنے قلم سے ادب لطیف کی عکاسی کی ہے۔

زیر نظر کتاب میں ''زمانہ'' بابت جنوری ۱۹۱۹ء صفحہ نمبر ۵۲ سے ایک اور دلچسپ مضمون لیا گیا ہے اور اس کا عنوان ہے کلام اقبال۔

ابتداء میں ہی علامہ اقبال کا ایک فارسی قطعہ درج ہے جو چار اشعار پر مشتمل ہے۔اس قطعہ پر بھولا ناتھ لفٹننٹ کرنل نے تنقید کی تھی اور صحتِ زبان کے تعلق سے اس قطعہ کی خامیوں کا تذکرہ کیا تھا۔مگر پہلے علامہ اقبال کی شہرت اور شاعرانہ عظمت کا بھرپور اعتراف کیا تھا۔پھر مذکورہ قطعے میں عروض اور محاورہ کے سقم کا اظہار کیا تھا اور دلائل پیش کیے تھے۔مرحوم بھولا ناتھ نے حضرت علامہ کے فارسی قطعہ کے اشعار پر عروض اور محاورہ میں سقیم جگہوں کی نشاندہی کر کے لکھا تھا کہ:

''بہت ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے دوست سمند خوش خرام کا جولان اردو ہی کے میدان میں ہی محدود رکھتے۔فارسی کی زمین سنگلاخ پر آپ کا اسپ تازی ناخن لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے''۔

مگر اسی کے ساتھ ''زمانہ'' جنوری ۱۹۱۹ء صفحہ ۱۷۳ سے عنوان مباحثہ ڈاکٹر اقبال و کرنیل بھولا ناتھ'' کے تحت خواجہ عبدالواحد ندوی سابق ایڈیٹر الہلال کا ایک طویل مراسلہ اقبال کے دفاع میں نقل کیا گیا ہے۔اس مراسلے میں جناب عبدالواحد ندوی صاحب نے نمبروار معترض کے جواب میں پوری وضاحت اور استادانہ مہارت سے لکھا ہے اور اس طرح محاکمہ اقبال و بھولا ناتھ کے متعلق یہ مضمون موجودہ دور کے طالب علموں کے لیے کافی حد تک راہنمائی کا کام دے سکتا ہے اور علم عروض اور اوزانِ شعروشاعری کے لحاظ سے اپنا کردار اچھی طرح نبھا سکتا ہے۔

یہ مضمون اور اس کا جوابی مضمون پڑھ کر ایک صدی سے زیادہ یعنی ۱۹۱۹ء کا ''زمانہ'' نظروں میں گھومنے لگتا ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے کہ علم و دانش کے کیسے کیسے تابناک اور روشن ستارے آسمان ادب پر ضوفشاں تھے اور وہ کس باریک بینی سے بلند و بالا شاعروں کے کلام کا جائزہ لیتے تھے۔کیا ہندو اور کیا مسلمان؟ بلا امتیاز دونوں نے گلشنِ ادب کی آبیاری کر کے اس کے پھولوں کو نکھارا ہے اور ہمیشہ کے لیے نقشِ دوام حاصل کیا ہے۔کتاب اقبالیات اور ''زمانہ'' کانپور میں اور بھی بہت سارے عنوانات نظر آتے ہیں مثلاً اقبال اور تصوف از مسٹر دیال پرشاد مہتا ''زمانہ'' مارچ ۸ ۱۹۳ء، اقبال کے اردو کلام کی چند خصوصیات از سید مقبول حسین احمد پوری ''زمانہ'' جلد ۷۰ نمبر ۳۰ مارچ ۸ ۱۹۳ء اقبال کا تعلیمی فلسفہ 'زمانہ' جولائی ۱۹۴۰ء تنقید کتب از بیگم اقبال کا پیغام' ڈاکٹر اقبال اور فلسفہ عشق از کمال

عظیم آبادی زمانہ جون ۱۹۴۳ء ان سبھی مضامین پر الگ الگ تبصرہ کرنا باعث طوالت ہوگا۔ کیونکہ آج کا انسان جدید سہولیات کی زد میں ہے اور باریک نظروں سے کتب بینی کا شوق بہت حد تک مفقود نظر آتا ہے۔

المختصر! قارئین حکیم الامت کے لیے یہ رسالہ نما کتاب ایک قیمتی تحفہ ہے بیسویں صدی میں وجود میں آنے والے ادبی مجلہ یعنی زمانہ نے اکیسویں صدی میں زندگی بسر کرنے والے شائقین اردو ادب اور دلدادگانِ اقبالیات کے لیے رونما ہوکر اُن کے دل جیت لیے ہیں۔ یہ دراصل مجنون صفت پروفیسر اکبر حیدری ہی کا دل وجگر ہے کہ یہ جواہر ریزے اور نوادرات علم وادب سجا کر اور سنوار کر پیش کیے ہیں۔

یہ مرحوم حیدری نے عمر بھر خون تھوکا ہے اور ادبی مجنون کے مانند صحرانوردی کی ہے جبھی تو یہ نگارشات بے بہا' یہ سونے اور چاندی سے تولنے کے لائق پرانے زمانے کے رسالوں اور مخطوطات سے ادبی اور علمی مضامین منظومات وغیرہ اپنے گنجینۂ کتب میں احتیاط سے رکھے تھے اور دھیرے دھیرے یہ انمول جواہرات طالبین علم کی خدمت میں پہنچ کر ان کے لیے تشفی اور اطمینان کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

رسالۂ حکیم الامت میں سمٹنے والی یہ کتاب ایک گلدستہ ہے بلکہ ایک لہلہاتا گلستانِ سدا بہار ہے۔ اقبالیاتی ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔ اقبالؔ شناسوں کے لیے سرمۂ بصیرت ہے خود حضرت اقبالؔ کی خدمت میں بطور عقیدت نذرانہ ہے۔ لائبریریوں اور ردانش گاہوں میں اس کا موجود ہونا لازمی ہے۔ کتابت' چھپائی' دیدہ زیب ہے اور گیٹ اَپ بہت عمدہ ہے۔ کتاب کا انتساب وادی گلپوش کے معروف شاعر جناب گلشن خطائی کاشمیری کے نام کیا گیا ہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ماہنامہ 'حکیم الامت' کا
نعتِ رسولؐ نمبر

مرحوم پروفیسر اکبر حیدری برصغیر کے ایک معروف ادیب اور محقق تھے۔ اردو زبان وادب کی تئیں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ غالبیات' اقبالیات' انیسیات اور دیگر اردو اور فارسی ادب کے ناموران اور جگمگاتے ستاروں پر ان کے مقالات اور تحقیقی مضامین بلا کسی خوفِ تردید کے سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کی تحقیق اور تنقید ٹھوس بنیاد پر ہوتی ہے۔ اردو ادب کے سرپرست ہونے کے ناطے ان کے قلم گوہر بار سے درجنوں کتابیں منظر عام پر آگئی ہیں۔ جنہوں نے ادبی اور علمی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ کتابوں' مقالات اور دیگر علمی مضامین کے ساتھ ساتھ پروفیسر مرحوم نے اگست ۲۰۰۶ء میں سرینگر کشمیر سے ایک ادبی رسالے یعنی ''حکیم الامت'' کا اجرا بھی عمل میں لایا۔ رسمِ رونمائی کی تقریب سعید کلچرل اکادمی سرینگر کے سمینار ہال میں انجام دی گئی تھی اور اس موقعہ پر کشمیر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور دانشوروں کی ایک کہکشاں موجود تھی۔ سمینار ہال ادبی ذوق رکھنے والوں سے بھرا پڑا تھا۔ اولین شمارے کے لیے اس وقت کے صدر ہند مرحوم اے پی جے عبدالکلام کا تہنیتی پیغام بھی چھپ چکا تھا جو انگریزی میں تھا۔

اس کے بعد کئی سال تک پروفیسر اکبر حیدری کی ادارت میں اس جریدہ کے کم سے کم بہتر (۷۲) شاندار شمارے زیور طبع سے آراستہ ہوکر دادِ تحسین حاصل کرتے رہے۔ مرحوم ''حکیم الامت'' کے اپنے وقت کے شماروں میں بہت عمدہ قسم کے مقالات اور تحقیقی مواد پر مشتمل مضامین قلم بند کرتے رہے۔ خاص کر علامہ اقبالؔ کی شعروشاعری' فن اور فکر اقبال کے فروغ کے لیے مرحوم حیدری صاحب نے بہت کچھ مواد فراہم کیا۔ غالبؔ اور قدیم زمانہ کے شعراء کرام کے بارے میں بھی

رسالہ ''حکیم الامت'' نے قابلِ قدر کام کیا۔ بہت سارے غیر مطبوعہ مضامین بھی رسالہ کی زینت بن گئے۔ بیرونی ممالک سے بھی نامور ادیبوں اور قلم کاروں کے مضامین آتے رہے اور اس طرح مختصر وقت کے اندر اندر اس دیدہ زیب جریدہ نے اپنے بال و پر پھیلائے اور دور دور تک اپنا پیغام پھیلا کر شہرت کی بلندیوں کو چھولیا۔ بانی رسالہ یعنی ڈاکٹر اکبر حیدری رسالہ کے محاضرات والے صفحوں پر قلم کاروں اور شاعروں کے فوٹو گراف بھی چھاپتے رہے۔ اس طرح یہ رسالہ اور بھی دلکش بن گیا۔ ساتھ ہی ساتھ قدیم وقتوں کے شعرائے کرام وسلاطین کے نایاب یا کمیاب تصویریں بھی کبھی کبھی اس میں چھاپ لیں۔ مثلاً واجد علی شاہ مرحوم، محمد حسین آزادؔ والیِ حیدر آباد دکن میر عثمان علی خان کی تصویروں سے بھی اپنے رسالہ کو چار چاند لگائے۔ مگر اے وائے بقولِ غالبؔ ؎

رو میں ہے رخشِ عمر دیکھئے کہاں تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ ہے پا رکاب میں

بالآخر برِ صغیر ہندو پاک کا یہ نامور ادیب اور یکتائے زمانہ قلم کا مردِ آہن بھی موت کے تیز پنجوں کا شکار ہو گیا اور فرمانِ الٰہی کُلُ نَفْسٍ ذائقۃُ الْمَوت کے سامنے بہت چاہنے والوں کو غم زدہ چھوڑ کر عالمِ عقبیٰ کو سدھار گیا۔۔۔۔۔اناللہِ وَانا الیہِ راجعُون!

پروفیسر اکبر حیدری صاحب کی وفات کے بعد رسالہ ''حکیم الامت'' کو جاری وساری رکھنے کی ساری ذمہ داری اُن کے فرزند جناب ڈاکٹر ظفر حیدری کے کندھوں پر پڑگئی۔ گوکہ اکثر قارئین کا یہی خیال تھا کہ ظفر صاحب اس عظیم ذمہ داری کو شاید نبھا نہیں پائیں گے اور باپ کے مشن کو غالباً ادھورا چھوڑیں گے۔ مگر بقول شاعر ؎

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

والدِ مرحوم کی وفات کے بعد اس قابل اور باصلاحیت بیٹے نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ آپ کے والد کے مشن کو برابر کامیابی کے ساتھ آگے بڑھاتے رہے۔ والد کی وفات کے غم واندوہ کے عمیق سمندر میں ڈوب کر بھی اس جوان سوال ایڈیٹر نے رسالہ ''حکیم الامت'' کا معمول کا شمارہ اپنے وقت پر منظرِ عام لایا اور آج بھی اپنی ہمت وجواں مردی سے وہ یہ رسالہ اپنے وقت بلکہ کبھی کبھی sheduled time سے قبل بھی نکالتے رہتے ہیں۔

وقتاً فوقتاً دانشور او رعلمی شخصیات نے پروفیسر اکبر حیدری کے مبارک ہاتھوں سے اجرا شدہ ماہنامہ ''حکیم الامت'' کے بارے میں اپنی آراء اور زریں خیالات کا اظہار کیا ہے جس میں قابلِ ذکر فرزند اقبالؔ مرحوم جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا:

''جہاں تک میری نظر ہے کہ بھارت کا مجھے معلوم نہیں البتہ پاکستان بھر میں مجھے اس جیسا (یعنی رسالہ ''حکیم الامت'') رسالہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح دیگر اہل دانش جیسے محترم ظہیر الدین اثرؔ یزدانی جمالیؔ، ڈاکٹر سید تقی عابدیؔ، ڈاکٹر سید عباس علی شاہ عرفان علی اور بہت سارے ادیبوں اور شاعروں نے اس رسالہ کی اپنے مکتوبات، مراسلات اور پیغامات کے ذریعہ سراہنا کی ہے اور اس کے ادبی معیار کو پرکھا ہے۔ ہنوز یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ یہ سارے مراسلات بطور ثبوت ماہنامہ متذکرہ کی فائلوں میں چھپ چکے ہیں۔ دراصل یہ مرحوم حیدری صاحب کی علم وادب اور اردو زبان وادب کے ساتھ والہانہ الفت اور شیفتگی تھی کہ دبستانِ اردو کا یہ سرسبز اور تناور درخت لہلہاتا نظر آتا ہے''۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ڈاکٹر ظفر حیدری کے سر یہ سہرا بھی بندھتا ہے کہ آپ نے حال ہی میں ایک خصوصی شمارہ ''نعتِ رسول ﷺ نمبر'' بھی شائع

کیا ہے۔ یہ شمارہ جنوری ۲۰۱۶ء کا ہے۔ اس خصوصی شمارے کی اپنی علیحدہ اہمیت اور پہچان ہے۔ سب سے بڑھ کر اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ سرتاج انبیاء امام الاولیاء تاجدار نبوت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ اُن کی ذات مقدسؐ کے بارے میں یہی کیا کچھ کم ہے کہ فرمایا گیا ہے ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ پہلے بھی مختلف علمی اداروں، اکادمیوں اور عاشقانِ رسولؐ کی طرف سے نعتیہ ادب اور نعت پر شمارے نکلے ہیں۔ مگر ''حکیم الامت'' کا نعتِ رسولؐ نمبر انفرادی ہے۔ یہ نمبر بہت ہی جاذبِ نظر اور دیدہ زیب ہے۔ اس کے ٹائٹل پر علامہ اقبالؔ کے یہ نعتیہ اشعار درج ہیں:

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

اس کے ساتھ حروف جلی میں اسمِ مقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو رنگوں سرخ اور برنگِ سفید ڈیزائن کے ساتھ لکھا ہے۔ محاضرات والے صفحے پر اس شمارے کے اہلِ قلم کی تصویریں ان کے ناموں کے ساتھ درج ہیں اور اسی کے اُلٹے صفحے میں قدیم وجدید شعرائے کرام کی خوب صورت تصویروں سے نعت نمبر کو سجایا گیا ہے۔ رسالے کا اداریہ نعت رسول نمبر کی شانِ نزول پر مشتمل ہے۔ اس نعتیہ گلدستہ کے صفحہ نمبر ۲ پر مرحوم نعوت نگاروں کی فہرست کے ساتھ بقیدِ حیات اردو شعراء کے اسمائے گرامی کی فہرست دی گئی ہے۔ پھر ابتدائی پانچ صفحات پر عربی زبان کے بیش بہا نعوت درج ہیں۔ نعتوں کے اختتام پر ان کی اردو زبان میں تشریح کی گئی ہے۔ دورِ رسالت سے تعلق رکھنے والے نعت نگاروں کے اسمائے گرامی یوں ہیں:

۱۔ سیدنا ابوطالب ۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ (المتوفی ۶۲۰ء) ۳۔ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب (المتوفی ۶۲۵) ۴۔ حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ (المتوفی ۶۴۰ء) ۵۔ حضرت علی مرتضیٰؓ (الشہید ۶۶۱ء) ۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ (المتوفی ۶۳۲ء) ۷۔ حضرت امام زین العابدینؓ (المتوفی ۷۱۲ء)

زیر تبصرہ گراں قدر نعت نمبر میں پانچ صفحات پر مشتمل فارسی زبان کے بلند پایہ اور عظیم المرتبت عاشقان نبیؐ کے گلہائے عقیدت درج ہیں جو کہ مولانا رومی، شیخ سعدیؒ، امیر خسرو دہلوی، مولانا عبدالرحمن جامیؔ، مولانا معین الدین معینی، عرفیؔ شیرازی، علامہ اقبالؔ، اسد اللہ خان غالبؔ، غلام قادر گرامیؔ جالندھری، شاہ نعمت اللہ ولی، علامہ شبلی نعمانی، ملا وجہیؔ نے اپنے اپنے زمانے میں تحریر کیے تھے۔ یہ سبھی نعوت فارسی زبان و ادب کے بہترین اور عمدہ نمونے ہیں۔ ان سبھی متوفین کی زبان دانی اور قادر الکلامی کا کوئی جواب نہیں ہے۔

''حکیم الامت'' کے اس نعت نمبر میں صفحہ ۱۶ سے لے کر صفحہ نمبر ۷۶ تک یعنی ۶۳ صفحات پر اردو نعوت کی رنگین اور آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی اور دل اور روح کو مسرور کرنے والی کہکشاں نظر آتی ہے۔ قدیم وجدید شعرائے اردو کی نعتیں اس گلدستہ کی زینت بن گئی ہیں۔ ان میں سیرتِ سرورِ عالمؐ اور مدحِ رسولؐ کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ ان شعرائے مقتدر کے ناموں کی ایک لمبی فہرست ہے جس کی تفصیل یہاں لکھنا طوالت کا باعث ہوگا۔ البتہ چند شعرائے کرام جنہوں نے شہرت پائی تھی کے اسماء یہاں درج کیے جاتے ہیں:

میر تجلیؔ، میرؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، مومنؔ، ذوقؔ، شیفتہؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، انیسؔ، دبیرؔ، داغؔ، حالیؔ، اکبر الہ آبادی، حسرتؔ موہانی، مولانا جوہرؔ، دلورام کوثریؔ، کشن پرشاد شادؔ، آغا حشر کشمیری۔

بقیدِ حیات چند اردو شعراء کے نام یہ ہیں:

شبیبؔ رضوی‘ ڈاکٹر عبدالرحمن عبدؔ‘ مرزا محمد اشفاق شوقؔ‘ اشفاق نجمیؔ‘ محبوب الرحمن نیازیؔ‘ حبیب الرحمن نیازیؔ‘ مظفر ایرجؔ‘ بشیر آتمؔ کشمیری‘ سرور خلیقی‘ مجیب احمد صدیقی‘ فرحت ایوبیؔ اور دیگر بہت سے شعراء بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

ان شعراء کی نعتیں اور مدحیہ اشعار حضرت رسالت مآبؐ کی بارگاہ اقدس میں عاشقانہ نذرانۂ عقیدت کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ اشعار پڑھ کر ایک صاحب ایمان کے پژمردہ دل کی کونپلیں تر و تازہ اور سدا بہار روپ دھار لیتی ہیں اور عاشق زار کے جذبات مچل مچل کر برانگیخت ہو جاتے ہیں۔ دل کے سمندر میں عشق و محبت کا ایک طوفان پیدا ہو جاتا ہے۔ کاش یہ نعت نمبر نکالنے والے نے مظفر وارثی کی بھی کوئی ایک نعت اس میں شامل کی ہوتی۔ شاید یہ ان سے بھول ہو گئی ہے۔ حقیقت یہی ہے مدح رسولؐ کے سمندر کو کون پاٹ سکتا ہے۔ اس سمندر کا کوئی کنارہ نہیں ہے اور اس کی گہرائی اتھاہ ہے۔

ہاں! اگر یہاں پر نموناً اس بات کا بھی تذکرہ کروں کہ یہ اردو زبان کی وسعت ہے کہ اس نے بڑے بڑے اہل سخن‘ قادر الکلام شاعر‘ ناول نگار‘ افسانہ نویس‘ ڈرامہ نگار پیدا کیے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ کتنے ہی شعرائے نامدار اور ادیب گذرے ہیں جو کہ دیگر مذاہب کے پیروکار تھے۔ جن میں قابلِ ذکر جناب کشن پرشاد شادؔ‘ چکبستؔ‘ دیا شنکر نسیمؔ‘ پریم چندؔ‘ جگن ناتھ آزادؔ‘ سردار پنچھیؔ‘ بقیدِ حیات گوپی چند نارنگ‘ پتا مبر ناتھ درفاتیؔ کشمیری‘ آنجہانی سوم ناتھ سادھوؔ‘ آنجہانی پشکر بھان اور دیگر صاحبان ادب نواز جنھوں نے اپنی تخلیقات سے اردو زبان کے دامن کو مالا مال کیا ہے اور اس رنگین گلستان میں اپنی علمی و ادبی کاوشوں کے گلہائے رنگا رنگ سجائے ہیں اور خونِ جگر سے اس اردو ادب کے گلستان کو آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی شادی کا دعوت نامہ اردو میں ہی طبع کرایا تھا اور مہاتما گاندھی کو بھی اس زبان کے ساتھ لگاؤ تھا۔ اس بناء پر اس بیش بہا زبان کو کسی خاص طبقہ یعنی مسلمانوں سے جوڑنا سراسر ناانصافی ہے اور سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

اپنے موضوع کی طرف واپس رجوع کرتے ہوئے یہ لکھتا چلوں کہ رسالہ ''حکیم الامت'' کے اس نعتیہ شمارہ میں پنجابی شاعر شیخ الاسلام پیر سید مہر علی شاہؒ کی حروفِ تہجی کی ترتیب سے پنجابی زبان کی ایک عمدہ نفیس طویل نعت بھی درج ہے۔ دیگر پنجابی شعراء نے سید مہر علی شاہؒ کے بارے میں پنجابی زبان میں مدحیہ اشعار درج ہیں جس سے ان کی عظمت و بزرگی نمایاں ہوتی ہے۔

عربی‘ فارسی‘ اردو‘ پنجابی کے علاوہ رسالہ ہٰذا میں انگریزی زبان کی تین نعتیں درج ہیں اور یہ نعوت علامہ اقبالؔ‘ عرفان علی خان اور عائشہ صدیقی کی ہیں۔ شیدایانِ اقبال کے لیے ان کی انگریزی نعت ایک تحفہ سے کم نہیں ہے۔ اس کے بعد کشمیری زبان کا خیال رکھتے ہوئے فاضل مدیر نے کشمیری زبان کی بھی تین عدد نعتیں رسالہ میں شامل کی ہیں۔ یہ نعتیں بالترتیب مرزا بشیر شاکر (راقم تبصرہ)‘ منظور احزامؔ اور پتامبر ناتھ درفاتیؔ کشمیری کی ہیں۔

اس نعت نمبر صفحہ ۸۳ سے ۱۵ عدد نثری مضامین شروع ہوتے ہیں۔ یہ مضامین پڑھ کر صنفِ نعت اور نعتیہ ادب کی تاریخ وغیرہ سے پڑھنے والے کو واقفیت ہوتی ہے۔ ان مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ نعتِ نبیؐ کا پہلا مجموعہ دیوان ابی طالب از ڈاکٹر سید علی عباس شاہ۔
۲۔ محسن کاکوروی اور ان کی نعت گوئی از پروفیسر اکبر حیدری کشمیری۔
۳۔ غالب کی نعتیہ غزل پر حالی کی شاہکار تخمیس از سید تقی عابدی۔
۴۔ اردو مرثیوں میں نعت از پروفیسر فضل امام۔

۵۔مناظر عاشق ہرگانوی کی نعتیہ شاعری از سعید رحمانی ایڈیٹر ادبی محاذ۔

۶۔حامد امروہوی کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر سید تقی عابدی۔

۷۔سہیل غازی پوری ایک معتبر نعت گو از فرحت حسین خوشدلؔ۔

۸۔اردو نعتیہ شاعری ایک جائزہ از ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفقؔ۔

۹۔علامہ اقبالؔ بارگاہِ رسالت میں از پروفیسر تسکینہ فاضل۔

۱۰۔اردو نعت گوئی ایک جائزہ از منیر حسین حرہ۔

۱۱۔فیض کی نعت از ڈاکٹر سید تقی عابدی۔

۱۲۔قرآن کی رو سے نعت کی تاریخ کا مختصر جائزہ از نسیمہ حیدری۔

۱۳۔نجمی کا نعتیہ کلام از مرتضیٰ حسین بلگرامی۔

۱۴۔کشمیری مرثیہ میں نعت از منظور احمد احزامؔ۔

۱۵۔نعتِ رسولؐ اور اردو شعراء از سید شمیم احمد۔

مضمون نگاروں کے یہ پُر مغز او رپُر از معلومات مضامین اور نثری تخلیقات ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔یہ سبھی مضامین پڑھنے کے بعد صنفِ نعتِ رسولؐ اور نعتیہ ادب پر خوب روشنی پڑتی ہے۔طلبا اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے رسالہ ’’حکیم الامت‘‘ کا یہ خصوصی شمارہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان تمام مضامین میں حسب موقعہ و محل تخلیق کاروں نے جابجا نعتیہ اشعار کا حوالہ دے کر ان کو قابلِ مطالعہ اور دلچسپ بنایا ہے۔نعت نویسی کے فن میں زیر تبصرہ نمبر زر و جواہر سے تولنے کے قابل ہے اور یہ جناب ڈاکٹر ظفر حیدری ایڈیٹر ’’حکیم الامت‘‘ کی محنت شاقہ اور اردو ادب کے ساتھ ان کے والہانہ لگاؤ کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

مراسلات عنوان کے بعد ایک اور عنوان آخری صفحہ پر درج ہے:

زِ خاکِ سعدی شیراز بوئے عشق آید از ڈاکٹر سید عباس علی شاہ کا ایک بصیرت افروز مضمون اور عشقِ نبیؐ سے مالا مال مضمون ہے۔یہ گرانمایہ رسالہ ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کی قیمت صرف ۶۰ روپیہ ہے۔ شائقین نعت کے لیے ایک عظیم اور یادگاری دستاویز ہے۔بہ قامت بہتر بہ قیمت کمتر۔

نور محمد (آزاد) تاجر کتب

وادی مینو نظیر یعنی کشمیر بالخصوص اس کے گرمائی دار الخلافہ اور قدیمی تہذیب و تمدن کے گہوارے سرینگر کا کون سا شخص ہوگا جو کہ غلام محمد و نور محمد تاجران کتب مہاراج گنج کے نام سے واقف نہیں ہوگا۔اس اشاعتی ادارے کے بانی مرحوم غلام محمد اور ان کے بیٹے مرحوم نور محمد تھے۔یہ ان ایام کی بات ہے کہ جب یہاں بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں کسی قسم کا چھاپ خانہ نہیں تھا۔مرحوم نور محمد کو فیاض ازل نے نوازا تھا اور ان کے دل میں ابتداء سے ہی نوشت و خواند کے ساتھ ساتھ کتابی ذوق بھی عطا فرمایا تھا۔انہوں نے اپنے والدِ محترم غلام محمد کے دوش بدوش اشاعتی ادارہ میں ساتھ نبھایا اور کتابوں کی تجارت شروع کر کے اس کو وسعت بخشی کشمیر میں اگرچہ کچھ چھاپ خانے تھے بھی مگر ان کی شہرت کچھ زیادہ نہیں تھی۔

مرحوم نور محمد لکھنؤ کے نول کشور چھاپ خانے کے علاوہ دہلی اور لاہور سے بھی کتابیں چھپوا کر لاتے تھے۔آپ نے اپنی مادری زبان کی بہت خدمت کی اور اس میں قدیم شعراء کشمیر کے قلمی نسخے چھپوائے۔دیہاتوں اور شہر کے بیشتر علاقوں میں شعراء کرام کا کلام جمع کر کر کے اس کو کتابی شکل میں محفوظ کیا اور آنے والی نسلوں کے لیے علم و ادب کی خوب آبیاری کی۔

مرحوم نور محمد صاحب کی خدمات کو یاد کر کے اور اس محسن قوم کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے پیش نظر ان کے لائق و فائق فرزند ارجمند ظفر محمد اقبال نے حالی ہی میں کتاب نور محمد (آزاد) شائع کر کے اپنی صلاحیت اور اپنے والد کا قابل ترین جانشین ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔حالیہ شائع شدہ کتاب کی رسم رونمائی کے لیے جموں و کشمیر اکیڈیمی سرینگر میں ایک پُر وقار تقریب منعقد ہوئی تھی۔ جہاں باذوق قارئین اور علم دوست حضرات کے علاوہ نامور ادیب اور قلم کار موجود تھے۔

کتاب مذکورہ ۱۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کا ٹائٹل کور بہت ہی خوب صورت اور جاذبِ نظر ہے۔اس پر ایک کھلی ہوئی کتاب کے اوراق کھول کر دکھائے گئے ہیں جو کہ علم وادب کی ایک بہترین علامت تصور کی جاسکتی ہے۔اگر کچھ دہائیاں قبل جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی نے بھی مرحوم نورمحمد کی یاد میں اپنے شیرازہ کا ایک یادگاری نمبر شائع کیا تھا مگر مرحوم کی یاد میں آج کی یہ کتاب بہت ساری خصوصیت کی حامل ہے۔ادیبوں اور قلم کاروں کے مضامین کے علاوہ کتاب میں مرحوم نورمحمد کی علمی اور ادبی زندگی سے متعلق بہت ساری خوب صورت اور دیدہ زیب تصویریں نظر آتی ہیں۔اگرچہ اُس زمانے میں آج کے ترقی یافتہ دور کی مانند رنگین تصویروں کا رواج نہیں تھا۔مگر پھر بھی سیاہ وسفید رنگ کی یہ تصویریں ہمارے دھیان کو ماضی کی طرف لے جاتی ہیں۔کتاب کے صفحہ نمبر ۲۷ کے بائیں طرف باپ بیٹے کی تصویر کے نیچے یہ شعر نظر آتے ہیں اور آج منوں مٹی کے نیچے آرام فرما ان علم دوست اور ادب پرور پاک روحوں کو یاد کر کے دنیا کی بے ثباتی ظاہر کرتے ہیں اور ان دونوں کی ادبی خدمات کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں۔

کہاں ہیں تاجران کتب کتابیں چھاپنے والے
غلام محمد وفرزند نور وہ مہاراج گنج والے
اندھیرے میں کتابیں چھاپ کر انوار پھیلائے
نول کشور لکھنؤ کے یہاں دونوں وہ کہلائے
(شاکرؔ)

یہ چیز بھی کتاب کی اہمیت کو دوبالا کرتی ہے کہ محترم ظفر محمد اقبال ناشر کتاب نے اپنی کتاب کے آخری صفحات میں اپنے والد مرحوم کے زمانے کی شائع شدہ کتابوں کے ٹائٹل صفحات کے عنوان جلی حروف میں چھاپ کر کتاب کے حسن اور آرائش کو زینت بخشی ہے۔ مثلاً گلشن نعت کلان۔کاشر ہار باگے۔گریہ وحوش، قصۂ ممتاز بے نظیر، خنجر عشق، کشمیری اعتقادنامہ۔معجزات آنحضرتؐ۔گلزار مدینہ۔معراج نامہ شمس فقیر و وہاب کھار۔ وفات نامہ آنحضرت کلان۔ دعائے صبح۔وردِ حضورؐ۔ جنگ نامہ آنحضرتؐ مغاذ النبیؐ کلان۔معجزۂ یمن۔گلشن نعت۔گلدستۂ نعت۔قصۂ اصحاب کہف۔کاشر سلطانی قصۂ گربہ وموش۔بدر منیر وغیرہ۔

مختصر اوراق پر مشتمل اور معمولی قیمت کے ساتھ یہ کتابیں چھاپ کر مرحوم نورمحمد کی علم پروری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔غربت و افلاس کے دنوں میں عام کشمیری قارئین تک یہ کتابیں پہنچانا ان کی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔عنوانات اکیس(۲۱) کے تحت کتاب میں وادی کے سرکردہ ادیبوں اور دانشوروں کے مضامین شامل ہیں۔اگرچہ کچھ مضامین کلچرل اکیڈیمی والے نورمحمد نمبر شیرازہ سے بھی نقل کیے گئے ہیں مگر یہ سبھی مضامین قندِ مکرر کی حیثیت رکھتے ہیں اور بار بار پڑھنے کے لائق ہیں۔

ابتدائی مضمون نورمحمد تاجر کتب کا مختصر تعارف ہے جو کہ جناب ظفر محمد اقبال کا ہے۔اس میں موصوف نے اپنے والد کی زندگی کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ سال پیدائش سے سال وفات تک کے واقعات مختصراً تحریر کیے گئے ہیں۔

وادی کے سرکردہ ادیب شاعر اور گیان پیٹھ انعام یافتہ جناب رحمن راہیؔ صاحب کا مضمون بعنوان نورمحمد کوئی گیارہ صفحات پر بسیط ہے اور بہت ہی پُر مغز اور معلوماتی ہے اگرچہ بقول صاحب مضمون وہ ان دنوں چھوٹے ہی تھے جب کہ نورمحمد کے ساتھ ان کے تعلقات استوار ہوئے تھے مگر راہیؔ صاحب کو یہ شرف حاصل ہے کہ مرحوم نورمحمد کی دید وشنید سے مستفید ہوئے ہیں اور ان کی نشست و برخواست و ملبوسات وغیرہ کے چشم دید گواہ ہیں جس کا ذکر انہوں نے مضمون میں کیا ہے۔اس مضمون کا اردو ترجمہ جان محمد آزادؔ نے کیا ہے۔اس طرح چند مہینے قبل

وفات یافتہ دانشور غلام نبی فراقؔ کا کشمیری زبان میں نور محمد سے متعلق مضمون بہت عمدہ ہے۔ مرحوم فراقؔ کے بقول انہوں نے نور محمد کے دکان پر عبدالاحد آزادؔ غلام حسن بیگ عارفؔ عبدالاحد زرگر اور دوسرے کئی غیر کشمیری اہل قلم کو دانشورانہ اور فلسفیانہ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مرحوم مرزا عارف بیگ کا مضمون بھی شامل کتاب ہے۔ بقول موصوف نور محمد کا سر بڑا' جسم پتلا جبین کشادہ اور ناک پتلی تھی۔ مرحوم نے اور بھی کئی باتوں کا اچھا تذکرہ کیا ہے اور یہ مضمون بھی کشمیری زبان وادب کا بہترین ادب پارہ ہے۔ سید جلال الدین بخاری کا بزبان کشمیری نور محمد کے تئیں ایک منظوم خراج عقیدت درج ہے۔

اس کے علاوہ دیگر اہل قلم مثلاً غلام نبی خیال' ظریف احمد ظریف' شوکت حسین کینگ' مرحوم غلام رسول کاوسہ' شاہد بڈگامی وغیرہ کے مرحوم نور محمد پر لکھے گئے مضامین ان کی زندگی کے بہت سارے گوشوں اور دیگر کمالات کے بارے میں یہ مضامین سے نقاب کشائی کرتے ہیں۔

محترم ظفر محمد اقبال کا ایک اور مضمون بعنوان اشاعت کار نور محمد کشمیر کا نول کشور کا اردو مضمون لائق مطالعہ ہے۔ اس میں موصوف نے شائع شدہ کتابوں کا ذکر کیا ہے جو کہ نور محمد نے اپنی محنت شاقہ سے شائع کی تھیں اور ان شخصیات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو کہ بذات خود مرحوم کے دکان واقع مہاراج گنج پر آیا کرتے تھے۔ ان میں چند قابل ذکر نام یوں ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ' چودھری غلام عباس' اللہ رکھا ساغر' حفیظ جالندھری' میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ' مولانا غلام رسول مہر' فیض پراچہ مبارک شاہ فطرت' محی الدین حاجنی' پیر عزیز حقانی۔ اس مضمون میں جناب ظفر اقبال نے اور بھی کئی باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ سرکردہ دانشوروں شعراء کرام اور ادب نواز شخصیات کے درج بالا ناموں سے بہ آسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نور محمد مرحوم کا اشاعتی ادارہ اس زمانے میں کس اہمیت کا حامل رہا تھا اور کس قسم کے بلند قامت اور مختلف الخیال دانشور یہاں آکر مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کر کے ایک تاریخ رقم کرتے تھے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

آج ان عظیم ہستیوں اور نور محمد جیسے فراخ دل میزبانوں کو یاد کر کے ایک حساس انسان کا دل بھر جاتا ہے اور بے ساختہ دل سے آہ نکل جاتی ہے۔ بقول شاعر ؎

یارب وہ ہستیاں اب کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

الغرض نور محمد کی یاد میں شائع شدہ یہ کتاب علم وادب کا ایک بہترین گلدستہ ہے جو کہ شائقین علم کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ کتاب پر درج قیمت =/Rs.300 جو کہ اس کے معیاری..... مضامین کی رنگارنگی دیدہ زیب ٹائٹل اور پرانے زمانے کی یادگاری عنوانات اور شائع شدہ کتابوں کے ٹائٹل کے پیش نظر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ یہ ایک علم دوست ادب شناس اور علمی نوادرات کو محفوظ رکھنے والے کی ایک شیریں داستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس نے اپنے شب وروز کی محنت سے اردو اور خاص کر کشمیری زبان کے علمی سرمایہ کو ضائع ہونے سے بچالیا اور آئندہ نسلوں کے مطالعہ وتحقیق کے لیے بطور سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"علم کو رشتہ تحریر سے منسلک کرو"۔ (حدیث)

اس حدیث مبارک کے تناظر میں مرحوم نور محمد نے وادی کشمیر کے علماء فضلاء دانشوروں اور شعرائے کرام کی تخلیقات کو منظر عام پر لاکر صدیوں کے لیے محفوظ رکھا ان کی ان بیش بہا علمی وادبی خدمات کو ایک کتاب کی شکل میں چھاپ کر ان کے فرزند جناب ظفر محمد اقبال نے ایک مستحسن کام انجام دیا ہے اور نئی نسل کے لیے اپنے محسنوں کو یاد کرنے کی ایک اچھی ترغیب دی ہے۔

اگر چہ مرحوم نور محمد کی علمی خدمات کے علاوہ اور بھی بہت سارے پہلو ہیں مگر اس مختصر جائزے میں ان کی گرانقدر علمی وادبی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ علمی پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ موصوف تنگدست شعراء اور قلم کاروں کی حتی المقدور مالی معاونت بھی کرتے تھے۔ جواں سال علمی ذوق رکھنے والوں اور مطالعہ میں ماہر بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے قلم یا دیگر چیزیں بھی عنایت کرتے تھے۔ بقول ظفر محمد اقبال مرحوم کی دوکان پر برصغیر کی تقسیم سے قبل لاہور سے کوئی عبدالوہاب ذکی بھی تشریف لاتے تھے جو کہ حضرت علامہ اقبالؔ کے صحبت یافتہ تھے۔ وہ نور محمد کے پاس بیٹھ کر علامہ اقبالؔ کی محفل میں ہوئے چشم دید واقعات کا تذکرہ کرتے تھے۔ علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور ان کی فکرودانش کو عام کرنے میں پرانے زمانے میں اسی علم وادب کے شیدائی (نور محمد) کا اہم ترین رول رہا ہے۔

مرحوم نور محمد کی عظیم خدمات کے پیش نظر اب یہ ان کے وارثان کا فرض منصبی بنتا ہے کہ وہ اپنے محسن کو یاد کرتے ہوئے از سر نو ادارہ اشاعت یعنی ان کے نام نامی سے منسوب غلام محمد نور محمد تاجران کتب مہاراج گنج سرینگر کی شان رفتہ کو بحال کر کے نور محمد کی روح کو تسکین بخشیں۔ کیونکہ آج کل یہ ادارہ ایک قسم کی سٹیشنری کی دوکان کی صورت میں نظر آتا ہے مگر اس دوکان کی عظمت اسی سے جھلکتی ہے کہ یہاں قرآن مقدس کے بیش بہا نسخے میسر رہتے ہیں اور عوام الناس اس صحیفہ آسمانی سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ اس کی شاندار تاریخی اہمیت اور تابناک روایات کے پیش نظر یہ وارثان کے حق میں بھی زندہ دلی اور روشن ضمیری کی مثال قائم کرے گا۔ نور محمد کی یاد میں ایک کتاب شائع کر کے یا کوئی اخباری مضمون چھاپ کر اور اسی پر اکتفاء کرنا ان حق کی ادائی کا کوئی خاص ثبوت نہیں ہوگا۔ بلکہ ان کے زندہ جاوید کارناموں کا از سر نو جائزہ لینا اور ان کو روبہ عمل لانا مرحوم کے لیے بہترین خراج ہوگا۔

منظوم کشمیری ترجمہ مسدس حالی

سلطان الحق شہیدیؔ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ اردو اور کشمیری زبان وادب کے بھی ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ جہاں اردو ادب پر ان کی دسترس ہے وہاں کشمیری شعر وادب پر بھی ان کی عمیق نظر ہے۔ اپنی شب وروز کی محنت شاقہ سے شہیدیؔ صاحب نے دونوں زبانوں کے خارزاروں میں قدم رکھ کر ان کو لہلہاتے ہوئے گلزاروں میں تبدیل کیا ہے۔ گو کہ موصوف کی عمر کا ایک خاص حصہ معلمانہ مشغلہ میں بسر ہوا ہے مگر ان کے قلم گہر بار نے علم وادب اور شعر وشاعری کے گلدستوں کو سجا کے رکھا ہے۔ حال ہی میں شہیدیؔ صاحب کے قلم سے مدو جزر اسلام یعنی مسدس حالی کا منظوم کشمیری ترجمہ منظر عام پر آیا ہے۔ گو کہ سالہا سال پہلے مرحوم ومغفور پروفیسر حاجنیؔ کا ترجمہ مسدس بھی چھپ چکا تھا مگر مرحوم حاجنی نے یہ کام ادھورا چھوڑا تھا اور بقول خود کسی آنے والے مترجم کے لیے یہ کام رکھا تھا اور زیادہ مکمل اور مستند صورت میں اس کی آرزو کی تھی۔ قدرت کے فیاض ہاتھوں نے یہ دستار فضیلت محترم سلطان الحق شہیدی کے سر باندھی اور آپ سے یہ بابرکت اور سعادت مندی کا کام کرایا۔ تخلیقی کام سے زیادہ شدید اور دقت طلب کام ترجمے کا ہوتا ہے مگر جہاں تک ماہرین فن اور اساتذۂ ادب کا تعلق ہے انہوں نے شہیدیؔ صاحب کے ترجمہ مسدس کو کامیاب ترجمہ قرار دیا ہے۔ جن میں خاص کر محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر غلام رسول ملک، غلام نبی گوہرؔ، پروفیسر مرغوب بانہالی اور حامدی کاشمیری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ راقم الحروف کی رائے میں پروفیسر ڈاکٹر شریف حسین قاسمی دہلوی کا پیش لفظ خاصے کی چیز ہے اور صاحبان علم عرفان کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ آنجناب کا یہ پیش لفظ ۳۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں بہت سارے استادانِ فن وادب کا مسدس

حالی کے بارے میں تاثرات کو قلم بند کیا گیا ہے جس سے مسدّس حالی کی اہمیت وافادیت پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ان میں سے سبھی حضرات کب کے مرحوم ہو چکے ہیں۔جیسے سید سلیمان ندویؒ عبدالماجد دریابادی، مولانا عبید اللہ سندھی، سر راس مسعود وغیرہ اس پیش لفظ سے مسدس حالی اور اس کے کشمیری ترجمہ کو اور بھی چار چاند لگ گئے ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مترجم نے اپنی زندگی کے بیش بہا لمحات اور راتوں کی نیند کو حرام کر کے اس گراں قدر کام کو انجام دیا ہے۔شہیدی صاحب کے گہر بار قلم سے پہلے بھی کئی کتابوں کا ترجمہ زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے اور قارئین حضرات سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔مثلاً علامہ اقبالؔ کے پیامِ مشرق کا کشمیری ترجمہ، کلیات مہجور کشمیری کا اردو ترجمہ لالہ طور منظوم اردو ترجمہ۔اس کے علاوہ اور بہت سی کتابیں بھی طبع ہو چکی ہیں۔جیسے کہ کلیات عزیز بجراری کشمیری، تیشۂ گل اردو کلام اور انکشاف وغیرہ اس طرح شہیدی صاحب ہمہ وقت محو کتاب وقرطاس رہتے ہیں اور سنگلاخ زمینوں سے علمی چشموں کو دریافت کر کے تشنگان علم کی پیاس بجھاتے ہیں۔ ہماری نیک دعائیں اور نیک خواہشات ہمیشہ اس قلندر صفت قلم کے دھنی شخص کے ساتھ رہیں گی۔مولانا حالیؔ مرحوم نے جہاں اپنے زمانے میں سر سید احمد خان کی خواہش پر مسدس لکھ کر مسلمانانِ برصغیر اور اردو زبان کے شائقین پر احسانِ عظیم کیا اور ان کو خوابِ غفلت سے جگایا وہاں آج کے دور میں شہیدیؔ نے اسلامیان کشمیر کو اپنی قلمی کاوش سے احسان مند رکھا اور کشمیری شاعری اور ادب کے پرستاروں کے لیے بھی ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔شہیدیؔ صاحب کا یہ کارنامہ مدتوں یاد رکھا جائے گا۔اگر میں شہیدیؔ صاحب کی ادبی شخصیت کو گنج بے بہا کہوں تو شاید مبالغہ نہیں ہوگا۔کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ شہیدیؔ نے اس کے ہر ایک دائیں صفحے پر مولانا حالیؔ کا منظوم کلام اردو درج کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے بائیں صفحے پر کشمیری منظوم ترجمے کو چھپوایا ہے۔ــــــــ عام فہم اور اعلیٰ معیار کا ہے۔ساتھ ساتھ اردو اور کشمیری عنوانات دے کر مسدس کے مطالعے کو سہل اور آسان بنایا ہے۔کتاب کا ٹائٹل خوب صورت ہے اور جلد بندی بھی خوب ہے۔طباعت عمدہ ہے۔شہیدی پبلی کیشنز کتاب کے ناشر ہیں۔البتہ کتاب پر درج قیمت مبلغ 500روپے عام آدمی کی قوت خرید سے زیادہ ہے پھر بھی انسان سہو وخطا کا پتلا ہے اور اس کی کوئی بھی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی ہے۔الغرض سلطان الحق شہیدی اس سعادت مند کام کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔امید ہے کہ ان کی قلمی کاوشوں سے مستقبل میں مزید علمی نوادرات منصۂ شہود پر آئیں گے۔

حیات میر شعبان

سرزمین کشمیر کو جہاں قدرت کی فیاضیوں نے اپنے حسن ودل کشی، خوبصورتی اور رعنائیوں سے نوازا ہے وہاں اس رنگین وادیٔ مینونظیر کو یہ شرف بھی بخشتا ہے کہ یہاں اولیاء کرام، اتقیا اور اصفیاء کی تاحد نظر ایک لمبی کہکشاں نظر آتی ہے۔ان کے ساتھ ساتھ بہت ساری ایسی شخصیات بھی پیدا ہوئی ہیں جنھوں نے اپنی عمر عزیز کے بیش بہا سالوں کو ریاضت اور عبادت میں صرف کر کے کمالات پیدا کیے پھر یہ حضرات قدسیہ فقیر منش مجذوب اور خدا رسیدہ کہلائے۔

زیر تبصرہ کتاب یعنی حیات میر شعبان المعروف شعبان موت کا کہ پورہ انہی خدا رسیدہ بزرگوار کے حالات وواقعات پر تحریر میں لائی گئی ہے اور اس کتاب کی نوشت کا سہرا جناب عبدالرحمان لطیفؔ صاحب کے سر بندھتا ہے۔کتاب کے سرورق (Title Page) پر جناب میر شعبان کی ایک تصویر نظر آتی ہے اور یہ تصویر بذاتِ خود ان کی قلندرانہ شان و شوکت کو ظاہر کرتی ہے اور ان کے چہرہ مبارک سے ہی جلالی

آشکارعیاں ہوتے ہیں۔ محترمہ ثریا نظیر نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ کتاب کا انتساب محترم لطیفؔ صاحب نے مرحوم عبدالمجید بٹ کے نام کیا ہے جو کہ صاحبِ کتاب کے والد محترم تھے۔

اس کے بعد ابتدائی صفحات پر حضرت شیخ العالمؒ کے کلام سے انتخاب کیا گیا ہے یعنی ؎

پوشہ مٰتن یمن ابدالن، خش کلمن بوز کھ کتھ معنے
گوش روٹکھ پٹھ سنگاسن، لانہ مل گُس زانے

اور ساتھ ہی جناب عبدالرحمن لطیفؔ کا چار مصرعوں پر مشتمل منظوم کلام بھی درج ہے۔ حضرت علامہ اقبالؔ کے کلام سے بھی تین اشعار درج کیے گئے ہیں جن کو پڑھ کر فقیر اور فقیران خدامست کے کمالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

کتاب زیر تبصرہ کا عرض حال پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تصنیف وتحقیق یعنی لطیف صاحب جناب میر شعبان کی ملاقاتوں اور صحبت نشینی سے مستفید ہوئے ہیں اور گیارہ سال کے عرصے تک انہوں نے یہ فیض وبرکت حاصل کیا تھا۔ بقول صاحب کتاب انہوں نے شعبان کے مجذوبانہ حالات زندگی واقعات، ملفوضات اور خرقۂ عادات کو تحریر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کے محبین اور عقیدت مند حضرات مستفید ہوسکیں۔

اس کے بعد کتاب میں بزبان کشمیری اپنے مرشد کی تئیں ایک منقبت درج ہے اور یہ جناب لطیف صاحب کا ایک نذرانہ عقیدت ہے۔ انمول تحفہ کے عنوان کے تحت سید احمد بخاری پانزن نے جناب لطیف صاحب کی محنت شاقہ کا عمدہ طریقے سے اعتراف کیا ہے۔

کتاب میں زیر عنوان مجذوب کے تحت اس بات کی بھرپور وضاحت کی گئی ہے کہ کسی شخص میں خدائی جذبہ اچانک سرایت کر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی دوستی میں عشق کا بلند سے بلند تر مقام حاصل کر کے یہ شخص اس حال سے کبھی واپس نہیں آتا ہے اور عشق الٰہی سے سرشار ہوکر اسی مرتبہ پر فائز ہوکر وہ دنیائے فانی سے رخصتی لیتا ہے۔

کتاب کے صفحہ نمبر ۲۰ پر مجذوب الحال شعبان صاحب کا باضابطہ شجرہ نسب درج ہے جو کہ خالق میر سے شروع ہوکر اس کے پانچ فرزندانِ یعنی عزیز میر، احد میر، شعبان میر، قادر میر اور ستار میر کے بعد عالیہ پر ختم ہوجاتا ہے۔

صاحب تصنیف عبدالرحمن لطیفؔ نے اپنی اس بے نظیر کتاب میں بھرپور طریقے اور تفصیل سے مرحوم شعبان صاحب کے خاندانی اور ابتدائی حالات درج کیے ہیں اور ان کے خاندانی پس منظر سے نقاب کشائی کی ہے۔ یہ مضمون شعبان صاحب کی روحانی اور مجذوبانہ زندگی کے بہت سارے حقائق کو آشکارا کرتا ہے۔ روحانیت میں پُر جلال شخصیت کے بارے میں لکھا گیا ہے، وہ اکثر شب بیدار رہتے آرام بھی کرتے اور سحری سے پہلے بستر سے اٹھتے۔ اس مضمون میں ان کے وجد حال کی بہت ساری مثالیں درج کی گئی ہیں اور یہ مضمون صاحبانِ اعتقاد اور عاشق زاروں کے لیے رہنمائی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ ہاں یہ بھی لکھتا جاؤں کہ محی الدین سراج کی دکان واقع ناوپورہ پل کا تذکرہ پڑھ کر راقم الحروف مبصر کا دھیان بھی اپنی جوانی کے ایام کی طرف مڑ گیا اور آج وہ سارا نظارہ نظروں کے سامنے پھر آکر مجھے یاد آگیا کہ کس طرح شعبان صاحب اس دکان پر بیٹھ کر حقہ کا کش لے کر مست حال رہا کرتے تھے اور میں دفتر آتے جاتے یہ نظارہ دیکھتا تھا۔ خدا کے فضل سے محی الدین سراج آج بھی بقید حیات ہے۔ بظاہر ایسے نفوسِ قدسیہ ناصاف لباس میں ملبوس رہ کر بھی نہ جانے کن روحانی بلندیوں کی اور اپنی پرواز رکھتے ہیں اور عالم اسرار کی جلوہ سامانیوں میں مست ومگن رہتے ہیں۔ کسی شاعر نے بجا کہا ہے ؎

تر دامنی یہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن اگر نچوڑیں جلوے کہاں سمائیں

کتاب میں شعبان صاحب کا کہ پورہ کے پیرومرشد یعنی بڑے شعبان صاحب کی زندگی اور باطنی کمالات کا بھی تذکرہ ہے، جس کا مدفن گڈورہ کی جامع مسجد کے ساتھ مشرقی سمت میں ملحق ورنڈا کے ساتھ صحن مسجد میں ہے اور عقیدت مند یہاں آکر فیض وبرکات حاصل کرتے ہیں۔ دوران مطالعہ کتاب زیرتبصرہ میر شعبان صاحب کے مجذوبیت میں داخلہ کی کیفیت اور حالات بھی قلم بند کے گئے ہیں اور اس بارے میں یہ اقتباس من وعن نقل کیا جاتا ہے:

''روایت ہے کہ میر شعبان کا کہ پورہ ایک دن جھیل ڈل میں حسب روایت اپنی چھوٹی کشتی چلانے میں مصروف تھے کہ مخالف سمت سے بڑے شعبان صاحب دوسری کشتی میں آئے۔ آپ نے میر شعبان کو دیکھ کر فرمایا ''مجھے آپ کو ڈھونڈے بڑی مدت ہوئی''۔ پھر میر شعبان کو ایک پیالی چائے پیش کر دی۔ آپ نے جونہی یہ چائے نوش فرمائی آپ کی کیفیت تبدیل ہوگئی اور اپنے کپڑے پھاڑ دیئے۔ آپ کے بھائیوں نے آپ کو لیلہ ہار لایا، وہاں سے آپ میرک شاہ صاحب شالیمار کے پاس اپنی کشتی میں روانہ ہوئے۔ آپ نے عشائی باغ پل کے نزدیک کشتی سے جھیل ڈل میں چھلانگ ماری اور پانی میں غائب ہوئے۔ اتنی دیر پانی میں رہے کہ آپ کے برادران کو آپ کی فکر لاحق ہوگئی لیکن کوئی ایک گھنٹہ بعد بہت دور سے آپ نے اپنے بھائیوں کو بلاتے ہوئے شکاری آپ کے پاس لانے کو کہا۔ جب آپ کشتی میں سوار ہوئے میر شعبان سے آپ کے بھائیوں نے پوچھا اتنی دیر پانی میں رہ کر آپ کیا کر رہے تھے ہمیں کافی پریشانی لاحق ہوئی۔ اس پر میر شعبان نے بھائیوں سے کہا کہ میں جھیل ڈل میں لعل وجواہر جمع کر رہا تھا''۔ بقول شاہ قلندر ؎

پانہ نِش یُس بے خبر گوتس وَنان خانہ خراب
تس گمیک آرام آسی ییم چومُت عشقُن شراب

کتاب میں ایک اور عنوان یعنی سیر وسیاحت اور حرق عادت درج ہے جس میں میر شعبان صاحب کے اور بہت سارے کمالات اور حرقۂ عادات واقعات کا ذکر ہے کہ ان کی ظاہری حیاتی میں کس طرح لوگوں کی حاجت روائی ہوئی تھی۔ اولاد کی نعمت سے مایوس اور ناامید حضرات وخواتین کس طرح شعبان صاحب کی توجہ اور نظر کرم اور فیض باطنی سے مالا مال ہوئے اور بے اولادوں کی گود اولاد کی نعمت سے بھر گئی اور وہ خوش وخرم رہے۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا شعر ہے ؎

لگا سکتا ہے کون اندازہ اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

وفات حسرت آیات والے باب کے تحت جناب فقیر میر شعبان کی ظاہری حیات سے اُخروی حیات کا حال درج ہے کہ آں محترم ۵ فروری ۱۹۷۱ء مطابق ۷ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کو اس دارفانی سے رخصت ہوئے اور کا کہ پورہ جامع مسجد کے امام عبدالغنی شاہ نے نماز جنازہ پڑھائی اِنا لِلّٰہِ وَاِنا اِلَیہِ راجِعُون۔ آپ کا جسد خاکی مہدہ بابا ریشی کے آستان شریف کے جنوبی سمت صحن میں سڑک کے پار عام قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا اور ازاں بعد مدفن اس کو دیدہ زیب آستان عالیہ کی صورت میں تشکیل دیا گیا جو کہ آج بھی عقیدت مندوں کے لیے روحانی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ؎

دربار شہنشہی سے خوش تر
مردان خدا کا آستانہ

اس مرد خود آگاہ وخدا آگاہ کی وفات کے بعد بھی ان کے کشف وکرامات کا کتاب میں ذکر ہے اور ان سے باطنی فیض حاصل کرنے کے واقعات درج ہیں۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

حیات میر شعبان والی کتاب میں اور بھی بہت کچھ چیزیں درج ہیں مثلاً منظوم خراج عقیدت حیاتی، شرح نامہ، کچھ خاص اصطلاحوں کی تشریح، پیرزادہ محی الدین شاہ، مہدہ بابا ریشی، غلام رسول صاحب المعروف لسہ بب واتھورہ، فتح موت، کمال صاحب بارسوٗ، بابا جی جموں، سید شمس الدین غمگین رتنی پورہ، گوپال سیف دیوباغ۔ چشمِ بصیرت رکھنے والوں اور واردانِ راہ سلوک کے لیے زیرِ تبصرہ کتاب بہت ہی دلچسپ اور کار آمد ثابت ہوسکتی ہے۔

الغرض عبدالرحمن لطیفؔ صاحب کی یہ تصنیف علم و عرفان، راہ سلوک، حقیقی فقیری اور درویشی پر ایک عمدہ اور بہترین علمی و ادبی گلدستہ ہے اور راہ سلوک کے مسافروں اور راہ نوردوں کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ کتاب کے آخری ٹائٹل صفحہ پر لطیفؔ کی بہترین تصویر بھی چھپ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو اور بھی بہت سارے علمی و ادبی کارنامے سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

تحفۂ علمدار کشمیر

کلام شیخ نورالدین نورانی کشمیریؒ کا منظوم فارسی ترجمہ

وادیٔ کشمیر کے معروف قلم کار، ادیب اور اقبال شناس پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب اپنے ایک قلم برداشتہ مضمون بعنوان ''فارسی شیرین زبان'' میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

''اس بات پر ماہرین لسانیات میں سے اکثریت کا اتفاق ہے کہ دنیا میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں، ان میں لسانی حلاوت، رنگ و آہنگ کی شیرنی اور فنی محاسن کے اعتبار سے زبان فارسی سہل الفہم، سلیس سادہ اور ملائم زبان ہے، مغلق الفاظ، پیچیدہ تراکیب، ثقیل محاورات سے آزاد فارسی اس دیس میں جنم لے چکی ہے۔ جسے ایران کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اپنے ابتدائی ایام سے ہی فارسی علم و آگہی، فصاحت و بلاغت، نکتہ آفرینی اور سب سے بڑھ کر اخلاق آدمیت کا ترجمان بھی اور بڑھ چڑھ کر علم بردار بھی رہی ہے''۔ (بحوالہ سرحدِ ادراک)

ایران کے علاوہ یہ شیرین زبان وسطِ اشیاء کے کئی اور بھی ممالک میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔ ہماری وادیٔ مینونظیر میں بھی اس عظیم زبان کا بول بالا رہا ہے اور خود مختار سلاطین کشمیر کے پُرشکوہ دور میں یہ زبان یہاں کی سرکاری زبان رہی ہے۔ اس پُر حلاوت زبان نے سرزمین کشمیر میں بہت سارے شعرائے کرام اور سخنور پیدا کیے ہیں۔ ان قادر الکلام بزرگوں اور شعراء میں حضرت شیخ یعقوب صرفی المعروف ایشان صاحبؒ اور غنی کشمیری قابل فخر ہیں کہ جنوں نے ادبیاتِ فارسی میں گنج ہائے گرانمایہ اپنے پیچھے چھوڑے ہیں۔ دراصل تاریخ فارسی ادب کے حوالہ سے کشمیر کی علمی اور ادبی تاریخ بہت ہی روشن رہی ہے اور اس پر وقتاً فوقتاً مورخین نے تواریخی دستاویزات منصۂ شہود پر لائی ہیں۔ اردو زبان کے بلند قامت شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کو اپنی اردو زبان کے بجائے فارسی زبان پر ہی فخر اور ناز تھا اس لیے انہوں نے کہا تھا ؎

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

درج بالا تمہیدی کلمات کے بعد راقم الحروف اپنے قارئین کی توجہ ترجمہ کاری کے حوالہ سے زیر تبصرہ کتاب تحفۂ علمدار کشمیر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے۔ یہ احسن کام وادی کشمیر کے معروف شاعر جناب اسد اللہ اسدؔ نے سرانجام دیا ہے۔ اسد اللہ اسدؔ سرینگر سے دور قصبۂ چاڈورہ (ژوڈُر) میں سکونت پذیر ہیں۔ آپ نے اردو میں بھی کئی کتابیں تصنیف کی ہیں اور ترجمہ کاری میں سکھوں کی مذہبی کتاب جپ جی صاحب کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے۔

شیخ العالم حضرت شیخ نورالدین ریشی کشمیر کے بلند پایہ اور باکمال اولیاء کرام میں سے ہیں جن کی مرقد مبارک چرار

شریف میں واقع ہے۔ آپ کا آستانہ مرجعِ خاص و عام ہے اور عقیدت مند حضرات اس آستانہ پر ادب اور احترام کے ساتھ حاضری دے کر ان کے توسل سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں۔ شیخ العالمؒ ریشی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے بہت سارے خلفاء تھے۔

آپ کی ساری زندگی عبادت اور ریاضت میں گذری ہے۔ دنیاوی زندگی پر آپ نے اُخروی زندگی کو ترجیح دی ہے۔ پرہیزگاری، صبر و قناعت اور نفس کشی آپ کی بامقصد زندگی کا طرۂ امتیاز تھا۔ خلوت پسندی اور غارنشینی کی ریاضتوں سے حضرت شیخ نے نفس امارہ کی سرکشی کو زیر کر کے رضائے مولا کی حصول یابی میں کامیابی حاصل کی تھی۔ آپ نے اپنے خلفاء والدہ محترمہ اور یہاں کے بود و باش کرنے والے لوگوں سے اپنی منظوم شاعری کے پیرائے میں خدا ترسی، پرہیزگاری اور عقبیٰ طلبی کا درس دیا تھا۔ آپ کی ساری شعر و شاعری قرآن و حدیث کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حب خلفائے راشدین و اولیائے کاملین سے آپ کا منظوم کلام مزین ہے اور آپ کا کلام دنیا کی بے ثباتی کا درس دیتا ہے۔ آپ کے کلام کو وادیٔ کشمیر میں ''کاشُر قرآن''، یعنی قرآن بزبان کشمیری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر اور ایام متبرکہ کے موقعوں پر یہاں کی مساجد اور خانقاہوں میں تبرکاً اور بطور دلیل واعظین کرام اور مبلغین کی طرف سے یہ کلام دل نشین گوش گذار کیا جاتا ہے۔ اسی پُر حکمت، زود اثر اور وعظ و نصیحت سے لبریز حضرت شیخ کے دلنشین کلام کو کشمیری سے فارسی میں منتقل کرنے کی سعادت ہمارے ہم وطن اور دینی برادر شاعر گرامی جناب اسد اللہ اسدؔ کے حصے میں آئی ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اگرچہ ہمارے اس روحانی مرشد کامل حضرت شیخ نورالدین ریشی کے کلام کو وادی کے اور بھی کئی شعراء کرام نے اردو کے منظوم پیرائے میں ترجمہ کر کے اپنے نامۂ اعمال میں بہت ساری نیکیوں اور سعادت مندیوں کا اضافہ کیا ہے جن میں پروفیسر غلام محمد شادؔ مرحوم کا نام لینا ناگزیر ہے جنہوں نے کشمیر کے اس ولیٔ کامل کے تین سو عارفانہ شلوکوں پر مشتمل گلدستۂ کلام شیخ العالم شائع کیا ہے۔ چار سو آٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی ترجمہ کاری کی یہ شاندار تحریر شاد صاحب کی محنت شاقہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

اسی طرح یہاں رہنے والے ایک اور نامور شاعر اور ترجمہ کار جناب سلطان الحق شہیدی نے بھی کلام شیخ العالم کا اردو میں منظوم ترجمہ کر کے ''نور علی نور'' کے نام سے ضخیم کتاب چھپوا کر منظر عام پر لائی ہے اور بھی کئی حضرات ہیں جنہوں نے یہ کام کر کے پیغام شیخ کو عام کرنے کی کوشش کی ہے اور ان سبھی محسنین کا ذکر کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔

راقم السطور کی رائے میں اپنے قلمی اور ادبی دوست جناب اسد اللہ اسدؔ نے سبھی ترجمہ کاروں پر سبقت لے لی ہے۔ کیونکہ اردو کی نسبت فارسی زبان میں کلام شیخ العالمؒ کا ترجمہ کرنا کارے دارد والا معاملہ ہے۔ کیونکہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ تقدس مآب زبان یعنی عربی کے بعد مشرقی ممالک میں فارسی زبان کی جڑیں بہت گہری ہیں اور اس زبان نے بہت سی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔

یہ بات بھی ملحوظِ نظر رہنی چاہیے کہ تخلیقی صلاحیت ہوتے ہوئے بھی کسی ادبی شاہکار کا منظوم ترجمہ اور وہ بھی زبان پہلوی میں انجام دینا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ کیونکہ ترجمہ کرتے وقت اصل تخلیق کے معنی و مفہوم کو اپنی جگہ برقرار رکھنا ایک بہت ہی باریک فن ہے۔ مترجم کا الفاظ جملوں یا اشعار کے صحیح مفہوم کو سمجھنا اور راس کے مقابل برمحل اور رموزون الفاظ

کا تلاش کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے اور اس دشوار گذار راستے پر گامزن ہونا گویا سنگلاخ کو پاٹنے کے مترادف ہوتا ہے۔

موجودہ زمانے میں فارسی زبان اگرچہ ہمارے سماج سے کب کی رخصت ہوچکی ہے اور زمانے کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوگئی ہے اور عام لوگ اس کے بول چال اور سمجھ سے بالکل نابلد ہیں مگران ستم ظریفوں کے باوجود بھی یہاں ہمارے کشمیر میں اس عظیم سرمایہ دار زبان کی خوشبوئیں اور بھینی بھینی ہوائیں کہیں نہ کہیں چلتی ہیں اور اس کی آواز ہماری سماعتوں سے ٹکراتی ہیں۔ چاہے یہ دانش گاہ کشمیر (یونیورسٹی آف کشمیر) کا شعبۂ فارسی ہو یا دیگر دانش گاہیں یا کالجز وغیرہ اس لطیف اور پُر بہار زبان کی صدائے بازگشت آتی رہتی ہے۔ اکثر دینی محافل خانقاہوں اور بقعہ جات میں بزرگانِ دین کا فارسی کلام پیش کیا جاتا ہے۔

جہاں تک زیر تبصرہ کتاب یعنی تحفۂ علمدار کشمیر کا تعلق ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب ایک روحانی تحفہ ہے جو کہ ہمارے کرم فرما محترم اسدؔ نے اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کی ہے۔ کتاب صوری اور معنوی دونوں صورتوں میں جاذب نظر ہے۔ یہ نادر تحفہ ۵۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کو ہاتھوں میں لیتے ہی باذوق قاری اس کی گرفت میں آسکتا ہے۔ کیونکہ اس کی جلد بندی ہی جاذب نظر خوب صورت اور خوش نمائی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس کا ٹائٹل رنگین ہے جس پر جلی حروف میں تحفۂ علمدار کشمیر بمنظوم و ترجمہ فارسی کلام حضرت شیخ العالم شیخ نور الدین نورانیؒ درج ہے۔ زیرین حصے میں علمدار کشمیر کے آستانہ جدید کی تصویر چھاپی گئی ہے اور مترجم اسد اللہ اسدؔ درج ہے۔ جلد کے آخری صفحے پر مترجم کی خوبصورت تصویر دی گئی ہے اور اس کے نیچے ان کا یہ فارسی کلام بھی درج ہے۔

اے زِ کبر و آزو نخوت دور شو
وز ریاضت شاد دل مسرور شو
خاک پائے عارفان را سرمہ ساز
پس اسد اللہ اسدؔ مخمور شو

اس صفحے کے بالائی حصے میں کتاب سے متعلق بزبان انگریزی بھی ایک مختصر تعارف درج ہے۔

راقم تبصرہ نگار روایت سے ہٹ کر کتاب کے بارے میں اب اندرونی صفحات کے بارے میں مختصراً اپنے ناچیز تاثرات درج کرتا ہے۔

کتاب گرانمایہ کے صفحہ پر تحفۂ علمدار کشمیر کے عنوان کے تحت مترجم نے فارسی میں اس طرح تحریر کیا ہے۔

رہبر کشمیریاں در راہ دین   آن ولی پاک باطن نور الدین
از کلام او اسدؔ زمزم چکد   گفتۂ او' رمزِ قرآنِ مبین

اس رباعی کے دوسرے شعر کے پہلے لفظ آن کے بجائے آں' نونِ غنہ ہونا چاہیے تھا۔

کتاب کا انتساب موصوف نے اپنی والدۂ محترمہ کے بعد ابوالفقراء حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ بابا داؤد خاکیؒ بابا زین الدین ولیؒ بابا نصر الدین ریشیؒ بابا بام الدین اور دیگر خلفائے شیخ العالم اور ران کی والدہ وغیرہ کے نام کیا ہے اور معتقدینِ و عاشقان شیخ نور الدین کی خدمت میں اس ترجمہ کو ہدیہ کیا ہے۔ کتاب زیر تبصرہ کے صفحہ نمبر ۴ پر شاعر اسد اللہ اسدؔ کی ایک کشمیری نظم نظر آتی ہے۔ "یہ چھے پانہ مبارک" اور اس کے بائیں صفحے پر اس نظم کا فارسی ترجمہ دلا باد مبارک کے عنوان سے درج ہے۔

اس بیش قیمت کتاب کا پیش گفتار فارسی میں لکھا گیا ہے جو کہ تفصیل سے لکھا گیا ہے اور یہ تعارف نامہ اور حالات مصنفِ کتاب نے چوالیس صفحات پر قلمبند کیے ہیں۔ یہ پیش گفتار پڑھ کر مترجم کا فارسی زبان پر عبور رکھنا بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ ایک انمول تحفہ عنوان کے تحت جناب بشیر

منگوالپوری نے اردو زبان میں کتاب کے بارے میں اپنے قیمتی تاثرات درج کیے ہیں۔

تبرک عشق از ستیش ول سرینگر، خوشنودی از عبدالرحمن لطیف، علمدار سخن از ہلال دلنوی عنوانات کے تحت کتاب میں بہت ہی قابل قدر علمی باتیں درج کی گئی ہیں۔

تحفۂ علمدار کشمیر میں فاضل مترجم نے کلام شیخ سے چارسو (۴۰۰) شلوک کا انتخاب کیا ہے۔ جن میں حضرت شیخ نور الدینؒ کے بصیرت افروز اور عارفانہ کلام کے ذریعہ رہنمایانہ رول ادا کیا ہے۔ اس انتخاب کی تفصیل اور کلام کی معنویت کے بارے میں کچھ لکھنا طوالت کا تقاضہ کرتا ہے جس کی اس تبصرے میں گنجائش نہیں ہے۔ کتاب کے صفحات کے دائیں طرف حضرت شیخ کا یہ منظوم کلام کشمیری میں دو دو شلوکوں پر مشتمل ہے اور اس کا دلآویز فارسی ترجمہ کتاب کے صفحات کے بائیں جانب دو دو شلوکوں میں لکھا گیا ہے۔

قدیم اور متروک کشمیری الفاظ جن کا شیخ العالم کے کلام میں استعمال کیا گیا ہے کو آج کل کے کشمیری عوام کے لیے سمجھنا خاصا مشکل ہے۔ مگر جناب اسد اللہ نے اس پیچیدہ اور مشکل منزل کو بھی کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے اور ایسے مشکل الفاظ کے معنیٰ اور مفہوم کو سمجھنے کے لیے حتی المقدور متبادل فارسی الفاظ کا سہارا دیا ہے۔

ترجمہ کتاب کے اختتام پر مترجم نے آرزوئے شوق کے عنوان کے تحت فارسی میں ایک نظم تحریر کی ہے جو کہ کتاب کی زینت کو بڑھاتی ہے اس میں نظم نگار نے اپنی عاجزی کا اظہار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مترجم کی اس مناجات کو قبول فرمائے۔

کتاب کے آخری صفحات پر باریک حروف میں کشمیری الفاظ کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ درج کر کے ان کے مطالب بھی درج کیے ہیں جو کہ قارئین کلام حضرت شیخ کے لیے بہت ہی سودمند رہیں گے۔

کتاب کا سال اشاعت ۲۰۱۹ء ہے اور اس کا ہدیہ مبلغ ۷۰۰ روپیہ ہفت سرہندی رکھا گیا ہے جو کہ کتاب کی چھپائی اور عمدہ ورنگین کاغذ کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔

صاحبانِ علم اور اہل ذوق وفارسی دان حضرات کے لیے یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے اور علمی اداروں اور لائبریریوں میں اس کا موجود ہونا بہت ہی سودمند رہے گا۔

مکاتیب مسعود

اردو زبان وادب میں مکتوب نگاری کی اپنی ایک الگ تاریخ ہے۔ دراصل بزرگانِ سلف کے دورِ مسعود سے خطوط نگاری کا سلسلہ رائج ہوا ہے۔ اولیائے کرام نے بھی زبانِ فارسی میں یہ مبارک کام سرانجام دیا ہے۔ اپنے متوسلین اور عقیدت مندوں کی راہنمائی کے لیے انہوں نے اپنے اصلاحی خطوط سے بھی تبلیغ و اشاعت کا کام انجام دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مکتوبات امام ربانی شیخ احمد فاروقی سرہندی کے مکاتیب مبارکہ کئی جلدوں میں چھپ چکے ہیں اور اسی طرح سلطان المحققین حضرت مخدوم جہاں شیخ شریف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات گرامی بھی مکتوبات دوصدی عنوان کے تحت اشاعت پذیر ہو کر عوام اور خاص کے لیے رشد وہدایت کا ذریعہ بنے ہیں گو یہ سبھی خطوط زبانِ فارسی جو کہ اپنے زمانے میں رائج الوقت زبان تھی میں لکھے گئے تھے مگر اردو ادب کے متوالوں نے ان گرانقدر خطوط کے مجموعہ کا زبانِ اردو میں ترجمہ کر کے شائقین کی علمی پیاس کو دور کیا ہے۔ اردو زبان کے قادر الکلام شاعر مرزا غالبؔ کے خطوط بھی اپنی ادبی اہمیت رکھتے ہیں اور اردو زبان سے وابستہ قلم کار ادیب، شاعر، محققین حتی المقدور غالب کے ان ادبی گوہر ریزوں سے استفادہ کرتے ہیں اسی طرح ماضی قریب کے معروف

دانشور، مفکر اور شاعر علامہ اقبال کے خطوط بھی اردو زبان میں کئی مجموعوں کی صورت میں چھپ کر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں اور تحقیق کرنے والے ان خطوط کی روشنی میں علامہ کی علمی اور مفکرانہ شخصیت پر تحقیق کے میدان میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔مکتوب نگاری کے بارے میں ایک علم دوست ادیبہ یوں رقم طراز ہیں۔

خطوط مختلف اوقات میں لکھے جاتے ہیں۔اسی لیے ان میں مختلف النوع طریقے بھی وضع ہوئے ہیں۔کبھی استفسار کے جواب میں لکھا جاتا ہے تو کبھی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اور کبھی اپنی ناتمام آرزوؤں اور خوابوں کے اظہار کے لیے تحریر کیا جاتا ہے۔جو شرمندۂ تعبیر ہونے کے لیے کوشاں و منتظر ہوتے ہیں۔خطوط کے کئی اقسام ہیں مگر ادیبوں اور شاعروں کے خطوط نہ صرف ادبی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں بلکہ لکھنے والے کی دل کی عمیق گہرائیوں میں جا کر اپنا نشیمن بناتے ہیں۔اسی نقطۂ نظر سے ادیبوں کے خطوط کا بالاستعیاب مطالعہ محققین کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔جیسے کہ پروفیسر گیان چند جین رقم طراز ہیں:

''کسی ادیب کے ذہنی ارتقاء و ادبی سفر اور اس کی تصانیف کو سمجھنے میں اس کے مکاتیب سے جو مدد ملتی ہے وہ سب سے مستند تحقیقی ماخذ ہیں''۔

(بحوالہ: کتاب عکس عکس آئینہ۔مرتبہ شمیم شبنم)

زیر تبصرہ کتاب مکاتیب مسعود کے نام سے ۲۰۱۷ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی ہے اور اس کے مرتب پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ ہیں۔یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی ہے۔کتاب کی جلد بندی بھی بہت عمدہ ہے۔کاغذ اور کمپیوٹر کتابت بھی جاذب نظر ہے۔یہ کتاب ان خطوط کا ایک مجموعہ ہے جو پروفیسر مسعود خان صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنے تلمیذ رشید مرزا خلیل احمد بیگ کو لکھے تھے۔جو کہ بعد میں علمی مراحل طے کر کے پروفیسر بن گئے۔

اسی کتاب میں مرتب جناب پروفیسر خلیل احمد بیگ نے وہ خطوط شامل کیے ہیں۔جو کہ مکتوب نگار کی طرف سے ان کے نام ۱۹۷۲ سے ۲۰۰۷ء کے عرصے کے درمیان لکھے گئے ہیں اور ۲۰۰ کی تعداد میں لکھے گئے مکتوبات کے بجائے مرتب کتاب نے صرف اس کتاب میں انتخاب کر کے ۱۵۰ خطوط شامل کیے ہیں۔مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان بہت ہی خوش گوار تعلقات رہے ہیں اور انہی خوش گوار تعلقات کی بناء پر مکتوب نگار نے اپنے اس شاگرد رشید کے نام لکھ کر ایک ادبی خدمت انجام دی ہے۔اگر چہ بعد میں استاد اور شاگردی کے دائرہ سے بڑھ کر یہ رشتہ دو محبین کی محبت اور دوستی پر بھی قائم ہوا تھا۔

دیباچہ ختم ہونے کے بعد ۱۴ صفحات پر مشتمل پروفیسر مسعود حسین خان کی زندگی ان کے خاندانی پس منظر گھریلو اور خاندانی حالات اور تعلیمی کیریئر پر ایک معلوماتی مضمون شامل کتاب ہے۔مضمون کا عنوان مسعود حسین خان ہے۔

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کا یہ مضمون پڑھ کر مترشح ہوتا ہے کہ مسعود حسین خان کی تاریخ پیدائش ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء ہے۔وہ اتر پردیش کے ضلع فرخ آباد میں پٹھانوں کی ایک قدیم بستی میں پیدا ہوئے تھے۔جس کا نام قائم گنج ہے مسعود حسین کے سر سے صرف ۲ سال کی عمر میں ہی ان کے والد کا سایہ اٹھ گیا تھا اور اس طرح والد کی وفات کے بعد ان کی پرداخت ان کے ننہال میں ہوئی تھی۔

مسعود حسین خان اپنی محنت شاقہ سے آگے بڑھتے گئے۔یہاں تک ابتدائی درجوں سے آگے بڑھتے ہوئے آپ نے موجودہ ذاکر حسین کالج دہلی یونیورسٹی سے بی۔اے اور ۱۹۶۱ء میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔اے اور ۱۹۴۵ء

میں پی' ایچ' ڈی (Ph.D) کر کے سرفراز ہوئے۔ان کا تعلق معزز پٹھان گھرانے آفریدی پٹھانوں سے تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خان' مسعود حسین خان کے چچا تھے جو صدر جمہوریہ ہند کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے تھے۔ان کے دوسرے چچا ڈاکٹر یوسف خان تھے جو کہ ایک ممتاز مورخ بھی تھے وہ بعد میں علی گڈھ یونیورسٹی میں پروائس چانسلر ہوئے تھے۔اس طرح علمی تفضّل مسعود حسین خان کو ورثے میں ملا تھا اور اس طرح یہ خاندان ہمہ آفتاب است کا مصداق ٹھہرتا ہے۔

مسعود حسین خان کے سوانحی مضمون میں خلیل احمد بیگ نے لکھا ہے کہ مسعود حسین خان پانچ بھائی بہن تھے۔تین بھائی اور دو بہنیں' اپنے علمی کیریئر کے دوران پروفیسر مسعود کو بہت سارے اعزازات حاصل ہوئے تھے۔ان کی تحقیقی اور تدوینی خدمات کا دائرہ بہت ہی وسیع تھا۔وہ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے۔ان کا مجموعہ کلام دونیم کے نام سے چھپ کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ان کا شمار چوٹی کے ماہرین لسانیات میں شمار ہوتا ہے۔لسانیات میں ان کا قابل قدر کارنامہ' مقدمہ تاریخ زبان اردو ہے جو ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ان کا دوسرا اہم تحقیقی کارنامہ ان کا مقالہ ''اردو صوتیات کا خاکہ'' ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر موصوف کے ادبی تنقیدی مضامین مصحفیؔ' اقبالؔ' اصغر گونڈویؔ' جوشؔ وغیرہ پر لکھے گئے ہیں۔مضمون کا مطالعہ کر کے پتہ چلتا ہے کہ ۷۰-۱۹۶۹ء کے دوران پروفیسر مسعود حسین خان انجمن ترقی اردو ہند کے قائم مقام سیکرٹری مقرر ہوئے تھے۔ ۷۳-۱۹۷۱ء میں علی گڈھ کے تحقیقی مجلّے فکر و نظر کے ایڈیٹر رہے تھے۔ان کی خود نوشت حیات وروِد مسعود کے نام سے تحریر کی گئی ہے جو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

مسعود حسین خان کو حالات وواقعات زندگی' غالبیات اور اقبالیات کا بھی گہرا مطالعہ تھا۔ بالآخر اردو زبان وادب کا یہ شیدائی اور بے لوث محقق' ادیب' شاعر اپنی گرانقدر خدمات انجام دیتے ہوئے ۹۱ سال سے زیادہ کی عمر میں ۱۶ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو وفات پا گیا اور اپنے علمی گہوارے کی آغوش یعنی علی گڈھ میں ہی سپرد خاک کیا گیا۔

پروفیسر خلیل احمد بیگ کے لکھے گئے اس سوانحی مضمون کے بعد کتاب کے صفحہ نمبر ۱۵ سے مکتوبات مسعود کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے اور یہ سلسلہ کتاب کے صفحہ نمبر ۲۱۹ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔جیسا کہ پہلے ہی لکھا گیا ہے کہ کتاب مذکور میں صرف ۱۵۰ خطوط ہیں۔لگ بھگ یہ سبھی خطوط صاحب مکتوب نے جاوید منزل جامع اردو علی گڈھ سے لکھے ہیں اور مکتوب الیہ نے یہ خط تاریخ وار شامل کتاب کئے ہیں۔خط نویسندہ نے ہر ایک خط کی شروعات محبی بیگ صاحب کے محبت بھرے الفاظ سے کیا ہے۔

ان خطوط کا سرسری مطالعہ کرنے سے بھی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ سبھی خطوط ادبی چاشنی لیے ہوئے ہیں ان میں کسی ادیب یا شاعر کی اپنی ذاتی زندگی میں جھانکنے کی بات نظر آتی ہے۔ان خطوط کو پڑھ کر کسی ادیب کی زندگی کے ساتھ ساتھ عصری اور معاشرتی صورت حال کا بھی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مسعود حسین خان کے اِن خطوط میں ان کی ذاتی زندگی' علمی مشاغل' مصروفیات' باہمی کتابوں کی ترسیل اور تبادلہ غرض ایک انسان کو زندگی میں مختلف پیش آنے والے حالات کی آگاہی ہے۔اس طرح یہ مراسلت مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان ایک بے تکلف اور بلا شرکت غیرے دلچسپی کا خزانہ ہے۔ایسے خطوط آنے والے نسلوں کے لیے بھی دلچسپی کے علاوہ علمی موشگافیوں کی گتھیاں سلجھانے کے لیے مددگار ثابت ہوسکتے ہیں اور یہ ایک زمانے کی تاریخ مرتب کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔کتاب زیر نظر کی یہ بھی بڑی خوبی ہے کہ صاحب

مکتوب نے اپنے خطوط کے حاشیوں پر نمبر دار وضاحتی بیانات درج کیے ہیں۔ کہیں الفاظ کی تشریح، کہیں جملوں کی تفسیر اور کہیں کسی خاص بات کی بھرپور وضاحت' اس طرح یہ کتاب خطوط نگاری کا ایک گلدستہ قرار دی جاسکتی ہے۔

خطوط ختم ہونے پر اشاریہ کے عنوان سے ان اشخاص کے نام صفحہ نمبر کے ساتھ درج ہوئے ہیں جس کا ذکر مسعود حسین خان کے خطوط میں ہوا ہے۔

کتاب کے آخر پر صاحب کتاب یعنی مرزا خلیل احمد بیگ نے ''من کہ'' کے دل پسند عنوان کے تحت اپنی پیدائش اور تعلیمی کیرئیر کے بارے میں قارئین کتاب کو معلومات فراہم کی ہیں۔ جس کو پڑھ کر بیگ صاحب کی زندگی کے بارے میں جاننے کی غرض سے اور تشنگان علم کو بہت حد تک سیرابی ہوجاتی ہے۔ دراصل خلیل احمد بیگ نے مسعود حسین خان سے ہی شرف تلمذ حاصل کیا ہے اور ان کی زیرنگرانی ضروری علمی مراحل کو طے کر کے سندیں حاصل کی ہیں۔ علی گڈھ سے فراغت کے بعد صاحب مضمون نے بیرون ملک بھی اپنی خدمات انجام دی ہیں اور اس طرح وہ بھی نامی گرامی مصنفین اور محققین کی صف میں شامل ہوکر بلندیوں کو چھو گئے ہیں۔

کتاب کی اہمیت کے پیش نظر یہ کتاب علمی اداروں اور نجی لائبریریوں میں موجود رہنی چاہیے اور شائقین اردو خاص کر مکتوباتی ادب کے شائقین کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

علامہ اقبال اور مرزائیت

رواں سال یعنی ۲۰۱۴ء کے اگست میں شہنشاہ ہوٹل سرینگر میں ایک تاریخی اور پروقار تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ تقریب اردو اکادمی سرینگر کی طرف سے منائی گئی۔ اس میں ملک کی مختلف ریاستوں سے اردو زبان وادب کے شعراء کرام کے علاوہ وادی کشمیر کے بھی بہت سارے شعراء شریک ہوئے تھے۔ تقریب دو دن برابر چلتی رہی اور اس میں بہت سارے مدعو حضرات شامل تھے۔ تقریب کے دوران پہلے روز وحشی سعید کی چار ادبی کتابوں کی رونمائی اور چار دہائیوں کے بعد رسالہ نگینہ کا از سر نو اجراء عمل میں لایا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر اشرف آثاری صاحب کی تصنیف علامہ اقبال اور مرزائیت کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔

جناب ڈاکٹر اشرف آثاری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آثاری صاحب اگرچہ اپنے پیشے کے لحاظ سے ایک معالج ہیں مگر خدا تعالیٰ نے ان کو اس کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی ذوق سے بھی نوازا ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور بہترین انسان بھی وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کے اکثر مضامین اخبار ورسائل میں چھپتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ او رمرزائیت کے موضوع سے ڈاکٹر اشرف آثاری نے ایک اہم ترین انتخاب کیا ہے۔ موجودہ حالات وواقعات کے تناظر میں ایسی تصنیف منصۂ شہود پر لانے کی اشد ضرورت تھی۔ آج کے دور میں بہت سارے اسلام دشمن اور دین بیزار ایجنسیاں اور جماعتیں برابر مصروف عمل ہیں اور دینی احکام ومسائل اور صحیح عقائد اسلام سے بے خبر نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو ورغلا کر کفر وشرک کے اندھیاروں میں پھنسا کر ان کی عاقبت کو خراب کرتی ہیں۔ مرزائیت اور عیسائیت کے جھانسے میں لاکر ان سادہ لوح نو خیز کلیوں کو کہیں پیشوں کا اور کہیں نوکریوں اور دیگر سہولتوں کا لالچ دلا کر ان کے دین وایمان کو خریدا جاتا ہے۔ یہ زہر آلود ہوائیں اپنے آغاز سے چلتی ہیں۔ بہت سارے علماء کرام نے مرزائیت اور دیگر خلاف اسلام سازشوں کے خلاف اپنے قلم سے جہاد کا فریضہ انجام دیا ہے۔ خاص کر مرزائیت اور قادیانیت کے خلاف ثناء اللہ امرتسری 'مولانا محمد انور شاہ محدث کشمیری' سید عطا اللہ شاہ بخاری' مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے نام سرفہرست ہیں خاص کر ثنا اللہ امرتسری

اور امام العصر مولانا انور شاہ صاحب اس کاروان کے سرخیل اور جرنیل مانے جاتے ہیں۔مگر ان علمائے کرام کی وفات کے بعد بھی یہ فتنے کہیں نہ کہیں اور کبھی کبھی دوبارہ سر اٹھاتے رہے ہیں۔بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارے محترم اشرف آثاری نے علامہ اقبال اور مرزائیت جیسی کتاب چھاپ کر ایک طرف اپنے عشق اقبال اور اقبال شناسی کا ثبوت دیا ہے تو دوسری طرف وہ ہاتھ میں قلم تھام کر مرزائیت کے خلاف قلمی مجاہد کی طرح بر سر پیکار نظر آتے ہیں۔کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرزائیت کی خطرناک تحریک اور تاریخ پر ان کا گہرا مطالعہ ہے۔مرزائے قادیان کے عقائد اور نظریات کو ڈاکٹر آثاری نے بے نقاب کیا ہے اور انگریز کے اس پروردہ پٹھو وظیفہ خوار کے باطل عزائم سے اپنے پڑھنے والوں کو باخبر کیا ہے۔

موصوف نے اپنی اس بے نظیر تصنیف لطیف میں مرزا کے باطل عقائد اور دین و ایمان کو جہنم کی وادیوں میں پہنچانے والے خیالات اور خاص کر انکار نبوت کے جابجا حوالے پیش کیے ہیں اور مرزائیوں کی کتابوں، رسائل اور اخبارات سے ثبوت فراہم کیے ہیں۔ڈاکٹر آثاری نے خاندان اقبال سے تعلق رکھنے والے علامہ کے بڑے بیٹے آفتاب اقبال اور ان کے بھتیجے اعجاز احمد جو کہ دونوں مرزائیت سے وابستہ تھے کے بارے میں ان کے دلائل کا تاریخی حوالوں سے اطمینان بخش جواب دیا ہے اور ناقابل تردید حقائق پیش کیے ہیں۔اسی طرح کتاب کے ابتدائی ابواب میں مختار ٹونکی صاحب اور انور شیخ کے بے بنیاد اور بے ہودہ باتوں کا ٹھیک طرح پوسٹ مارٹم کیا ہے اور اُن کو ان کی شرم ناک تصویر دکھائی ہے۔

علامہ اقبال کے دور سے ہی معترضین اقبال کی ایک خاصی تعداد نظر آتی ہے جنہوں نے اپنی بے بصیرتی سے چمکتے آفتاب پر اپنی زبان درازی کر کے اپنے انجام اور عاقبت کا برا کیا۔علامہ مرحوم کی عالمانہ شخصیت آج بھی برابر اطراف عالم میں آفتاب و ماہتاب کی طرح برابر ضوفشان ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی اپنے فیوض و برکات سے برابر سعادت مندان ازلی اور قلب سلیم رکھنے والوں کو مستفید کرتی رہے گی۔وہ ایک سچے دین دار مسلمان عاشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سچے دل سے الہامی کتاب یعنی قرآن مقدس کے بھی عاشق تھے۔جتنا اور جس قدر بھی ان کی ذاتِ والاصفات پر خدانخواستہ کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی جائے گی اس سے زیادہ ان کے نکتہ چین اور معترضین کی روسیاہی ہوتی رہے گی کیونکہ ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

آج بھی چاردانگ عالم میں اس مرد خود آگاہ اور خدا آگاہ کا نام نامی عزت و تکریم سے لیا جاتا ہے۔مگر مختار ٹونکی اور انور شیخ جیسے ادبی کیڑوں کا کوئی بھی نام لیوا نہ ہوگا۔آج بھی اس مرد قلندر کی قبر پر روزانہ سال بھر زائرین حاضر ہوتے ہیں اور آیاتِ بینات اور فاتحہ کی صورت میں اپنا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔بقول اقبال ؎

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

الحمدللہ ان سطور کو لکھنے والے کو بھی حضرت علامہ کے مقبرے پر دوبار حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے اور ان کے فرزند جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال سے ایک بار شرف ملاقات حاصل ہوا ہے اور ان کے ساتھ خط و کتابت بھی ہوئی ہے۔

(باقی ص 23 پر)

آغا شاعر قزلباش دہلوی

آغا شاعر قزلباش دہلوی ایک ایسے ادیب اور شاعر ہیں جو کہ موجودہ زمانے میں ادبی حلقوں کی نگاہوں سے کچھ اوجھل ہو گئے ہیں۔ ان کی شخصیت انیسویں صدی کی آخری تیسویں دہائیوں سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی ان کی تاریخ ولادت ۵ مارچ ۱۸۷۱ء ہے۔ آغا شاعر ان کا تخلص اور نام آغا ظفر علی ہے۔ دلی میں مقیم تھے۔ آغا شاعر کو حضرت داغؔ دہلوی کا شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ دراصل آغا شاعر قزلباش کی حیات وشاعری سے متعلق زیرِ تبصرہ کتاب ڈاکٹر ظفر حیدری صاحب کا ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ اس تحقیقی مقالہ پر لکھنؤ یونیورسٹی نے سال ۲۰۰۱ء میں ظفر حیدری کو پی ایچ ڈی (Ph.D.) کی ڈگری عطا کی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں انتساب اور دیباچہ کے علاوہ ۱۴ ابواب ہیں۔ پہلا باب آغا شاعرؔ کے حالاتِ زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ پورے باب میں ان کی حیات اور خدمات کا تفصیلی اور تسلی بخش جائزہ لیا گیا ہے۔ اپنے زمانے میں مرحوم شاعرؔ نے چار دانگ عالم میں کافی شہرت پائی تھی مگر زمانہ نے اس قادر الکلام شاعر کو اس قدر بہت جلد فراموش کر دیا۔

کتاب کے دیگر ابواب مصنف نے اس طرح ترتیب دیئے ہیں۔ آغا شاعر کی غزل گوئی، آغا شاعرؔ کے مشاعرے، آغا شاعرؔ کی نظم گوئی، آغا شاعر کی مرثیہ گوئی، بیچ بیچ میں دیگر ابواب کو چھوڑ کر یہ ابواب بھی قابل توجہ ہیں۔

باب ۱۰ اور باب ۱۱ انتخاب غزلیات او رانتخابات منظومات آغا شاعر قزلباش پر مشتمل ہیں۔ ان ابواب میں شاعر کی چیدہ چیدہ غزلوں اور منظومات کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

بارہویں باب میں فاضل مصنف نے مضامین آغا شاعر کو منتخب کر کے قابل قدر کام کیا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک مضمون بعنوان ''یادِ وطن'' سے درج ذیل چند سطور بغرضِ مطالعہ درج کی جاتی ہیں۔

''پیارے وطن راج دلارے وطن۔ اے بائیس خواجہ کی چوکھٹ ! دلی۔ شاہ جہاں آباد کوئی دن نہیں جاتا جو میں تیرے لیے جلوۂ آنسوؤں سے نہ روتا ہوؤں۔ اے جنت سواد شاہ جہاں آباد! تیرہ خاک مجھے پسے ہوئے موتیوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میں تجھ ہی میں پیرا ہوا۔ کھیل کود کر بڑھا۔ تو نے ہی پال پوس کر پروان چڑھایا اور اب تجھ ہی میں مرنا بھی چاہتا ہوں تو کہاں ہے۔ کس مقام پر ہے۔ میں تو اس جگہ پر سو سو دفعہ سر کے بل جا کر کھڑا ہونے کو تیار ہوں جہاں تیری چھینٹ ہی پڑی ہو۔ تیری ہوا ہی ادھر سے آتی ہو۔ اے میرے بچپن کے گہوارے۔ میری جوانی دیوانی کی گلزار دنیا! میری زندگی کی خوشگوار چہل پہل اگر دنیا پر کوئی محبوب ترین چیز ہے تو وہ میرے لیے تو ہے فقط تو۔

الغرض زیر تبصرہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اردو دان طبقہ کے لیے یہ ہر لحاظ سے مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ مصنف کتاب ڈاکٹر ظفر حیدری نے کوئی صدی قبل کے نایاب اور نادر الوجود رسالوں کے حوالہ جات سے کام لیا ہے اور بڑی محنت اور عرق ریزی سے یہ مقالہ کتاب کی صورت میں چھپوا کر عالی ظرفی اور بلند ہمتی کا ثبوت دیا ہے۔ ایسا کیوں نہ بھی ہو۔ مصنف جو برصغیر ہندو پاک کے معروف محقق، نقاد و رادیب جناب پروفیسر اکبر حیدری کے فرزند دلبند ٹھہرے۔ جن کا حال ہی میں انتقال پر ملال ہوا ہے اور دنیائے اردو ادب ابھی ان کی جدائی میں ماتم کناں ہے۔ اپنے والد مرحوم کی تقلید میں ڈاکٹر ظفر حیدری نے بھی بہت حد تک تحقیق کا حق ادا کیا ہے اور کتاب کو قابل مطالعہ بنا کر شائقین اردو کے لیے راحت رسانی کا کام انجام دیا ہے۔

مرزا بشیر احمد شاکر کی کتب پر تبصرے

"گلرنگ"

مبصر: ڈاکٹر محمد ظفر حیدری

مرزا بشیر احمد شاکر کی شخصیت اور ادبی خدمات عزت اور عظمت کی حامل ہیں۔ ان کی تصانیف نے عوام کو حقیقت سے روبرو کرنے اور عام زندگی کے حالات سے آگاہ کرنے کا کام کیا ہے۔ موصوف ایک اچھے ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی۔ اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ فارسی زبان پر بھی کافی دسترس حاصل ہے۔ اگر چہ موصوف کا ادب سے براہِ راست کوئی تعلق نہ ہے، اور نا ہی درس و تدریس سے وابستہ ہیں، لیکن محکمہ ڈاک و تار میں ملازمت کرنے کے باوجود، اُنہیں ادبی جنون اس قدر ہے کہ اپنی جیبِ خاص سے ایک کثیر رقم صرف کر کے کتابیں خریدتے ہیں اور مطالعہ میں محو ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کتب بینی کے ساتھ ساتھ موصوف کو لکھنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔

بقول پروفیسر اکبر حیدری صاحب کشمیری:

''شاکر صاحب علم دوست اور اقبال کے عاشق ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی کے ڈاک خانے میں ملازم ہیں اور معمولی تنخواہ پاتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ جو لوگ اردو کے دعوے دار ہیں اور بڑی بڑی رقمیں تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کو کتاب تو درکنار ایک رسالہ خریدنے کی توفیق نہیں ہے۔ شاکر صاحب کا ظرف بلند، نظر وسیع اور مذاقِ علم تیز تر ہے۔ غرض یہ کہ انہیں کتب بینی کا بہت شوق ہے''۔ (گلرنگ، صفحہ 15)

پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی زیرِ نظر کتاب کے پیش لفظ میں شاکر صاحب کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''مرزا بشیر احمد بیگ شاکر کشمیر کے ایک سنجیدہ اہلِ قلم اور صاحب فکر اقبال شناس اور ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ پہلے ہی کئی ایک علمی کتابیں شائع کر چکے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''گلرنگ'' کے نام سے ادبی اور علمی مضامین کا مجموعہ تیار کیا ہے جو شائع کرنے جا رہے ہیں جس میں علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ بعض انشائیہ ادب کی نمایاں تحریریں بھی شامل ہیں''۔

مرزا بشیر صاحب کی اب تک چار کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں:

1۔ کتابیں ہم نشیں میری (اردو)
(کتابوں کی اہمیت وافادیت اور مطالعہ سے متعلق ایک دلچسپ کتاب)

2۔ پوت آلو (کشمیری)
(کشمیر کے گذشتہ نامساعد اور پُر آشوب حالات سے متاثر ہو کر مثنوی نما پر اثر نظمیں)

3۔ علامہ اقبال کے دیس میں (اردو)
(تین پاکستانی سفرناموں پر مشتمل ایک دلآویز داستان)

4۔ لوہتی گلاب (کشمیری)
(کشمیری مناجات اور نعتوں کا دلچسپ گلدستہ)

علاوہ ازیں مرزا صاحب کے اب تک متعدد تنقیدی و تحقیقی مضامین، غزلیں اور نظمیں ملک کے مشہور رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں جن میں ماہنامہ ''حکیم الامت'' سری نگر

قابلِ ذکر ہے۔

غرض یہ کہ مرزا بشیر احمد بیگ شاکر کا علمی، ادبی اور تحقیقی سفر ذوق وشوق سے جاری ہے۔ زیرِ نظر کتاب ادبی، علمی، تبصروں و تاثرات پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے جو 338 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ برِ صغیر کی جن شخصیات پر مضامین تحریر کئے گئے ہیں ان میں پروفیسر اکبر حیدری کشمیری، جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال (لاہور)، ڈاکٹر کے پی شمس الدین ترور کاڈ (کیرلا) غلام رسول بانڈے، صوفی غلام محمد، پروفیسر غلام نبی فراق وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس باب میں تقریباً 25 مضامین ہیں۔ تبصرے اور تاثرات والے باب میں مزید 18 تحریریں تبصروں کی شکل میں شامل کی گئی ہیں جن میں درج ذیل کتب پر بصیرت افروز تبصرے قابلِ ذکر ہیں:

اقبال نادر معلومات، معرکہ اسرارِ خودی، اقبالیات اور زمانہ کانپور (پروفیسر اکبر حیدری کشمیری)، آغا شاعر قزلباش دہلوی (ڈاکٹر ظفر حیدری)، کلیاتِ حالیؔ (ڈاکٹر سید تقی عابدی)، منظوم کشمیری ترجمہ مسدسِ حالیؔ (سلطان الحق شہیدیؔ)، جلاوطن (خالق پرویز)، حیات میر شعبان (عبدالرحمٰن لطیفؔ)، تحفۂ علمدارِ کشمیر (اسد اللہ اسدؔ)، مکاتیبِ مسعود (پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ)، علامہ اقبالؔ اور مرزائیت (ڈاکٹر اشرف آثاری)۔

اسی باب میں مرزا بشیر شاکر نے اپنی دو کتابوں پر تبصرے بھی شامل کئے ہیں۔ ''کتابیں ہم نشیں'' (مبصر ڈاکٹر ریاض توحیدی) اور ''علامہ اقبالؔ کے دیس میں'' (مبصر سہیل سالم)۔ دو تاثرات از ایم ایس رحمٰن شمسؔ اور پروفیسر اکبر حیدری کو بھی زیرِ نظر کتاب کی زینت بنایا گیا ہے۔ شمسؔ صاحب شاکر صاحب کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''قبلہ مرزا بشیر احمد شاکر دنیائے علم وادب میں ایک قابلِ احترام نام جنہوں نے اپنی علم دوستی اور ادب نوازی کے سفر میں اب تک متعدد فکر انگیز کتابیں اردو، کشمیری میں لکھ کر صاحبِ علم و فکر حضرات کے نزدیک اپنا ایک منفرد نام اور شناخت بنائی ہے''۔ (صفحہ: 333)

پروفیسر حیدری شاکر صاحب سے اپنے تعارف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں چند برسوں سے جناب مرزا بشیر احمد صاحب شاکر سے غائبانہ طور پر واقف تھا۔ ایک مرتبہ میرا کوئی مضمون شیرازہ سری نگر میں شائع ہوا۔ شاکر صاحب کو وہ پسند آ گیا اور فون پر مضمون کے بارے میں گفتگو کی۔ جب اقبالؔ پر میری دو کتابوں کی رسمِ رونمائی ڈائرکٹوریٹ آف لائبریریز کے زیرِ اہتمام ہوئی تو انہوں نے شام کو مجھے ان کے بارے میں استفسار کیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر فون آیا کی کتابیں کہاں سے دستیاب ہوسکتی ہیں؟ مجھ سے رہا نہ گیا اور کہا کہ دونوں کتابوں کی قیمت نو سو روپے ہے۔ میں نے ان کو کتابیں بھیجیں اور انہوں نے اسی وقت پوری رقم ادا کی''۔ (صفحہ: 337)

پروفیسر اکبر حیدری صاحب کشمیری کا انتقال 18 ستمبر 2012 کو ہوا۔ چنانچہ مرزا بشیر احمد شاکر اپنے مضمون ''پروفیسر اکبر حیدری: مردِ قرطاس وقلم'' میں یوں انتقال کا تذکرہ کرتے ہیں:

''داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

ریڈیو کشمیر سے جونہی یہ جانکاہ خبر سنی کہ اردو کے نامور محقق، ادیب اور نقاد اکبر حیدری رحلت کر گئے تو میں بالکل اس بات پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ کیونکہ مجھے ان کی بیماری وغیرہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ میں نے مرحوم کے فرزند سے موبائیل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس میں کوئی کامیابی نہ ہوسکی۔ پھر

دل پر جبر کر کے یقین کرنا ہی پڑا اور کلامِ الٰہی میں درج موت کی حقیقت کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اس موقعہ پر میرے منہ سے بے ساختہ انا للہ و انا الیہ راجعون نکل گیا''۔ اپنے مضمون کو شاکر صاحب یوں تمام کرتے ہیں: (صفحہ:13)

''اب حیدری صاحب کے بعد اردو ادب اور زبان کے شیفتگان کا میدان جیسا خالی لگ رہا ہے۔ آج اردو زبان کو اس کے دشمنوں نے اپنے نرغہ میں لیا ہے اور ہر طرف سے یہ زبان بادِ سموم کے تھپیڑے کھائے جا رہی ہے۔ دشمنوں کی سازشیں اس کی جڑیں کاٹنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کے بہی خواہ اور ہمدرد، حیدری مرحوم کے نقشِ قدم پر چل کر اس زبان کی بقاء اور آبیاری کے لئے کمر بستہ ہو جائیں اور دشمنوں کے برے ارادوں کو خاک میں ملائیں۔ یہی اردو ادب کے محسن کو بہترین خراجِ عقیدت ہوگا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں''

شخصیات کی فہرست میں سے ایک اور نام قابلِ ذکر ہے جس پر مرزا بشیر احمد شاکر نے ''جسٹس جاوید اقبال سے ایک یادگار ملاقات'' کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مضمون قلمبند کیا ہے۔ پروفیسر اکبر حیدری اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے دیرینہ تعلقات رہے لیکن یہ صرف خطوط کے حد تک ہی رہے۔ کافی کوششوں کے باوجود کبھی دونوں کا آمنا سامنا نہ ہوا۔ جب حیدری صاحب کو پاکستان میں نقوش ایوارڈ سے نوازا گیا تھا تو انہوں نے کافی کوشش کی تھی کہ وہ سرزمینِ پاک پہنچ جائیں اور کئی اہم شخصیات سے روبرو ہوسکیں جن میں فرزند علامہ اقبال جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال بھی شامل تھے۔ لیکن اس وقت کے پُر آشوب حالات کی وجہ سے حیدری صاحب پاکستان کے دورے سے محروم رہے۔ اس اعتبار سے مرزا بشیر احمد شاکر صاحب خوش قسمت ہیں کہ انہیں پاکستان میں ڈاکٹر جاوید اقبال سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جس کی روداد شاکر صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں پیش کی ہے۔ موصوف رقمطراز ہیں:

''علامہ اقبال کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔۔ اب جب کہ اُن کی وفات کے طویل مدت کے بعد یعنی 77 سال کے بعد ان کے فرزند دلبند ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب بقیدِ حیات ہوں اور اُن کی چہیتی صاحبزادی یعنی منیرہ صاحبہ بھی خدا کے فضل و کرم سے زندہ ہو تو کسی گرویدہ اقبال کے دل میں ان سے آتشِ ملاقات کے شوق کا بھڑکنا ظاہری سی بات ہے۔ علامہ اقبال کو اپنی آغوش میں لئے شہر نگاران یعنی لاہور پہنچ کر مجھے اُن کے مقبرے پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی اور ان کی دیگر یادگاروں کے علاوہ مجھے حضرت علامہ کے فرزند کے ساتھ ملاقات کا شوق، اُن کے درِ دولت پر لے گیا اور گلبرگہ پہنچ کر اُن کے ساتھ شرفِ ملاقات سے بہرہ ور ہوا''۔ (صفحہ:41)

شاکر صاحب مزید لکھتے ہیں:

''دورانِ گفتگو جسٹس جاوید اقبال نے بہت ساری باتین بتائیں۔ اپنے اسفار کے بارے میں بہت کچھ سنایا۔ چین اور شنگائی کے دورہ سے متعلق کارآمد باتیں کیں۔ موجودہ یورپی قوموں کی ترقی اور مسلمانوں کی پستی کے بارے میں کہا۔ تقلید اور اجتہاد کے بارے میں اپنے زریں خیالات سے آگاہ کیا۔ آخر ان کی شخصیت ایک بین الاقوامی شخصیت تصور کی جاتی ہے''۔

واضح رہے ڈاکٹر جاوید اقبال کا انتقال 3 اکتوبر 2015 کو لاہور میں 91 سال کی عمر میں ہوا۔ موصوف متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں افکارِ اقبالؔ، زندہ رود (تین جلدیں)، مئے لالہ فام، جہانِ جاوید، خطباتِ اقبالؔ، اپنا گریباں چاک وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے متذکرہ بالا کتب کے ذریعے ادب میں جہاں گرانقدر اضافہ کیا

ہے، وہیں انہوں نے اپنے والدِ محترم علامہ اقبالؔ کا نام بھی روشن کیا۔ جو لوگ جاوید اقبال کو محض علامہ کا فرزند تصور کرتے ہیں، وہ مرحوم کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہیں۔ بے شک جاوید اقبال علامہ کے فرزند تھے، لیکن انہوں نے اپنا مقام خود حاصل کیا۔ اُنہیں اُن شخصیات کے فرزندان میں شمار نہیں کیا جانا چاہیئے جنہوں نے اپنے والدین کا نام تو حاصل کیا، لیکن کام کچھ بھی نہیں کیا! اردو ادبا خاصکر ماہرینِ اقبالیات نے ہمیشہ اردو کی روٹی کھائی، لیکن اپنی اولادوں کو اردو ادب سے دور رکھا۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر جاوید اقبال قابلِ تعریف ہیں کہ ماہرِ قانون ہونے کے باوجود انہوں نے اردو ادب کا دامن نہیں چھوڑا۔

علامہ اقبالؔ اگر آج بقیدِ حیات ہوتے تو اپنے ایسے فرزند پر رشک کرتے۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینہء گفتار میں
آنے والے دور کی دُھندلی سی اک تصویر دیکھ

ایک اور شخصیت کا تذکرہ کرنا ضروری ہے جس کے بارے میں پروفیسر اکبر حیدری اور جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اپنی تحریروں میں لکھا ہے۔ ان کا تعلق کیرالا (جنوبی ہند) سے ہے اور مادری زبان ملیالم ہے۔ لیکن اردو زبان و ادب کے فدائی ہیں۔ میری مراد ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر کے پی شمس الدین ترورکاڈ سے ہے۔ ڈاکٹر شمس الدین کے بارے میں پروفیسر اکبر حیدری لکھتے ہیں:

''ہمارا مشاہدہ ہے کہ اردو ادارے اور اساتذہ اس نیم کشتہ زبان کے استحصال کے لئے اپنے حواریوں کی نکلی بیساکھیوں کا سہارا لے کر اردو کو دو دو ہاتھوں سے لوٹ لیتے ہیں۔ برعکس اس کے کیرالا کے ایک جواں سال محقق اور ماہرِ اقبالیات جناب کے پی شمس الدین ترورکاڈ اپنی حقیقی بیساکھیوں پر اعتماد کر کے دور افتادہ ادبی مجلسوں میں سفر کی بے پناہ سختیاں اور جسمانی تکلیفیں جھیل کر چار چاند لگاتے ہیں''۔

مرزا بشیر احمد شاکرؔ نے شاید اسی لئے شمس الدین صاحب کی شخصیت کو بھی اپنی کتاب کی زینت بنایا ہے۔ شخصیت کی پہچان کام سے ہوتی ہے اور ڈاکٹر شمس الدین کے کام سے اب اردو دنیا واقف ہو چکی ہے۔ شمالی ہند کے دہلی اور لکھنو کو اردو ادب کا گہوارہ تصور کیا جاتا تھا جہاں اردو اب دم توڑ رہی ہے۔ اس کے برعکس جنوبی ہند کی ریاستِ کیرالا میں شمس الدین جیسے لوگ اردو زبان و ادب کی خوب خدمت کر رہے ہیں جو ڈاکٹر کے پی شمس الدین کے ذیل کے مضامین سے عیاں ہے:

کیرالا میں اردو، کیرالا میں اردو شاعری، کیرالا میں اقبالیات، کیرالا میں اردو کی آمد، کیرالا کی واحد اردو ناول نگار: زلیخا حسین، کیرالا میں اردو کے فروغ میں پروفیسر قدرت اللہ صاحب کا رول، کیرالا جس پر اردو دنیا بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، اردو زبان اور انسان دوستی وغیرہ۔

بشیر شاکرؔ اپنے مضمون ''کے پی شمس الدین ترورکاڈ'' کو ان الفاظ پر تمام کرتے ہیں کہ

''میں راقم السطور طفلِ مکتب جیسا قلم کار اقبالؔ کے اس پرستار کے پی شمس الدین کی خدمت میں اپنا تحسین پیش کرتا ہوں اور ان کی اولوالعزمی اور ہمتِ مردانہ کی داد دیتا ہوں''۔

آخر میں دو کتب خانوں کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے جن کی نشاندہی مرزا بشیر شاکرؔ نے زیرِ نظر کتاب میں کی ہے۔ اول ''کتب خانہ اکبر حیدری اور دوم ''نہرو پارک سری نگر میں واقع کتب خانہ''۔ موصوف نے دونوں کتب خانے بچشمِ خود دیکھے ہیں اور ان کی تفصیلات اپنے مضامین میں بیان کئے ہیں۔

غرض مذکورہ کتاب واقعاً گلرنگ ہے۔ طباعت اور کاغذ کے اعتبار سے کتاب کی قیمت بھی کافی موزوں ہے۔ لہٰذا اس کتاب کے مطالعہ سے ہر شخص کو محظوظ ہونا چاہیئے۔

کتابیں ہم نشیں میری

(حصہ اول)

مبصر: ڈاکٹر ریاض توحیدی

پیش نظر کتاب ''کتابیں ہم نشیں میری'' کا نام دیکھ کر راقم کو ایک اور کتاب ''کتابیں، جنھوں نے دنیا بدل ڈالی'' (غلام رسول مہر۔ پاکستان) کی یاد تازہ ہوئی جو کہ چند برس قبل زیر مطالعہ رہی تھی۔ عربی میں کتابوں کی اہمیت کو یوں اجاگر کیا گیا ہے کہ ''الکتاب خیر جلیس''، یعنی کتاب بہترین ہم نشین ہے'، تو زیر تبصرہ بھی صاحب کتاب کی کتاب دوستی کا عملی ثبوت فراہم کرتی ہے۔ کیونکہ یہ نام انہوں نے نہ صرف کتاب کے لیے چنا ہے بلکہ کتاب میں شامل اپنی نظم کا عنوان ''کتابیں ہم نشیں میری'' کو ہی کتاب کا سرنامہ رکھنے کے لیے پسند بھی کیا ہے۔ چونکہ نظم کے ایک شعر میں کتابوں سے الفت کا اظہار یوں کیا گیا ہے:

کتابوں سے مجھے اپنی کہوں کیا؟ کیسی الفت ہے
یہ میرا وہ اثاثہ ہے جو سچ مچ بیش قیمت ہے
(ص۔۱۲۸)

تو اسی الفت کا عملی ثبوت زیر تبصرہ کتاب کے حسب ذیل مشمولات کا انتخاب ہے۔

کتابیں۔نظم (گلزار) کتابوں کا میلہ (پروفیسر بشیر احمد نحوی) کتاب، کتب خانہ اور کتب بینی (عبداللہ خاور) ذوق علم وشوق مطالعہ (رحم اللہ ندوی) اسلامی عہد قدیم میں مخطوطات کی اہمیت (مولانا عبداللہ عباس ندوی) سنجیدہ کتب بینی (عبدالغفار صدیقی) ذوق مطالعہ (عبدالرحمن مخلص) لائبریرین ڈے... کتب بینی کا شوق بڑھانے کا بہانہ (ڈاکٹر عبدالمجید بابا) ہم اور ہمارے اسلاف (محمد شریف قریشی) کتب بینی، مطالعہ علمی کمالات کی شاہِ کلید (غلام نبی کشافی) مطالعہ ومشاہدہ.... کتابیں بہترین دوست (ظہور مسعودی) زندگی میں ادب اور ادیب کی ضرورت (معراج حبیب) احوال وطن پہ ایک اور ناول (زیڈ جی محمد) کتابوں سے دوستی (قیوم زلفی) کتاب کلچر کے فروغ میں قومی وملی ذمہ داری (مبشر حسین) مطالعہ... علم وتحقیق کی کنجی (حافظ خورشید عالم) طلاب مطالعہ کا شوق پیدا کریں (انیس فاطمہ) مطالعہ کتب اور کشمیری سماج (فیض احمد فیاض) نور محمد.... علم دوست اور ادب نواز ناشر (محمد اقبال) دینی علم کی ترویج میں کتب خانوں کا کردار (غلام احمد چودھری) ادب کا مطالعہ ناگزیر کیوں؟ (سلیم ساغر) ڈل کے دل میں بسا کتب خانہ (ماجد مقبول) قلم وقرطاس کی دنیا (امتیاز عبدالقادر) کتاب سے دوری کیوں؟ (مظفر احمد شاہ) زبانوں کا زوال (سمیر احمد) قلم، قلم کار اور کتاب (سلیم سالک) پڑھائی کیسے کریں (قمر الزماں خان) کتابیں ہم نشیں میری۔نظم (مرزا بشیر احمد شاکر)

چونکہ کتاب میں شامل مضامین کی فہرست طویل ہے اس لیے چند صفحات میں سبھی مضامین پر بات نہیں ہوسکتی۔ پھر بھی تبصرے کے دوران کتاب کی اہمیت کا احاطہ کرنے کی کوشش رہے گی۔

کتاب کی شروعات معروف شاعر اور ہدایت کار گلزار کی نظم بعنوان ''کتابیں'' سے کی گئی ہے۔ نظم میں کتابوں کی اہمیت' مطالعہ کے لمس اور کتب بینی کی دم توڑتی روایت کو بڑے دل نشیں پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ نظم درجہ ذیل مصرعوں سے شروع ہوتی ہے:

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں (ص۔۵)

مطالعہ کے جدید وسائل جیسے کمپیوٹر' انٹرنیٹ' سوشل سائنس وغیرہ کے تناظر میں کتب بینی کے رجحان میں کافی حد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ اگرچہ دستیاب وسائل کا استعمال بھی علم و ادب کی ترویج میں فیض بخش ہی لگ رہا ہے تاہم کتب بینی میں

مطالعہ کی لطافت اور ذہنی تسکین پانے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔
مجموعی طور پر تالیف ھذا میں کتب بینی کی اہمیت وافادیت' مطالعہ کے شوق اور فائدے' کتب خانوں کی اہمیت اور ای مطالعہ کے پیش نظر کتب بینی کے گھٹتے رجحان پر متنوع مضامین پیش ہوئے ہیں اور ہر مضامین میں اِن مسائل وموضوعات پر بصیرت افروز روشنی ڈالی گئی ہیں۔ جن میں ایک دو مضامین کے اقتباسات یوں ہیں:

''علم و دانش کے مصادر اور منابع تک رسائی کا براہ راست ذریعہ کتابیں ہیں۔ کاغذ کے اوراق پر سیاہ حروف میں تحریر شدہ الفاظ وعبادات معلومات کی دنیا کا احاطہ کرتے ہیں۔ نظریات کی جنگ انہی سے لڑی جاتی ہے اور آنے والی نسلوں تک ماضی کا سرمایہ کتابوں کے ذریعے ہی منتقل ہوتا ہے''۔

(پروفیسر بشیر احمد نحوی۔ کتابوں کا میلہ ص ۷)

''کتاب ایسی ہم نشیں ہے جو ماضی کے مفکروں ان کے افکار' ان کی دانش وحکمت اور اقوام کے کارناموں کی ترجمانی ہے۔ دیکھا جائے تو کتابیں فکری قوتوں کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ یہ دماغی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا منبع اور مخزن ہیں۔ ان کی قوت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ کتاب انسانی ذہنوں اور خیالوں کا عکس ہے''۔

(عبداللہ خاور۔ کتاب' کتب خانہ اور کتاب بینی۔ ص ۱۱)

''اچھی کتاب انسان کی بہترین رفیق ہے۔ یہ اس وقت بھی ساتھ دیتی ہے جب کوئی بھی ساتھی ساتھ دینے پر آمادہ تیار نہ ہو۔ ہمارے کشمیر کی سرزمین علم وادب کے معاملے میں بڑی زرخیز ہے لیکن ذوق مطالعہ کی کمی نے یکتائے روزگار شاعروں او رادیبوں کو زندہ درگور کردیا۔ وہ اپنے احساسات کو نکاس عطا کرنے کے لیے لکھتے رہے اور دیدہ ودل سے چراغاں کرتے رہے لیکن ان کے کارنامے کسمپرسی کی وجہ سے دیمک اور چوہوں کی نذر ہوگئے''۔

(عبدالرحمن مخلص۔ ذوق مطالعہ۔ ص ۴۲۔ ۴۳)

چند مضامین میں مطالعہ کتب کے تعلق سے اسلاف کے شوقِ مطالعہ' قدیم مخطوطات کی اہمیت واشاعت اور علم وادب کو فروغ دینے میں مسلمانوں کی خدمات وغیرہ پر محققانہ اور عالمانہ گفتگو ہوئی ہے۔ مضمون ''ذوق مطالعہ او رشوق مطالعہ'' (رحمت اللہ ندوی) میں امام مسلمؒ حضرت عبداللہ بن مبارک' حضرت امام محمد امام شافعیؒ علامہ ان جوزیؒ وغیرہ علمائے عظام اور بزرگان دین کی علمی' فکری او رعملی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح مضمون ''اسلامی عہد میں . . . مخطوطات کی اہمیت'' (مولانا عباس ندوی) میں قرآن واحادیث کو کتابی صورت میں محفوظ کرنے' مسلم دور اقتدار میں مخطوطات کی حفاظت او راشاعت اور فنِ تحقیق کی ایجاد اور کتب خانوں کا قیام وغیرہ پر تحقیقی انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ ادیب ادب تخلیق کرتا ہے اور ادیب سماج کا ہی ایک فرد ہوتا ہے۔ اس لیے ادب اور زندگی کا تعلق لازم وملزوم ہوتا ہے اور مطالعہ کو جاننے کی کلید کہا جاتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو کتاب کے کئی مضامین میں ادب' ادیب اور زندگی پر فیض بخش بحث ہوئی ہے جن میں دو اقتباسات کا حوالہ مفید رہے گا:

''بلاشبہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور اس میں ہم زندگی کو اپنی تمام تر وسعت وتبدیلیوں کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ ادب کا مقصد ہی زندگی کے اصل خدوخال کو واضح کرنا اس کی تمام تر کیفیتوں کو اجاگر کرنا اور اسے بہتر راستے کا نشان دکھانا ہے..... جو قومیں اپنے ادب سے رشتہ استوار نہیں رکھتیں' اپنی قدروں اور روایات کی عظمت کو یاد نہیں رکھتیں اور اپنے ادیبوں' شاعروں اور اہل علم کی تخلیقات (تحریرات) سے اپنی ذہنی

فکری صلاحیتوں کی نمو نہیں کرتیں، وہ نہ صرف پستی و جہالت کے اندھیروں میں گم ہو جاتی ہیں بلکہ معاشرتی وفکری زوال سے بھی محفوظ نہیں رہتیں‘‘۔

(معراج حبیب۔ زندگی میں ادب اور ادیب کی ضرورت۔ص ۶۴)

’’علم تمہیں اپنا حصہ بھی نہیں دے سکتا جب تک کہ پورے طور پر اپنے آپ کو اس کے حوالے نہ کرو، جس شخص کا محبوب مشغلہ کتب بینی ہو وہ یقیناً ایک مقام حاصل کر سکتا ہے‘‘۔

(حافظ خورشید عالم۔ مطالعہ، علم وتحقیق کی کنجی۔ص ۸۰)

کتاب کے آخر پر مرزا بشیر احمد شاکر (مرتب کتاب) کی ایک طویل نظم بعنوان ’’کتابیں ہم نشیں میری‘‘ ہے جس میں انہوں نے دلچسپ انداز میں کتاب کی اہمیت ومحبت، مطالعہ کی چاشنی اور افادیت، تفاسیر کا بیان، احادیث کا بیان، سیرت مبارکہ اور ادبیات وغیرہ موضوعات وخیالات کو شعری پیرائیہ میں پیش کیا ہے، جس کا مطالعہ نہ صرف شاکر صاحب کے ذوقِ مطالعہ اور شوقِ ادب کی عکاسی کر رہا ہے بلکہ نظم میں کتب بینی اور کتاب دوستی کے جن احساسات وجذبات کو سمویا گیا ہے پیش نظر کتاب اس کا عملی ثبوت بھی پیش کر رہی ہے۔ مجموعی طور پر شامل کتاب سبھی مضامین کتب بینی اور علم وادب کی اہمیت وافادیت کو دل نشیں اسلوب میں اجاگر کرتے نظر آرہے ہیں جو کہ نہ صرف عصر حال کے زیر تعلیم اور تعلیم یافتہ افراد کے ذوقِ مطالعہ کو انگیز کرنے کے لیے بڑے کارآمد ثابت ہوں گے، بلکہ صاحب کتاب کے حسن انتخاب کا فرحت بخش ثبوت بھی پیش کر رہے ہیں کیونکہ انہوں نے بڑے سلیقے سے نفس موضوع کے مطابق مناسب مضامین کا انتخاب کیا ہے اور ماخذات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ کتاب کا سرورق بھی جاذب نظر ہے اور بائنڈنگ، کمپوزنگ اور کاغذ بھی معیاری ہے۔

گلرنگ کی رنگارنگی

مبصر: ایس معشوق احمد

گلرنگ مرزا بشیر شاکر کی رنگارنگ مضامین، تبصروں اور تاثرات پر مشتمل تصنیف ہے۔ یہ کتاب 2022ء میں شائع ہوئی ہے۔ 338 صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں چوبیس مضامین ہیں۔ کتاب میں شامل پہلا مضمون پروفیسر اکبر حیدری مرد قرطاس وقلم ہے۔ مرزا بشیر شاکر نے جب پروفیسر اکبر حیدری کے انتقال کی خبر ریڈیو کے ذریعے سنی تو ان کا قلم متحرک ہوا اور جس کیفیت اور صدمے سے وہ گزرے نہ صرف ان جذبات کو رقم کیا بلکہ مرحوم سے تعلق کی شروعات کب اور کیسے ہوئی کا حال احوال بھی مضمون میں رقم کیا ہے۔ مصنف نے ان کی کتابوں اقبال نادر معلومات اور اقبالیات کے نئے گوشے کو شائقین اقبال کے لئے گنج ہائے گرانمایہ گردانا ہے اور ساتھ ہی ان کی ادارت میں نکلنے والے رسالے حکیم الامت کا ذکر بھی کیا ہے۔ مرزا شاکر نے اکبر حیدری کے گراں قدر تحقیقی خدمات کو سراہا ہے اور ان کی تحقیقی روش کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ۔۔۔۔وہ بالکل ایک جوہری کی مانند گمشدہ لعل وجواہرات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے تھے اور گرد وغبار جھاڑ کر ان کو جوہر فروش کی طرح زیب وزینت عطا کرتے تھے۔ یہ میر تقی میر خدائے سخن کی بات ہو یا انیس ودبیر مرثیہ گویان کربلا کی۔ حیدری صاحب نے ان کے تئیں تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہے۔ غالبیات کے سلسلے میں بھی وہ ید طولی رکھتے تھے۔ اس پر ان کا تحقیقی کام قابل ستائش ہے۔‘‘

دوسرا مضمون: کے پی شمس الدین ترورکاڈ کے عنوان سے شامل کتاب کیا گیا ہے۔ 2011ء مئی کے شمارے میں ماہنامہ حکیم الامت میں ملیالم میں اقبالیات کے عنوان سے شمس الدین ترورکاڈ کا مضمون شامل تھا جس کو اکبر حیدری نے سراہا تھا۔ اس

مضمون سے متاثر ہوکر مرزا بشیر شاکر نے کیرلا سے تعلق رکھنے والے کے پی شمس الدین کا تعارف، ان کے مضامین اور ملیالم میں اقبالیات کا جائزہ مضمون میں پیش کیا ہے۔ مرزا بشیر شاکر نے کتب خانہ اکبر حیدری میں اکبر حیدری کے کتب خانے کی سیر بھی کرائی ہے اور اقبال کے فرزند جسٹس جاوید اقبال سے ایک یادگار ملاقات کی تفصیل بھی رقم کی ہے۔ نہرو پارک سری نگر میں واقع کتب خانہ کے عنوان سے گلرنگ میں جو مضمون شامل ہے اس میں مرزا بشیر شاکر نے نعیمہ احمد مہجور کی انگریزی تصنیف lost in terror کی رسم رونمائی کی تفصیل بھی رقم کی ہے اور مئی 2016ء میں جھیل ڈل کے کنارے قائم کئے گئے کتب خانے گلشن بکز جس میں مختلف النوع تیس ہزار کتابیں موجود ہیں کا تعارف پیش کیا ہے۔ کتاب میں شامل جسٹس جاوید اقبال کی شخصیت نامی مضمون ان کی وفات کی جاں کاہ خبر کے بعد رقم کیا گیا ہے۔ اس میں مرزا شاکر نے جاوید اقبال کی والدہ، ان کے بچپن، ان کا بطور ہائے کورٹ جج حلف اٹھانے کی روداد اور ان کی کتابیں زندہ رود، مئے لالہ فام، سوانح عمری اپنا گریبان چاک کا تذکرہ کیا ہے۔ جاوید اقبال چیف جسٹس کے بڑے عہدہ پر فائز تھے لیکن ان کی وفات کے موقع پر لوگوں کی زبان پر بقول مصنف یہ الفاظ تھے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کی وفات پر لوگوں کے کانوں سے یہی آواز ٹکرائی کہ ڈاکٹر علامہ اقبال کے بیٹے انتقال کر گئے اور سبھی سننے والوں کی توجہ خود بخود علامہ اقبال کی طرف مبذول ہوگئی اس لئے اپنی الگ پہچان کے باوجود جاوید صاحب کے لئے یہ سعادت مندی ہے، نیک شگون ہے۔"

مرزا بشیر شاکر محکمہ ڈاک میں ملازم رہ چکے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ اس محکمے کی تمام خوبیوں اور خامیوں کا انہیں علم ہوگا۔ اپنے تجربے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے صوبہ کشمیر میں ڈاک کی ناقص تقسیم کاری کے عنوان سے مضمون رقم کیا جس میں انہوں نے ڈاک کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے اور انٹرنیٹ کے آنے میں اس کی اہمیت میں جو کمی واقع ہوئی ہے اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس مضمون میں ڈاک خانے کے ملازمین پر یہ الزام بھی آیا کہ وہ دیر سے آتے ہیں اور انہیں گھر جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ مرزا بشیر شاکر اس مضمون میں یہ شکوہ بھی کرتے ہیں کہ انہیں ڈاک کے ذریعے سے جو رسائل بھیجے گئے وہ کبھی ان کے گھر نہ پہنچ پائے۔

علامہ اقبال سے جو شئے منسوب ہوئی اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور عاشقان اقبال نے جزیات سمیت اس کا ذکر اپنے مضامین میں کیا۔ علامہ کے خادم علی بخش نے علامہ کی بہت خدمت کی یہی سبب ہے کہ ان کا تذکرہ احترام سے کیا جاتا ہے۔ مرزا بشیر شاکر نے بھی اپنے مضمون علی بخش خادم اقبال میں ان کے کام، خدمت گزاری اور ان کی شخصیت کو مختلف واقعات سے اجاگر کیا ہے۔ مرزا بشیر شاکر علی بخش کو خوش نصیب گردانتے ہیں کہ وہ علامہ جیسی عقبری شخصیت کے شب و روز سے واقف رہے۔ آل اقبال کے ساتھ گزاری جانے والی ساعتیں ہوں یا سہ روزہ کانفرنس کے سلسلے میں پونچھ کا دورہ، حجاج کرام کے نوازش نامے ہوں یا ملک وقوم کے رہبروں سے سوال کرنے کی جرات، حکیم الامت کا تقی عابدی نمبر ہو یا اسپتال میں جو عبرت ناک واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں ان کی روداد، صوفی غلام محمد سے جڑی یادوں کا تذکرہ ہو یا غلام نبی فراق سے مراسم کا ذکر غرض کتاب کے پہلے حصے میں مرزا بشیر شاکر نے ادبی، نیم ادبی اور تعزیتی مضامین رقم کئے ہیں جو معلوماتی بھی ہیں اور جذباتی بھی۔

کتاب کا دوسرا حصہ اٹھارہ تبصروں اور تاثرات پر مشتمل ہے۔ اکبر حیدری کی کتابیں اقبال نادر معلومات اور اقبال احباب و آثار ہو یا سلطان الحق شہیدی کا مسدس حالی کا منظوم ترجمہ، مرزا خلیل احمد بیگ کی مرتب کردہ کتاب مکاتیب مسعود ہو یا حکیم الامت کا نعت نمبر مرزا بشیر شاکر نے ان کتابوں اور رسائل کا

وقتاً فوقتاً مطالعہ کیا ہے اور ان کا جائزہ لے کر ان کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ کتابیں ہم نشین میری پر ڈاکٹر ریاض توحیدی کا تبصرہ اور اقبال کے دیس میں پر سہیل سالم کا جائزہ بھی شامل کتاب ہے اور آخر پر مرزا بشیر شاکر کے متعلق ایم ایس رحمان شمس اور اکبر حیدری کے تاثرات بھی شامل ہیں۔

گلرنگ کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ مرزا بشیر شاکر علامہ اقبال اور اکبر حیدری سے بے حد متاثر ہیں۔ان کا آل اقبال کے ساتھ جو ملاقاتوں کا سلسلہ رہا اس نے ان کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑا ہے یہی سبب ہے کہ وہ بار بار کتاب میں ان ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً چار مضامین علامہ اقبال کے فرزند کے متعلق رقم کئے ہیں۔ان مضامین میں بعض باتیں دہرائی گئی ہیں اور ان سے ملاقات کی تفصیل بار بار آئی ہے۔اکبر حیدری کے متعلق بھی دو تین مضامین کتاب میں شامل ہیں اور ان کی کتابوں کے متعلق تبصرے بھی شامل کتاب ہیں۔ بار بار ان دو شخصیتوں کے بارے میں پڑھ کر قاری بور ہوجاتا ہے۔ان مضامین سے قطع نظر گلرنگ میں رنگا رنگ مضامین شامل ہیں جن میں معلومات، تجربات اور مشاہدات کا خزانہ جمع کیا گیا ہے جو تشنگان علم کی پیاس بجھانے کے لئے آب حیات کا کام دیں گے۔

گلرنگ

مبصر: سبزار احمد بٹ

مرزا بشیر احمد شاکر 8 مئی 1950 کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کا نام مرزا غلام محی الدین بیگ ہے کشمیر کے جتنے شعرا، ادبا، اور قلمکاروں نے اردو اور کشمیری زبان و ادب کی خدمت کی ہے اور ان زبانوں کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے یا جتنے بھی اقبال شناس ہیں ان میں مرزا بشیر احمد شاکر کا نام سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

بشیر صاحب سے میرا تعارف سوشل میڈیا کے ذریعے ہوا۔ایک دن میں نے ایک پوسٹ دیکھی جس میں چند کتابوں کا کور پیج اپلوڈ کیا گیا تھا۔ان کتابوں کے نام پڑھتے ہی بشیر صاحب سے ملاقات کا تجسس بڑھ گیا۔ میں نے کسی طرح سے ان کا نمبر معلوم کیا اور ان سے بات کی۔ انہوں نے جس محبت اور خلوص سے بات کی اس سے ملاقات کا تجسس اور بھی بڑھ گیا۔ایک دن میں اپنے ایک دوست کو لے کر ان کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات ہوئی۔لیکن ایسا لگا کہ جیسے سب کچھ ادھورا ادھورا رہ گیا۔اس پوری ملاقات کے دوران ان کے فرزند جس طرح سے اپنے والد صاحب کی محبت میں ان کے ایک ایک حکم کو تعمیل کرتے تھے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ میں جب ان کے کتب خانے میں داخل ہوا تو وہاں پر ان کی علم دوستی کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔ میں کتابوں کے اس ضخیم خزانے کی طرف دیکھ ہی رہ تھا کہ ایک تختی پر نظر پڑھی جس میں صاف صاف یہ درج تھا کہ "کتابیں ادھار مانگ کر شرمندہ نہ کریں" یہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر ایک من موہن سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ خیر نکلتے وقت مرزا بشیر شاکر نے مجھے اپنی چند کتابیں تحفاتا پیش کیں اور مجھے کتاب مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑھی۔ان ہی کتابوں میں ان کی ایک کتاب گلرنگ بھی ہے زیر تبصرہ کتاب گلرنگ علمی ادبی مضامین اور تبصروں پر مشتمل ہے۔ کتاب میں پروفیسر اکبر حیدری، کے پی شمس الدین جسٹس جاوید اقبال ، پروفیسر غلام نبی فراق، مرحوم نور محمد جیسی عظیم علمی ادبی شخصیات پر مدلل اور مفصل مضامین لکھے گئے ہیں۔ ان شخصیات میں چند ایک کے مرزا بشیر احمد شاکر کے ساتھ مراسم بھی رہے ہیں ان کا بھی خوب ذکر آیا ہے۔ کتاب میں شامل ایک مضمون کتاب خانہ اکبر حیدری الکشمیر ی پڑھ کر مرزا بشیر احمد کی علم دوستی اور کتاب دوستی کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں ان تمام کتب خانوں کا حوالہ دیا ہے اور چند ایک کتب خانوں کے

بارے میں تفصیل سے بھی لکھا ہے جن میں مصنف کو جانا نصیب ہوا ہے یا جن کتب خانوں سے مصنف نے استفادہ کیا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ مصنف نے کتابوں کو ہی اپنا اوڑھا بچھونا بنایا ہے۔ سیکنڈوں کتب خانوں کی خاک چھانی ہے۔ مزکورہ کتاب میں جسٹس جاوید اقبال سے ایک یادگار ملاقات" نام کا بھی ایک شاندار مضمون شامل ہے۔ جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ مرزا بشیر احمد شاکر صاحب ایک قابل قدر اقبال شناس ہیں موصوف کو تین بار پاکستان جانے کا شرف حاصل ہوا ہے یاد رہے کہ یہ اسفار محض علمی اور ادبی اسفار تھے۔ پاکستان جا کر موصوف نے نہ صرف علامہ اقبال کے مقبرے کی زیارت کی ہے بلکہ علامہ کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال اور صاحبزادی منیرہ بیگم سے بھی ملاقات کی۔ مصنف نے اس ملاقات کی پوری تفصیل اس مضمون میں پیش کی ہے کہ کس محبت سے مصنب جسٹس جاوید اقبال کے بغلگیر ہوئے ہیں۔ اور کتنی محنت اور مشقت سے موصوف نے کیمرہ حاصل کر کے جسٹس اقبال اور منیرہ جی کے ساتھ تصویریں لی ہیں۔ جسٹس اقبال کی شخصیت سے متاثر ہو کر مرزا بشیر شاکر نے جاوید اقبال کی شخصیت پر بھی ایک شاندار مضمون لکھا ہے۔ علامہ اقبال سے موصوف کی اس قدر عقیدت ہے کہ انہوں نے علامہ اقبال کے خادم علی بخش پر بھی ایک شاندار مضمون تحریر کیا ہے۔ یاد رہے کہ علی بخش خود لکھتے کہتے ہیں کہ میں نے چالیس سال تک علامہ اقبال کی خدمت کی ہے۔ اور علی بخش نے علامہ اقبال کے ساتھ پیش آئے روحانی حالات و واقعات کا ذکر بھی کیا ہے۔ علی بخش آخری ایام میں بھی علامہ اقبال کے ساتھ رہے اور جب علامہ نے رحلت فرمائی اس وقت علی بخش علامہ کے پاؤں سے لپٹ کر روئے تھے یہ سب اس انداز میں لکھا گیا ہے کہ آلِ اقبال کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے جیسے قاری بھی مصنف کے ساتھ رہا ہو۔ یاد رہے کہ مرزا بشیر احمد نے چالیس سال

تک محکمہ ڈاک میں کام کیا ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس محکمہ کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے محکمہ کی خامی کے بارے میں انسان قلم نہیں اٹھاتا ہے جبکہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ موصوف نے بڑی بے باکی سے محکمہ ڈاک کے خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ مصنف نے اپنی اس کتاب میں فانی کشمیری کی کتاب "حباب" کا بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اور ماہنامہ "حکیم الامت" کا بھی تبصرہ کیا ہے یاد رہے کہ یہ پروفیسر اکبر حیدری کی ادارت میں شائع ہونے والا ایک معتبر رسالہ ہے۔ پروفیسر اکبر حیدری کی وفات کے بعد یہ رسالہ ان کے فرزند جناب ظفر حیدری کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ کتاب کے اس دوسرے حصے میں مصنف نے اقبال نادر معلومات، معرکہ اسرار خودی، اقبالیات اور زمانہ کانپور، کتابیں ہمنشیں میری، اور علامہ اقبال کے دیس میں جیسے شاندار علمی اور معلومات سے بھرپور مضامین بھی لکھے ہیں۔ منجملہ طور ہر دیکھا جائے تو یہ کتاب اردو ادب میں ایک قابل قدر اور قابل سرہانہ کتاب ہے۔ کتاب میں اگر چہ مختلف شخصیات اور ان کے علمی ادبی کارناموں کے بارے میں لکھا گیا ہے اور کتاب مرزا بشیر احمد شاکر کی کتب بینی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کتاب کا پیشتر حصہ اقبالیات پر منحصر ہے۔ کتاب میں شامل مضمون درجواب غلام رسول بانڈے" میں چند علمی نقطوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ علامہ کے بارے میں پیدا ہونے والی چند غلط فہمیوں کا جواب دلائل کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اور علامہ نے جو اشعار حضرت سید حسین مدنی کے بارے میں زیب قرطاس کئے ان کی وجہ محض ایک غلط فہمی بتائی گئی اور بعد میں علامہ کی اس وضاحت کا بھی حوالہ دیا گیا جو روزنامہ احسان لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ اس طرح سے غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس مضمون کے جواب میں غلام رسول بانڈے نے جو مضمون شاکر صاحب کے نام لکھا وہ

بھی شامل کتاب ہے۔ جس میں بانڈے صاحب نے برہمی کا اظہار کیا ہے اور بشیر احمد شاکر سے متفق ہوتے ہوئے نظر نہیں آرہے ہیں۔ خیر اس طرح سے یہ بحث آگ بڑھنے کے امکانات اور بھی روشن ہوجاتے ہیں۔ اور کچھ نئے فکری زاویے ابھر کر سامنے آنے کے امکانات اور بھی روشن ہوجاتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مرزا بشیر شاکر صاحب کی اقبالؒ شناسی اور اقبالؒ سے ان کی عقیدت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مرزا بشیر احمد شاکر کے وسعت قلم کا اندازہ اس کتاب کا انتساب دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے انہوں نے اپنی اس کتاب کا انتساب ان غیر مسلم قلمکاروں کے نام کیا ہے جنہوں نے لسانی تعصب سے بالاتر ہوکر اردو زبان وادب کے گیسو سنوانے میں ایک کلیدی رول ادا کیا" مزکورہ کتاب کا پیش لفظ پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی نے لکھا ہے جبکہ پروفیسر اکبر حیدری اور ایس ایم رحمان شمس جیسی شخصیات نے اس کتاب پر اپنے تاثرات پیش کئے ہیں ان تاثرات سے کتاب کی اہمیت اور بھی مسلم ہوتی ہی۔

علامہ اقبالؒ کے دیس میں

مبصر: سہیل سالم

سفر انسان کی ایک ناگزیر حقیقت ہے جسے مسافت طے کرنے، ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرنے اور نقل مکانی وغیرہ کے معنی میں مراد لیا جاتا ہے۔ سفر کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں ؎

ہر مقام سے آگے ہیں مقام تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

انسان ضروریات زندگی کی حصولیابی کے لیے متعدد مقامات کا سفر کرتا، مختلف واقعات وحادثات سے دوچار ہوتا ہے اور دوران سفر پیش آئے تجربات ومشاہدات سے بھی دوسروں کو واقف کرنے کی فطری خواہش رکھتا ہے۔ جب وہ اپنی اس خواہش کو قلم کے ذریعے عملی جامہ پہناتا ہے تو سفرنامے کا فن وجود میں آتا ہے۔ سفرنامہ غیر افسانوی ادب کی وہ صنف ہے جس میں مسافر دوران سفر پیش آنے والے واقعات کو ادبی لب ولہجہ میں بیان کرتا ہے۔

زیر تبصرہ "علامہ اقبالؒ کے دیس میں" مرزا بشیر احمد شاکر کا سفرنامہ ہے جو انہوں نے ارض پاک کے مختلف شہروں خاص کر راولپنڈی، پشاور، لاہور اور مظفر آباد کا سفر کرکے خوب صورت روداد رقم کی ہے۔ سفرنامہ "اقبالؒ کے دیس میں" آٹھ عنوانات پر مشتمل ہیں۔ جن میں تقریظ از پروفیسر بشیر احمد نحوی پیش لفظ از پروفیسر غلام رسول ملک، حرفے چند از ڈاکٹر الطاف انجم، پیش گفتار از مرزا بشیر احمد شاکر سفرنامہ اول۔ علامہ اقبالؒ کے دیس میں، سفرنامہ دوم۔ لیلائے تمنا کی آغوش میں اور سفرنامہ سوم۔ ہمیں بھی یاد کرلینا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سفرنامہ اول (اقبالؒ کے دیس میں):

مرزا بشیر احمد شاکر اپنی زندگی میں پہلی بار اپریل ۲۰۱۲ کو پُرکشش احساسات وجذبات کے سمندر میں غرق ہوتے ہوئے دہلی سے بذریعے بس واگہہ سرحد سے ارض پاک پہنچ گئے۔ سفرنامہ میں لاہور کے مختلف شہروں، خوب صورت علاقوں، حسین سرسبز وادیوں، جھیل، دریا، چشمہ واونچی پہاڑیوں کے جنت نظیر منظر، لاہور کا شور وغل، لاہور کے حاکم، لاہور کا نظم وضبط، داتا گنج بخش حضرت سید علی ہجویریؒ کے روضہ شریف کی شان وشوکت اور خواب گاہ اقبال کی کشش کے حالات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان مقامات کے خوب صورت وسحر انگیز مناظر مرزا بشیر شاکر کو تازگی وتوانائی عطا کرتے ہیں، انہیں فطری مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ان سب میں خواب گاہ اقبالؒ کی زیارت ان کے لیے سب سے زیادہ پُرکشش تھی۔

خواب گاہ اقبالؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حکیم الامت علامہ اقبال کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کو پیامبر خودی، شاعر مشرق، دانائے راز، مردقلندر، فلسفی شاعر اور حکیم الامت وغیرہ کے خطابات اور القابات سے نوازا

گیا ہے۔ راقم کی مدت سے یہ خواہش تھی کہ اس فنا فی القرآن اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار مفکر اسلام کے مرقد کی زیارت کروں۔ اللہ کے فضل و کرم سے میری یہ تمنا پوری ہوگئی اور مسجد کے سائے میں تھوڑے سے فاصلے پر سیڑھیاں چڑھتے ہی جنوب مشرقی جانب اس مرد خود آگاہ کا مسکن ابدی نظر نواز ہوا۔ مقبرے کی چھوٹی سی عمارت سنگ احمر سے تعمیر کی گئی ہے۔ اس کے اندر اس عظیم شاعر و مفکر اور ترجمان اسلام کا مرقد مبارک ہے جس پر سنگ مرمر کی لوح لگی ہے جس پر یہ عبارت کندہ ہے۔

ان من الشعر الحکمۃ و ان من البیان البحرا

مقبرہ اقبال کے فرش پر سنگ مرمر کی خوبصورت تختیاں تزئین کاری کا عمدہ نمونہ ہیں اور دیواروں کے چاروں اطراف میں علامہ اقبال کے دل نشین اشعار کندہ کرائے گئے ہیں۔

یہ عشق اقبال کا پُرکشش جذبہ ہی ہے جو مجھے کھینچ کے اس زیارت گاہ پر لے آیا۔ میں نے خلوص بھرے دل اور پورے جذبات کے ساتھ یہاں حاضر ہو کر قرآن کی جستہ جستہ تلاوت کی، درود شریف کا ورد کیا۔ سورہ فاتحہ اور دیگر اذکار مسنونہ کا ثواب محو خواب مرد قلندر کی روح کو بخشش دیا۔ مجھ نادار مسافر کے پاس اس کے علاوہ اور تھا ہی کیا جو ان کی نذر کرتا''۔

سفر نامہ اول میں اور بھی ایسے اقتباسات ہیں جو ماحول و مناظر کی خوبصورتی و دلکشی کو اجاگر کرتے ہی ہیں ساتھ ہی مرزا بشیر احمد شاکر کی کامیاب منظر نگاری، تشبیہات و استعارات کے عمدہ استعمال، حسن لاہور کے تئیں ان کی محبت بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مرزا بشیر احمد شاکر پاکستان کو ہمیشہ عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کے محبت میں گم ہو کر جذبات کا اظہار کر کے ایک سچا مسلمان ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ دوران سفر انہوں نے کبھی بھی منفی نظریے سے نہیں دیکھا بلکہ ہمیشہ مثبت پہلوؤں کا محبت بھری نظروں سے جائزہ لیا ہے جو اس سفر نامہ اول کا خاص وصف ہے۔

سفرنامہ دوم:

مرزا بشیر احمد شاکر کا خواب جب پہلے سفر پاکستان کے دوران پورا نہیں ہوا تو اپنے اس خواب کو رنگ بھرنے کے لیے پھر مارچ ۲۰۱۴ء میں دوسری بار سرزمین پاکستان کا سفر کیا جو کہ ''لیلائے تمنا کی آغوش میں'' کے عنوان کے تحت شامل کتاب ہے۔ لاہور کے حالات، یہاں کی زبان و ثقافت، یہاں کے مختلف مقدس مقامات، اما زادوں کے مقامات کی زیارت، مرقد اقبال کی زیارت، مقبرہ ابوالاثر حفیظ جالندھری، مینار پاکستان، یہاں کے پوسٹ آفس، علامہ اقبال کے فرزند سے ملاقات، منصورہ اور جامعہ اشرفیہ لاہور سے متعلق مرزا بشیر احمد شاکر کے دل کش خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ سید علی ہجویری داتا گنج بخشؒ کے دربار عالیہ میں حاضری دیگر امت مسلمہ کی طرح مرزا بشیر احمد شاکر کی بھی دیرینہ و اولین خواہش تھی اور اس کی تکمیل ان کی زندگی کا اہم ترین لمحہ مسرت تھا۔ انہوں نے دربار عالیہ کے روح پرور مناظر کو عقیدت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لہجے میں جذبات کا سمندر موجزن ہے۔ مقامات مقدس کا دیدار ان کے قلب و جان پر رقت طاری کر دیتا ہے۔ سید علی ہجویری داتا گنج بخشؒ کے دربار عالیہ میں حاضری کے بعد دلی کیفیت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت سید علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ کا آستانہ مرجع خاص و عام ہے۔ یہاں چوبیس گھنٹے زائرین نظر آتے ہیں۔ ان کی تربت شریف سنگ مرمر کے پتھروں سے مرکز توجہ بن گئی ہے۔ جہاں ہر وقت پھولوں کی ٹوکریاں نچھاور کردی جاتی ہے۔ --- ہاں بھی زائرین عقیدت و احترام سے کھڑا رہتے ہیں۔ مجھے یہ مدحیہ فارسی شعر یہاں اس دربار عالیشان میں ورد زبان تھا''۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

سفر نامہ سوم:

زیر تبصرہ سفر نامے کے تیسرے سفر کا عنوان ''ہمیں بھی یاد کر لینا'' ہے۔ اس سفر نامہ میں مرزا بشیر احمد شاکر نے فروری ۲۰۱۶ء میں ایبٹ آباد اور مظفر آباد کے مختلف شہروں کا سفر کر کے اپنے تجربات اور مشاہدات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے ایبٹ آباد اور مظفر آباد میں بھی چند روز قیام کیا اور گزرے ہوئے شب و روز کی تفصیلات کو سفر نامہ میں بیان کیا ہے۔ پاکستان کے احوال اور عزیز و اقارب سے ملاقات و گفتگو کو انہوں نے جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔: ''چند ثانیوں کے بعد ہی محترمہ منیرہ اپنی نرس و خادمہ کے ساتھ کمرے میں تشریف آور ہو گئیں۔ میں احتراماً کھڑا ہو گیا اور سلام کر کے میں نے ان کے ماتھے کو فرط مسرت سے بوسہ دیا۔ ایک نہیں دو بار۔ محترمہ بیٹھ گئیں ... عظیم شاعر کی عظیم بیٹی محترمہ نے اپنی بیماری کا کچھ تذکرہ کیا۔ قرآن کی تلاوت کرنے کی بات بتائی''۔

الغرض قاری جیسے جیسے کتاب کے صفحات پلٹتا ہے اسے مختلف چیزوں سے روشناس کرتا ہوا سفر نامہ نگار آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ارض پاک کی تاریخی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اور قائد اعظم کے کارنامہ کو بھی مختصر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وہیں سفر میں درپیش مسائل اور اہل علم سے استفادہ کی بھی روداد کو بڑی بے باکی سے قلم بند کیا گیا ہے۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے نیز سرورق جاذب نظر اور دلکش بھی ہے۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر مرزا بشیر احمد شاکر کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں وہ آئندہ بھی اسی طرح کام کی چیز قارئین کے روبرو پیش کرتے رہیں گے۔

'گلرنگ'

مبصر: ڈاکٹر رخسانہ رحیم

ادب کا ذوق رکھنے والے مرزا بشیر احمد شاکر صاحب اردو شعر و ادب میں ابھرنے والے مشاہیر ہیں۔ ان کا یہ علمی، ادبی جریدہ 'گلرنگ' مناظرے، مشاہدے، مضامین اور تبصرے پر مشتمل ہیں۔ انسانی جذبات و احساسات کو لفظوں کے پیکر میں ڈھال کر سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ بڑے سے بڑے خیال کو سمو دینے کی تخلیقی مہارت کا یہ اعلیٰ نمونہ ہے۔

ان مضامین میں اظہار کی پختگی، عہد کی عالمی آگہی، غیر معمولی شدتِ احساس، فکر و ادب، عمیق عصری حسیات و مشاہدات کے تناظر میں ایک مخصوص زاویہ نظر سے جانچ پرکھ کر بے ملاوٹ، منصفانہ، مخلصانہ اور صحت مندانہ نقد و نظر کا نمونہ پیش کرنے میں انفرادی اہمیت کا حامل ہے۔ ان مضامین میں گہرے شعور اور ملی احساس، اصلاح پسند اور ادبی روایات کی خلاقانہ ہم آہنگی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

شاکر صاحب بحیثیت شاعر ان کی اہمیت مسلمہ ہے۔ ان کی شاعری میں واردات، حسن و عشق اور فطرت سے وابستگی کے ساتھ ساتھ عصری کرب، اقدار کی شکست و ریخت کا احساس، مادی معیاروں کی بالادستی، وقت کی تیز رفتاری اور حالات کی سفاکی کے ساتھ لاشعور کی تاریکیوں کا احساس بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ سب شاکر صاحب کی ہشت پہلو شخصیت کی مکمل شناخت نہیں کہی جا سکتی۔ بلکہ ان کی اصل شناخت ان کا منفرد علمی و تحقیقی شعور ہے، جو ان کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی کتابوں میں کھل کر اردو کے علمی و ادبی افق پر ابھرا ہے۔ ان میں سب سے وقیع اور مہتم بالشان اقبال کی تتبع اور ان کے رنگ سخن کو اپنے فکر و فن میں جذب کرنے کا رجحان ہے۔ فکری طور شاکر صاحب اقبال کے مرید نظر آتے ہیں۔ اقبال کی تخلیقی جہتوں کی تفہیم اور عام ذہنوں تک فکر اقبال کی ترسیل کیلئے شاکر صاحب کی تحریریں بھی خاصی اہم اور افادیت کی حامل ہیں۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کے ملی، قومی اور آفاقی نظریات ان کے ذہن پر خاص طور پر مرتسم ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کتاب میں بہت سے ایسے مضامین ہیں جو اقبال کے حوالے سے رقم کئے گئے ہیں، جس میں موصوف کی اقبال اور خانوادہ اقبال سے کس قدر لگاؤ، عقیدت، محبت اور شفقت نظر آتی ہیں۔ اس کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں۔

ایک مضمون کی تلخیص:......'اقبال کے دیس میں'

''حکیم الامت علامہ اقبال کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کو پیامبرِ خودی، شاعرِ مشرق، دانائے راز سے نوازا گیا ہے۔ مردِ قلندر، فلسفی، شاعر اور حکیم الامت وغیرہ کے خطابات اور القابات سے نوازا گیا ہے۔

راقم کی مدت سے یہ خواہش تھی کہ اس فنافی القرآن اور محبت رسولؐ سے سرشار مفکر اسلام کے مرقد کی زیارت کروں۔ اللہ کے فضل سے میری یہ تمنا پوری ہوگئی...... یہ محبت اقبال کا پرکشش جذبہ ہی ہے جو مجھے کھینچ کر اس زیارت گاہ پر لے آیا۔ میں نے خلوص بھرے دل اور پورے جذبات کے ساتھ یہاں حاضر ہو کر قرآن کی جستہ جستہ تلاوت کی، درود شریف کا ورد کیا، سورۃ الفاتحہ اور دیگر اذکارِ مسنونہ کا ثواب محوِ خواب، مردِ قلندر کی روح کو بخش دیا۔ مجھ نادار مسافر کے پاس اس کے علاوہ اور تھا ہی کیا جو انکی نذر کرتا۔

ان مضامین میں شاکر صاحب کا احساس، مشاہدہ کی حیرت خیزی اور فنکارانہ مرقع آرائی کا آئینہ ہے۔ جذبات، حقیقت نگاری اور فنی جدت طرازی کی ہمہ رنگ تصویریں ہیں۔ انسانی زندگی جن ذہنی، تہذیبی، داخلی اور خارجی عوامل سے عبارت ہے وہ ساری کیفیتیں شاکر صاحب کے مضامین میں متحرک اور متکلم دکھائی اور سنائی دیتی ہیں۔

اسلامی تعلیمات اور مسلم تہذیب و ثقافت سے شاکر صاحب کس درجہ متاثر ہیں اس کا اندازہ ان کی گفتگو اور روزمرہ کی زندگی سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ دین کی تمام قدروں سے آگاہ ہیں، انہوں نے ادب کو تعمیر معاشرہ اور مثبت سماجی اقدار کے فروغ کا وسیلہ تصور کیا۔ زمان و مکان کی بے لباس صداقتیں ان کی نظموں، رباعیوں میں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اپنے اجتہادی اور اختراعی ادبی سفر میں فکر و فن کی سنگلاخ وادیوں سے گزرتے ہوئے اپنے لئے نئے راستے تلاش کئے اور اردو کے دامن کو تخلیق کے نوتراشیدہ اور نادر روزگار لعل و گوہر سے مالامال کرنے کی کوشش کی وقت کی خزاں رسیدگی کے باوجود دیوانگان اردو کی خون پاشیوں سے علم و ادب اور شعر و سخن کے چمنستان کو لہلہاتے رہے۔

الغرض زیر تبصرہ 'گلرنگ' نام کی کتاب جہاں اردو زبان و ادب کے گرانقدر خزانے میں ایک قابل قدر اضافہ ہے وہاں اقبال اور اقبالیاتی ادب سے شغف رکھنے والوں کیلئے بھی یہ بہت ہی سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔ کتابی مطالعہ سے تعلق رکھنے والوں کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے، اور گلشن اردو ادب کے ان علمی پھولوں کی مہک سے دل و دماغ کو معطر و مسرور رکھنا چاہئے۔

علامہ اقبال کے دیس میں

مبصر: امتیاز احمد
(اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج فرصل، کشمیر)

مرزا بشیر احمد شاکر نے ان دنوں مجھ سے اپنی کتاب پر خامہ پرسائی کی فرمائش کی جن دنوں میں ان دونوں نسبتوں سے کسی نہ کسی طور پر منسلک تھا۔ ایک طویل آرزو و انتظار کے بعد مجھے مرشدِ من اقبال کے فارسی گوہر پاروں تک براہِ راست رسائی کی توفیق ملی اور گھر میں سمٹے رہنے کی وجہ سے باہر کی دنیا کی سیر کتابوں کی وساطت سے ہی کرتا تھا جن میں سفر ناموں کو بطورِ خاص زیرِ مطالعہ رکھا۔ مرزا صاحب سے تعارف و ملاقات کی بھی ایک الگ داستان ہے۔ وہ بھی سفر ہی میں ہوئی اس کو حذف کرکے ہم اس کتاب کے اوراق میں پھیلی ہوئی رودادِ سفر کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

اقبال میری کمزوری بن گئی ہے۔ گفتگو کوئی بھی ہو اس میں اقبال کا حوالہ آجاتا ہے بلکہ اختتام افکارِ اقبال ہی سے ہوتا ہے۔ اقبال دراصل میری ہی کمزوری نہیں بلکہ بہت سے لوگوں کی بھی کمزوری ہے اور حقیقت ہے کہ یہی کمزوری ہماری علمی قوت بن گئی ہے۔ شاکر صاحب بھی سچے عاشقان اقبال میں ہیں۔ میں اپنی ذات کی بابت کہوں گا کہ وطنِ اقبال میرے لئے محترم ہے تو دو وجوہات سے ایک ان پاکیزوں روحوں کی وجہ سے جنہوں نے مخلصانہ اپنے لہو اور بوٹیوں سے اس کی تعمیر کی۔ عزیمت کی پہاڑ جیسی ماؤں، بہنوں کو اپنی اور آئیندہ آنے والی نسلوں کی عصمت کی حفاظت کی خاطر اپنی عصمت کے لٹنے کے سانحے سے گزرنا پڑا۔ اور دوسری وجہ اقبال کی ہے۔ یہ سرزمین اقبال کے خوابوں کی سرزمین ہے اس کی بنیادیں ان کے افکار میں پیوست ہیں۔ ان معاملوں میں یہ دنیا کی خوش قسمت ترین ریاست ہے۔ شاکر صاحب لکھتے ہیں: "وہاں جانے کی میری دیرینہ خواہش اسی وجہ سے تھی کہ میں لاہور کے علمی سرچشموں اور دانش کدوں سے کچھ اپنی علمی پیاس بجھاؤں خاص کر شاعر مشرق، دانائے راز حضرت اقبال کی قبر پر جاکر نیاز حاصل کروں۔" (85) سچ پوچھیے تو انہوں عاشقینِ اقبال کی دیرینہ خواہش کا اظہار کیا ہے۔ پھر ان کا انتساب تو ہم جیسے لوگوں کے جذبات کو کسمسانے اور ہماری عقیدت کے زخموں کو کھرچنے کے مترادف ہے:

ان عاشقانِ اقبال کے نام جو مدتوں سے مرقدِ اقبال کی زیارت کے لئے تڑپتے رہے ہیں!!"

پھر زیارتِ اقبال کا منظر اس پر مستزاد ہمارے شوق کو انگڑائی لینے پر مجبور کرتا ہے۔: "یہ اقبال کا پرکشش جذبہ ہی ہے جو مجھے کھینچ کے اس زیارت گہ پر لے آیا۔ میں نے خلوص بھرے دل اور پورے جذبات کے ساتھ یہاں حاضر ہو کر قرآن کی جستہ جستہ تلاوت کی، درود شریف کا ورد کیا، سورہ فاتحہ اور دیگر اذکارِ مسنونہ کا ثواب محوِ خواب مردِ قلندر کی روح کو بخش دیا۔ مجھ نادر مسافر کے پاس اس کے علاوہ اور تھا ہی کیا جو ان کی نذر کرتا۔" (50)

در دیدہ معنی نگہاں حضرت اقبالؒ
پیغمبری کرد ولے پیمبر نتواں گفت

مرزا شاکر صاحب جس طرح عالم وفاضل ادیب وشعرا کے ساتھ اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہیں وہ واقعی قابلِ رشک ہے۔ اس محبت وعقیدت سے خود ان کی شرافت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ سچے اور مخلص انسانوں کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ دوسری مخلص ہستیوں کے سامنے اپنے زانو ادب سے تہہ کرتے ہیں اور ان سے نیاز حاصل کرتے ہیں۔ متکبر انسان اپنی ذات کے خول سے باہر نہیں دیکھ پاتا اور خود کو مرکزِ جہاں سمجھتا ہے۔ پھر شاکر صاحب کی یہ بات بھی دل کو متاثر کرتی ہے کہ وہ بغیر کسی مسلکی تفریق کے ہر ایک علمی ورثے سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ علم ودانش کے درخت پر جو ثمر لگتے ہیں ان میں یہ سب سے میٹھا ثمر ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ پہلے ہم علم وتعلیم کے قائل نہیں اب اگر قائل ہو بھی جائیں تو وہ محض ڈگری اور نوکری کی حد تک ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے روز بروز علم وادب کا نہ صرف ذوق گر رہا ہے بلکہ معیار بھی پست ہو رہا ہے۔ کشمیر کی حالیہ علمی و ادبی روایت سے میں ایک طور پر بدگماں ہوں وہ اس لئے کہ ہمارا معیار گائیڈ کی سطح تک چلا گیا ہے۔ ہم انگلی کٹا کے شہیدوں کی صف میں شامل ہونے کے خواہاں ہوتے ہیں ایسے ہی اب گائیڈ لکھ کے یا منتشر خیالات کو جمع کر کے مصنفین کی صف میں باریابی کے لئے کوشاں ہیں۔ مجھے اعتراض تو نہیں ہو سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ ہماری فکر کا دائرہ کار دوسروں تک بھی پہنچے نہ یہ کہ ہم خود ہی اس دائرے کے چکر لگاتے رہیں۔ جب ہمیں کالج کے کتب خانوں کے لئے کتابوں کی خریداری کے لئے کہا جاتا ہے تو اس میں بطورِ خاص گائیڈ نما کتابیں خریدنے کی تاکید کی جاتی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ذہنی سطح اس سے اوپر جاتی نہیں۔ دفاتر سیاہ ہوئے لیکن ذہن میں سیاہی کے سوا کچھ نہ جما؛ نہ افکار نہ کردار۔ ہمارے رول ماڈلز گول ماڈلز بن گئے اور برائی ہرسُو راج کر رہی ہے۔ اس بے حسی کی طرف صاحبِ کتاب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "مسجد کے شمالی جانب علما کی اکیڈمی ہے اور جنوب میں مسجد کی دوسری منزل میں ایک شاندار لائبریری ہے۔ مگر افسوس یہاں کوئی صاحب ذوق مطالعہ کتب میں منہمک نظر نہیں آیا۔ بس ایک آدمی نگرانی کے لئے کتابیں فراہم کرنے کرنے لئے تن تنہا موجود تھا" 48)

اس صورتِ حال کے برعکس پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے سفرنامے سے بھی دُخ در معقولات ہی سہی پر اقتباس درج کرتا ہوں: "میں نے ڈاکٹر رحمت اللہ سے کہا: "ایک نظر لائبریری دیکھ لیں؟" وہ ہمیں دوسری منزل پر لے گئے۔ لائبریری کے وسیع و عریض ریڈنگ روم میں داخل ہونے کے بعد ہم کاونٹر کے پیچھے ہی رک گئے۔ دارلمطالعے کا پورا منظر سامنے تھا۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی لائبریری میں ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا ---------------You,see this is the, real force of France.

ہم نے آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے تصدیق کی۔۔۔ ڈاکٹر رحمت اللہ نے نیچے آتے ہوئے بتایا: "فرانس اپنے بجٹ کا 35 فی صد تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔" ۔۔۔ "آپ کو معلوم ہے دنیا کی سب سے بڑی ایمپلائے منٹ روسی فوج ہے بلکہ تھی، اب تو ختم ہو چکی ہے۔ دوسرے نمبر پر فرانس کا محکمہ تعلیم ہے، جہاں ایک ملین آدمی ملازم ہیں۔۔۔ ایک ملین۔۔۔ دسویں صدی میں اندلس کے مسلمانوں نے علوم و افکار کی جو شمع روشن کی تھی، یورپ نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ مسلمان تاریکیوں کی طرف لوٹ گئے اور یورپ نے اس شمع کی لو بڑھائی۔ اس کے نتیجے میں وہ اقوام عالم کی راہ نمائی پر فائز ہوا۔ آج بھی وہ افکار و علوم میں امامِ جہاں ہے۔" چند روز پیرس میں" مشمولہ پوشیدہ تیری خاک میں (سفر نامہ اندلس) (لاہور: ادبیات، 2011) 244

ان دونوں اقتباسات سے عوامل اور نتائج از خود واضح ہیں۔ مسلم امہ سے اعراض کرتے ہوئے یہ کہنا ہے کہ گویا اس خطہ امین شاہ ہمدان، خواب گاہ علمدارِ کشمیر نور الدین کے مسکن کو علم و ادب سے جیسے بیر ہے۔ اس کے باسیوں کو پست ذہنی سطح اور پستیٔ افکار، دکھاوے، دنیا بالخصوص مکان پرستی، شادیوں میں فضول خرچی کی لت کا ایک روگ لگ گیا ہے۔ ایک پروفیسر اپنی پروفیسری سے کم اپنے مکان سے زیادہ پہچانا جاتا ہے۔ یہی حال قوم کی دوسری شخصیات بالخصوص ڈاکٹروں اور وکلا کا بھی ہے اور بیروکریٹوں کی بات کریں تو مذکورہ شخصیات کو اپنی کم مائگی کا احساس ہوگا۔ خدارا یہ سمجھیں کہ علم و ادب کی ایک اپنی دنیا اور اپنا سلسلہ ہے جس میں سب سے اہم مطالبہ رندی و سرمستی کا ہے۔ ان معنوں میں کہ علم و ادب ہمارا اولین مشغلہ اور بنیادی مصروفیت بنے نہ یہ کہ دنیاوی مشاغل سے اگر بعذر کچھ وقت نکلے تو اس کو اس پر صرف کیا جائے۔

کشمیر میں علم و ادب کے ساتھ بد قسمتی سے ہمارا رویہ یہی ہے۔ دنیاوی مشاغل ہمیں چھوڑیں گے نہیں اور علم و ادب آہستہ آہستہ ہم کو خیر باد کہے گا۔ یاد رکھیں جو اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی مارنے پر تلا ہوا ہو؛ دوسرا خود کو نقصان پہنچنے کے خدشے سے اسے بچانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اور علم و ادب بالخصوص اپنے دین و مذہب، زبان و حروف، تہذیب و ثقافت، تاریخ و حکومت سے اعراض اغماض برتنا اپنی قومی زندگی پر کلہاڑا مارنے کے مترادف ہے جس سے اس پیڑ کے دھڑام سے گرنے کی پیشن گوئی کوئی نادان بھی کر سکتا ہے کہ چہ جائے کہ دانا۔ میری تشنہ روح اقبال کو اپنا واویلا سناتی ہے اور اقبال کی تشنہ روح اللہ

سے فریاد کرتی ہے اے خالقِ دو جہاں میرے خوابوں کی یہ حسین سرزمین ۔۔۔! اور یہی بات مجھے شاکر صاحب کے سفرنامے سے محسوس ہوئی۔ جو اقبال کے وطنِ اصلی اور وطنِ سکونت دونوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن ہم :

رہ و رسمِ فرماں روایان شناسیم
خراں برسرِ بام و یوسف بچاہے!

کے اصول پر کار بند ہیں۔

فرسودہ قدروں کی پامالی ٹھیک ہے لیکن فرسودگی کا نام دے کر اصل قدروں کی پامالی کرنا اپنی بے دردانہ تباہی کے مترادف ہے۔ مجھے کہنے کی اجازت دیں کہ ہر ہر معاملے میں ہم اپنی اس بے دردانہ تباہی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اپنی تمام شناختوں کو مٹانے کے درپے ہیں اور جو ہمیں اس کی طرف متوجہ کر رہا ہے اس پر فرسودگی کے خچر پہ بٹھا کے ڈھنڈورا پیٹتے اور خوش فہمی میں قہقے مارتے ہیں۔ تعلیماتِ اقبال کا جو حال کشمیر میں ہے اس کی طرف دل کڑتا ہے۔ ادارہ اقبال (اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی) کے تیئں کشمیر یونیورسٹی کے اربابِ اقتدار کی کم نظری، بے حسی سے دل پر اور بھی چھریاں چلتی ہیں لیکن ہم بطورِ قوم کچھ کرنے کے ہنر سے ابھی ناآشنا ہیں اور کارِ مرداں والے سرد آہوں پر ہی اکتفا کے پروردہ ہیں۔ جب علم کے قدردانوں کو قدردان نہیں ملتے تو وہ اپنی متاع کو برسرِ بازار اگر نیلام نہ کریں تو ان کے دم گھٹنے کا امکان ہے۔

شاکر صاحب جیسے غیر تدریسی شعبوں سے وابستگی رکھنے والے علم وادب سے وابستگی رکھنے پر مبارکباری کے مستحق ہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ شاکر صاحب اپنے علمی سفر کو جاری رکھیں گیں اور جو کتاب وہ ترتیب دے رہے ہیں وہ بھی جلد شائقینِ علم وادب کے ہاتھوں میں ہوگی۔

رنگہ رِیوٗل (کشمیری)

مبصر: سلطان الحق شہیدی

رنگہ رِیوٗل چھ کاشرِ شاعری ہُند مجموعہ کلام یُس مرزا شاکر صابنٕ تخلیقی سفرک باوژ بل چھُ۔ یہ کلام چھُ مرزا بشیر صابن وقتہ قتہ تحریرس منز انتھ رژھر وومُت۔ ون چھُکھ کتابی شکلہِ منز اسہِ برنہہ کُن اونمُت۔ مرزا صابن چھُ امہِ برنہہ تہ وار یاہ کتاب چھاپ کرمژ یموکنِ ہند نثری تہ منظوم دنیا چھُ اسہِ وُچھنک تہ زانہ نک موقعہ میلان۔ صاحب کتاب چھُ اکھ سُہ گنماتھ یُس پننن اوک پک کن حالاتن واقعاتن تہ حارثاتن سنان تہ در دِلہ سان وژھناوان چھُ۔ تس چھ قدرتن سوزِ دِل بخشمُت، سُہ چھُ انسان تہ انسانیتک ژُک در۔ اوے چھُ پرتھ ناانصافی وُچھتھ بے چین تہ بے قرار گژھان۔ شاکر صاب چھُ شار باوتھ کرتھ پننن تجربن منز قاریس شامل کران تہ قاری چھُ تمسند تجربہ پنن زانتھ محوتہ مسحور گژھان تہ تس مٹہِ مٹہِ کران۔ تمسنز باوتھ چھے بلا تکلف عالم تہ پننہِ وطنہ کن حالاتن منظرنامن تہ شخصیاتن پٹھ پننہِ سونچک ردِ عمل خوبصورت تہ سنہ وَس اندازس منز بصری تہ فکری دارِ مُژراوان تہ اندرِم ماحول گاشہِ راوان۔ اسلامیاتس، دینیاتس تہ اقبالیاتس ست وابستگی چھے یہندِ کلامہ ست ٹاکار لبنہ یوان۔ مرزا بشیر احمد شاکر چھُ اردو تہ کاشرس منز زبر تہ جان دسترس تھاوان۔ یِم چھِ نثرتہِ خوبصورت معنہِ خیز ورتاوس انتھ پرن والس نون نون موضوعاتن تہ طرفاتن سال کرناوان۔

کاشرِ زبان ہند بہلہِ پایہ سخنور غلام نبی فراق چھُ وِزِ وِزِ شاکر صابس مشور دوان آمت۔ یمہِ کنِ یمو پننہِ شاعرانہ پروازِ تہدِ کھتہ تھود تھوچ جدو جہد برابر قایم تھا۔ تمن کاشرن گنماتن، موسیقارن تہ احبابن یمن نِش یِم متاثر گامت تمن خراج عقیدت دِنس منز چھُنہ یمو کانہہ پس وپیش کورمُت بلکہ پور پور حق ادائی چھکھ کرمژ تہ یہن زقدر سنجی چھکھ اسہِ آیتن تھومژ۔ یہ چھُ یہندِ اخلاصک تہ اخلاقک ٹاکار ثبوت۔ نظمہ اسن تن یا غزلہ یمہ چھے سوز و ساز ست گرزان تہ بوزن والس تہ پرن والس کشش کران تہ داد دیاوان۔

قلمی چہرہ: مرزا بشیر احمد شاکر

تحریر: خالق پرویزؔ (بارہمولہ)

چلو اب چلیں ہم بسوئے شمال
وہاں ایک مشہور ہے ہسپتال
یہ ہے واقع صورہ میں مشہور ہے
بغل میں ہے نوشہرہ نہیں دور ہے
ادھر پاس رہتا ہے مرزا بشیر
وہ ہے دوست میرا بڑا بے نظیر
قلم کار، شاعر، وہ سیار ہے
اور شوق سفر کا وہ دلدار ہے
سفر کر چکا ہے وہ اکثر دیار
گیا ہے وہ ویزا پہ سرحد کے پار
لکھی مڑ کے آ کر وہ سب داستاں
جو دیکھا نظر سے کیا وہ بیاں
لحد پہ وہ اقبال کے بھی گیا
ملاقات بیٹی سے ان کی کیا
کھلے دل وہاں سب نے تعظیم کی
اسے شال دے کر بھی تکریم کی
کتاباً درج ہے یہ سب داستاں
جو دیکھا وہاں پر کیا ہے بیاں
نظم اور نثر کا بھی استاد ہے
کھرے اور کھوٹے کا بھی نقاد ہے
قلم کی ہماری ہے یہ دوستی
ہے عشروں سے باقی ابھی دوستی
نہیں پاس میرے اگر دور ہے
نہیں دل سے لیکن وہ مستور ہے
بہ فضل خدا شاد و آباد ہو
بہر رنگ آفت سے آزاد ہو

اقبالؔ کی باتیں

مرزا بشیر احمد شاکر

مجھے لگتی بہت میٹھی ہیں یہ اقبالؔ کی باتیں
سُنا دو دل کو چھونے والی ہیں یہ اقبالؔ کی باتیں

وہ اک مردِ کلندر، مردِ حُر، مردِ خدا آگاہ
خودی کا راز دان تھا وہ ہیں یہ اقبالؔ کی باتیں

وہ اپنے فلسفہ سے، فکر سے چھایا زمانے پر
دلِ بیتاب لایا تھا ہیں یہ اقبالؔ کی باتیں

حقیقت آشنا تھا ترجمان تھا دردِ ملّت کا
جگایا خوابِ غفلت سے ہیں یہ اقبالؔ کی باتیں

دیا پیغام فقیری میں شہنشاہی کے کرنے کا
نیا اک ولولہ بخشا ہیں یہ اقبالؔ کی باتیں

کرے یہ کنجشک شاہین سے کیسے پنجہ آزمائی
کرو پرواز اڑو اوپر ہیں یہ اقبالؔ کی باتیں

''بہ ایں پیری رہِ یثرب گرفتم'' اس نے لکھا تھا
مدینے کی مسافر کی ہیں یہ اقبالؔ کی باتیں

پھڑکتا تھا کبوتر اُس کے دل کا ذکرِ حضرتؐ سے
جڑی لگتی تھی آنسوں کی ہیں یہ اقبالؔ کی باتیں

میرا دل چاہتا ہے چومنے کو اُن کی آنکھوں کو
جنہوں نے اس کو دیکھا تھا ہیں یہ اقبالؔ کی باتیں

سعادتمند تھے یارانِ محفل اور وہ احباب
میسر جن کو صحبت تھی ہیں یہ اقبالؔ کی باتیں

مبارک سرزمین لاہور کی تجھ کو مبارک ہو
وہ تیرے بطن میں خوابیدہ ہیں یہ اقبالؔ کی

شاکر خطوط نویسی اور دانشوروں کے جوابی خطوط کی روشنی میں

بنام ایڈیٹر
ماہنامہ حکیم الامت سری نگر

(1)

ماہنامہ ''حکیم الامت'' کا اگست ۲۰۰۹ء کا شمارہ کل موصول ہوا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس رسالہ کی تین جلدیں مکمل ہوچکی ہیں اور یہ چوتھی جلد کا پہلا شمارہ ہے۔ آپ مبارک بادی کے مستحق ہیں کہ اپنی ہمت، کوشش اور پُرخلوص جذبہ دل سے اس علم و ادب کی مشعل کو تند و تیز ہوا کے جھونکوں کے باوجود روشن رکھا۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رکھا ہے
وہ مرد درویش کہ جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

رسالہ ''حکیم الامت'' کا گیٹ اپ اچھا' چھپائی عمدہ اور آرٹ پیپر کا استعمال قابل ستائش ہے۔ یوں تو اس کے سبھی مشمولات قابلِ دید ہوتے ہیں۔ اگر اقبالیات سے متعلق ملک او ربیرون ملک کے تمام مشمولات اور مقالات کو یکجا کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے اور ادبیاتِ اقبال میں خاصا اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس رسالے کا معیار بہت ہی عمدہ اور معیاری ہے اور امید ہے کہ یہ آئندہ بھی برقرار رہ پائے گا۔ آنے والی نسلوں اور شائقین اردو کے لیے ''حکیم الامت'' کی فائیلیں بہت ہی سود مند ثابت ہوسکتی ہیں۔ انشاء اللہ!

جہاں آج کل 'اپنے' ہی اردو ادب کی خدمت کے نام پر کلہاڑی لے کر اس کی جڑیں کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں' وہاں آپ صحیح معنوں میں اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ تحقیقی مضامین اور حیاتِ اقبال سے متعلق آپ کی بدولت پوشیدہ گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور دعویٰ کے ساتھ ساتھ ثبوت بھی چھاپ کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ آپ نایاب تصویروں سے اس علمی اور ادبی جریدے کو مزین کرتے ہیں۔ مجھ جیسا شخص اقبال کے اہلِ خاندان کی تصویروں کو کہاں دیکھ پاتا۔ میر تقی میر اور دیگر محسنین اردو کی تصویریں خوب ہیں۔

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

آپ کا اداریہ بہت ہی صحت مند ہوتا ہے خاص کر حالیہ شمارے میں اداریہ شوپیان سانحہ کے تعلق سے ایک قسم کا چلینج ہے۔

(بشیر احمد بیگ شاکر۔ مطبوعہ: جنوری 2010ء)

(2)

جنوری' فروری ۲۰۱۱ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ ویسے تو ''حکیم الامت'' کے اکثر شمارے قابل دید اور لائق مطالعہ ہوتے ہیں مگر حالیہ شمارہ یعنی گوشۂ کشمیر کچھ زیادہ ہی دیدہ زیب اور قابل تحسین محسوس ہوا۔ کاغذ اور طباعت کے لحاظ سے یہ رسالہ بہت معیاری ہے۔ علاوہ ازیں اس میں شامل مقالات' مضامین اور منظومات بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں

گوشۂ کشمیر سے متعلق منظومات دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ دعوت غور وفکر دیتی ہیں۔ صد سال قبل یا اس سے کم یا زیادہ کی منظومات کو قدیم رسالہ جات سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکالنا پہاڑ میں جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ قبرستانوں میں دہائیوں سے مدفون شعرائے کرام کا کلام علامہ اقبالؔ کے زمانے میں نکلنے والے مخزن' خوشی محمد ناظرؔ، سید سجاد حیدر یلدرمؔ، اثرؔ لکھنوی' سروش طباطبائی' صادق علی صادقؔ جیسے سرکردہ اور کہنہ مشق اساتذہ کا کلام پیش کرنا مہمانوں کے سامنے خوانِ نعمت بچھانے کی جیسی بات ہے۔ مخزن بابت اکتوبر ۱۹۰۶ء جیسے موقر رسالہ سے پیرزادہ محمد حسین عارفؔ کی نظم بعنوان ''خطۂ بے نظیر کشمیر'' اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا آپ جیسے مردانِ باہمت کا کام ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا مضمون ''اقبالؔ اور شادؔ'' نظر کشا علمی مضمون ہے۔ اس سے پیشتر اسی موضوع پر آپ کا ایک مضمون جو کہ تفصیلی ہے کئی سال پہلے ''شیرازہ'' کے ایک شمارے میں چھپ چکا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال فرزند دلبند حضرت اقبالؔ کا مضمون بھی بہت ہی قابل قدر او رلائق مطالعہ ہے۔ حسن ساہوؔ کا مضمون ''اردو زبان او رہم'' اردو داں اور علم دوست حضرات کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ آپ کا ایک اور مضمون داغؔ دہلوی تحقیقی ہے۔ ڈاکٹر اشرف آثاری کا مضمون غور طلب ہے۔ امید ہے محترم سلطان الحق شہیدیؔ اس کا جواب لکھ کر اپنی پوزیشن صاف کریں گے۔ ہاں ادبی طالب علم کی حیثیت سے عرض گذار ہوں کہ اداریہ گوشۂ کشمیر کے اختتام پر درج ذیل شعر درج ہے۔

خورد گندم آدم از جنت کشیدندش بروں
من کہ خوردم آبِ جو یارب بہ کشمیرم رساں

میری رائے میں رساں کا ترجمہ پہنچایا کے بجائے پہنچائے ہونا چاہیے' ماضی کے بجائے مستقبل کا صیغہ۔

(بشیر احمد بیگ شاکر۔ مطبوعہ: مئی 2011ء)

(3)

آج ایک طویل مدت کے بعد آپ کی خدمت میں یہ عریضہ سپرد قلم کر رہا ہوں۔ کچھ مجبوریاں اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے نامہ دیر سے لکھ رہا ہوں۔

آپ کو شاید مسرت ہوگی کہ راقم حروف کو اپریل ۲۰۱۲ء میں لاہور' پاکستان جانے کا موقعہ فراہم ہوا اور مدتوں کی تمنا برآئی کہ مقبرہ حکیم مشرق حضرت علامہ اقبالؔ پر حاضری نصیب ہوئی۔ علامہ کے قبر مبارک کی زیارت کی اور اسی مقبرے پر چند گھنٹے گذار کر ایک روحانی سکون حاصل کیا۔ بادشاہی مسجد میں موجود تبرکات کی زیارت سے بھی مشرف ہوا۔ مقبرہ حفیظ جالندھری مرحوم پر بھی فاتح خوانی کی۔ اس کے علاوہ داتا گنج بخش حضرت سید علی ہجویزی کی درگاہ بھی چلا گیا اور نیاز مندی کے ساتھ عزیز و اقارب کے حق میں وہاں پر دعائیں مانگیں۔ مگر میرے دورۂ پاکستان کا خاص مدعا و مقصد حضرت علامہ اقبال کے روضۂ شریف کی زیارت تھی۔ جیسا کہ علامہ نے فرمایا کہ۔

زیارت گاہِ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

حکیم الامت بابت جون ۲۰۱۲ء کا حالیہ شمارہ آج کل میرے زیر مطالعہ ہے۔ رسالہ خوب ہے۔ آپ کا مضمون ''اقبالؔ کی پہلی تصنیف ''اسرار خودی''، ستمبر ۲۰۱۵ کا نقشۂ اول'' کچھ چونکا دینے والا ہے کہ اسرار خودی کا پہلا ایڈیشن 1915ء میں شائع ہوا تھا۔ کئی ادیبوں اور محققین کی رائے اس کے برعکس ہے۔ آپ کے مضمون سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ نے حوالہ جات فراہم کیے ہیں۔ علامہ سید جواد نقوی کا مقالہ ''تفسیر اسرار خودی'' بھی بہت عمدہ ہے۔ جناب شبیب انور علوی کاکوروی کا ''ملفوظ نظام الدین اولیاؒ'' بھی بہت عمدہ اور قابلِ مطالعہ ہے۔ ناچیز راقم نے کئی بار دہلی میں اُن کے مقدس

مقبرے پر بھی حاضری دی ہے اور اللہ تعالیٰ سے التجائیں کی ہیں۔ ساتھ ہی وہاں امیر خسرو کے مقبرے کی بھی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ ظفر حیدری کا قیمتی مضمون ''کشمیر میں صحافت اور صحافی کے فرائض'' بھی قابلِ قدر ہے۔

ایک مودبانہ گذارش ہے کہ ''حکیم الامت'' کے قلم کاروں کی تصویریں ہر بار اور ہر ایک ماہ نامہ میں چھاپنا زیادہ اچھا نہیں لگتا ہے۔ ہاں مشہور و معروف اور نایاب تصویریں ہوں تو یہ ٹھیک ہے جیسا کہ آپ نے پہلے پہل محمد حسین آزادؔ میر تقی میرؔ اور نوابانِ لکھنؤ و حیدر آباد کی تصویریں چھاپی تھیں۔

(بشیر احمد بیگ شاکر۔ مطبوعہ: ستمبر 2012ء)

(4)

ماہنامہ رسالہ حکیم الامت کا تازہ شمارہ بابت جنوری تا مارچ 2024 بازار سے منگوایا۔ یہ شمارا دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوا کیوں کہ آج کی بار آپ اپنے قارئین کے لئے کچھ نئی سوغات لے کر آئے ہیں۔ سارے کا سارا رسالہ ایک مقالے پر مشتمل ہے جس کا عنوان'' رثائی ادب کی تحقیق و تدوین میں ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کی خدمات کا تجزیاتی مطالعہ'' ہے۔ یہ مقالہ سرحد کے پار سکونت پزیر ایک ریسرچ اسکالر محترمہ فرزانہ ناز صاحبہ کا تحریر کردہ ہے۔

قابلِ صد مبارک ہیں محترمہ فرزانہ ناز جس نے اُس درج بالا عنوان کے تحت ایک کٹھن اور دقت طلب منصوبہ ہاتھ میں لیکر اپنے شب و روز کی محنتوں اور اس راہ میں حائل مشکلات کو طے کر کے کامیابی کی منزل کو پالیا۔ اس پروجیکٹ پر دورانِ کار موصوفہ کو کیا کچھ جھیلنا پڑا ہوگا اور کن دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ رسالے میں درج خود ان کے پیش لفظ کا مطالعہ کر کے ہو جاتا ہے۔ کتابوں تک رسائی حاصل کرنا، کتب خانوں کی خاک چھاننا، اخبارات و رسائل کو ڈھونڈنا، دانشور حضرات اور اس کام سے متعلق اساتذہ کی راہنمائی کے لئے جا بجا سفر کرنا کارے دارد والا معاملہ ہے۔ ایسے ہی مواقع کے لئے یہ شعر کہا گیا ہے۔

ارادے جنکے پختہ ہوں نظر جنکی خدا پر ہو
طلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول: اردو مرثیے کی تحقیق و تدوینی روایت۔

باب دوم: ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری اور مرثیے کی تحقیق، تنقید اور تدوین۔

باب سوم: مرثیے کی تحقیق و تدوین اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری۔

باب چہارم: تدوین مرثیہ اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری۔

باب پنجم: تحقیقاتِ انیسؔ و دبیرؔ و ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کا میدان۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بلا خوف تردید مرحوم پروفیسر اکبر حیدری اردو زبان و ادب کے ایک شہسوار، مردِ قلم و قرطاس اور محقق اعظم قرار دئے گئے ہیں۔ برِ صغیر کے نامی گرامی ادیبوں اور قلمکاروں نے مرحوم حیدری صاحب کے تئیں اپنے اپنے وقت پر ان باتوں کا برملا اظہار کیا ہے جن میں بطورِ خاص جناب مشفق خواجہ، ادارہ نقوش کے محمد طفیل، جوشؔ ملیح آبادی، جعفر علی خان اثرؔ لکھنوی، مرحوم ڈاکٹر جاوید اقبال، مسعود حسن رضوی ادیبؔ، قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کی صلاحیتوں اور ٹھوس بنیاد پر تحقیقی کاموں کا بہت سارے ادیبوں اور ادب نوازوں نے صمیم قلب سے اعتراف کیا ہے۔ اقبالیات، غالبیات، انیسیات، دبیریات کے علاوہ ادب کے دیگر میدانوں میں بھی حیدری صاحب کے کارہائے نمایاں اچھی طرح سے نظر

آتے ہیں۔

زیرِ نظر مقالہ کو پڑھکر رثائی ادب پر تحقیق وتنقید کے ساتھ اس پر ڈاکٹر اکبر حیدری کی کس قدر گہری نظر اور علمی بصیرت تھی۔ مقالہ نگار نے لگ بھگ ہر زاویہ سے اس کی اپنی تحقیق کی ہے۔ اور حسب ضرورت اس کے شواہد پیش کئے ہیں۔ دراصل اس پرُ مغز اور بصیرت افروز مقالہ پر ایک غیر جانبدار تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ دیگر محققین اور نئے وارد ہونے والے ریسرچ اسکالروں کے لئے محترمہ فرزانہ ناز کا یہ پی ایچ ڈی (PhD) مقالہ بہت ہی کارآمد، چشم کشا اور مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ اپنے اس ناچیز مراسلے کو اختتام پر پہنچانے سے قبل میں ڈاکٹر اکبر حیدری کے لائق فرزند اور ان کے مشن کو آگے لیجانے والے جناب ڈاکٹر ظفر حیدری صاحب کے کام کو بھی دل سے سراہتا ہوں کہ محترمہ فرزانہ ناز کے اس خونِ جگر سے تحریر کردہ کارنامے کو اپنے مکمل رسالے (تین مہینوں پر مشتمل) یعنی ماہنامہ حکیم الامت کے جریدے میں چھاپ کر محفوظ کیا ہے۔ اور اس طرح اردو ادب کے قیمتی خزانے میں اور ایک دُرے بہا کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے قبل بھی حکیم الامت کے معمول شماروں کے ساتھ ساتھ بہت سارے خصوصی یادگاری شمارے منظرِ عام پر لائے ہیں جن میں یہ کچھ شمارے بھی شامل ہیں:

1، زمانہ کانپور اور اقبال، 2۔ معرکہ اسرار خودی، 3۔ مقالاتِ حیدری نمبر، 4۔ ڈاکٹر تقی عابدی نمبر، خدیجۃ الکبریٰ نمبر، مولودِ کعبہ نمبر، خاتونِ جنت نمبر، ثانیِ زہرا نمبر، ابو طالب نمبر، خطیبِ اکبر، شمس الدین احمد نمبر وغیرہ۔

دعا ہے کہ اردو ادب کی خدمت کرنے اور ہر قدم پر اس کی آبیاری کرنے والے تمام لوگوں کی اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔ آمین!

مرزا بشیر احمد شاکر مطبوعہ مئی 2024ء

مرزا بشیر احمد بیگ
بنام اکبر حیدری کشمیری

محترم المقام ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب:

السلام علیکم

چند ہفتے قبل ماہنامہ شیرازہ جو کہ کلچرل اکادمی کی طرف سے شائع ہوتا ہے خرید لیا۔ یہ شمارہ حضرت علامہ اقبال کی نذر کیا گیا ہے۔ بیشتر مضامین علامہ اقبال کی شاعرانہ شخصیت اور ان کے فن کے تعلق سے تحریر کیے گئے ہیں۔ راقم الحروف کو یہ شمارہ پڑھنے کی توفیق مل گئی۔ سبھی مقالات اور مضامین اپنی جگہ درست ہیں۔

حرفِ آغاز کے بعد آنجناب کا مقالہ بعنوان ''اقبال اور شاد حیدر آبادی شروع ہوجاتا ہے۔ راقم نے شمارہ میں درج دو چار مقالات پڑھنے کے بعد اس مقالہ کا مطالعہ شروع کیا۔ دورانِ مطالعہ کس قدر لطف اندوز ہوگیا یہ میرے بیان سے باہر ہے۔ آپ کا تحریر کردہ مقالہ بہت ہی قابل قدر ہے۔ بہت ساری معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ راقم کو شاد حیدر آبادی سے متعلق کوئی خاص واقفیت نہیں تھی۔ ان کی عالمانہ اور صوفیانہ شخصیت سے کماحقہ واقف ہوگیا۔ مشاعرے میں ان کا ناز وادا کے ساتھ خراماں خراماں تشریف لانا واہ! یقیناً پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ علامہ اقبال اور شاد حیدر آبادی کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ وہ بھی بے تکلف دو دوستوں کے درمیان۔ اپنی اپنی اور گھریلو زندگی کے حالات و کوائف۔ ایسی خط وکتابت چھپوا کر آپ نے تاریخی دستاویزات کو مجھ جیسے کم علم اور عام قارئین تک پہنچا کر محفوظ کیا ہے۔ کتنی گرہیں کھلتی ہیں......

راقم الحروف کو آپ کے ساتھ تعارف نہیں ہے البتہ ایک غائبانہ واقفیت ہے۔ آپ کی شخصیت جانی پہچانی علمی شخصیت ہے۔ Voice of Kashmir میں آپ کے دو

مضامین (انگریزی میں) حافظ شیرازیؔ اور میر انیسؔ کے بارے میں پڑھے ہیں اور اپنے پاس آپ کی بس ایک کتاب ''کلام اقبال'' سنبھال کر رکھی ہے۔ دراصل آپ کے مقالہ نے مجھے یہ حقیر خط لکھنے کی ترغیب عطا کی اور چند بے ترتیب اور ناقص جملے سپردِ قلم کیے وگرنہ ؎

چہ نسبت خاک را بہ عالم خاک

.....جوابی لفافہ منسلک رکھتا ہوں۔ والسلام۔

نیاز مند بشیر احمد بیگ شاکر

شاکر بنام پروفیسر بشیر احمد نحوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۶ / جنوری ۲۰۱۷ء

محترم المقام پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید یہی ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہونگے۔

کل مجھے بھی اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے منعقدہ تقریب میں شمولیت کا موقعہ ملا۔ سردی کا دن تھا، جنوری کی ۵ / تاریخ اور عیسوی سن ۲۰۱۷۔ کل سے ہی وادی کشمیر میں اور اس کے گرمائی دارالخلافہ سرینگر میں برف باری کا آغاز ہو گیا، اور مساجد اور خانقاہوں میں دعائیں مانگ مانگ کر اللہ کی رحمت جوش میں آ گئی اور خشک سالی پر قابو پالیا گیا۔ اس سب کے ہوتے ہوئے تقریب سعید میں بہت سارے حضرات موجود تھے اور طلباء اور طالبات کی ایک خاص تعداد بھی کرسیوں پر براجمان تھی۔

مجھے کل ہی معلوم ہوا کہ آپ اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے اگلے مہینے یعنی فروری ۲۰۱۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے والے ہیں۔ اگرچہ ایک طرف یہ شادمان ہونے کی بات ہے کہ آپ اچھی صحت کے ساتھ اور آبرومندی سے اپنی خدمات سے چھٹکارا پا رہے ہیں اور ملازمت کی زنجیروں اور پابندیوں سے آزاد ہو رہے ہیں، تو دوسری جانب اس میں کچھ ملال اور افسردگی کا عنصر بھی شامل ہے۔

جناب عالی! اپنی ناقص رائے میں اپنے تاثرات کچھ یوں قلمبند کر رہا ہوں کہ موجودہ زمانہ قحط الرجال کا زمانہ ہے۔ خال خال ہی کوئی شخص انسانی صورت میں نظر آتا ہے اور اعلیٰ صفات اور خوبیوں کا پیکر ہوتا ہے۔

بقول مولانا رومیؒ ؎

دی شیخ باچراغ ہمیں گشت گرد شہر

کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

آپ نے اپنی زیست کے بہترین سال یونیورسٹی سرینگر میں گزارے۔ درس اور طالب علمی کے سال بھی یہاں بسر کئے اور پھر خدا کے فضل و کرم سے بحیثیت استاد بھی آپ کی تعیناتی اسی دانش گاہ کشمیر میں عمل میں آئی۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ میرے خیال میں اب آپ جیسے مشفق اور ہمدرد استاد کا ملنا محال ہے۔

یہاں یہ بھی لکھتا جاؤں کہ میں راقم الحروف مرزا بشیر شاکر کسی یونیورسٹی یا اعلیٰ علمی ادارہ سے وابستہ نہیں رہا ہوں۔ میں نے چالیس سال سے زیادہ بھارتی محکمۂ ڈاک میں ملازمت کی جہاں علمی اور ادبی سرگرمیوں کا کوئی خاص چرچا نہیں رہتا ہے۔ پھر بھی فیاض ازل نے مجھے نواز کر علمی اور ادبی سرگرمیوں کا دیوانہ بنایا ہے۔ عمر بھر مطالعہ کتب کا شوق دامن گیر رہا۔ کبھی کبھی خود بخود میرا کمزور قلم مجھے کچھ لکھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ کوئی مضمون نکلتا ہے، کوئی شعری تخلیق وجود میں آتی ہے، خطوط نویسی کی شکل میں اپنے اندر کے جذبات صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہوں، جس کا ثبوت زیر تحریر خط بھی ہے۔

خاکسار

مرزا بشیر احمد شاکر

اخبار رہبر کے نام خط

نہ جانے گذشتہ کئی مہینوں سے میرا دل کیوں خود بخود آپ کے اخبار کی طرف پہلے کی نسبت زیادہ مائل ہو رہا ہے۔ دراصل یہ اخبار کی خوبی ہے کہ یہ اپنے قارئین باتمکین کی توجہ اپنی طرف مائل کرتا نظر آ رہا ہے۔ میری رائے میں اس مرد وفا کیش اور قلب صفا رکھنے والے مرحوم ومغفور جناب محی الدین رہبرؔ کے خلوص کا نتیجہ ہے کہ کن نامساعد اور ناگفتہ حالات کے ہوتے ہوئے انہوں نے اخبار کی صورت میں یہ ایک چھوٹا سا پودا لگایا تھا اور اپنی محنت شاقہ سے اس نورستہ پودے کی آبیاری کی تھی کہ آج وہی پودا ہفتہ وار کی صورت میں اپنی پُر بہار اور سرسبز ٹہنیوں کے ساتھ ایک لہلہاتا اور خوشبو بکھیرتا ہوا درخت نظر آتا ہے۔

اگر ہم چشم بصیرت سے ماضی کے دریچوں سے جھانک کر نظریں دوڑائیں گے تو دیکھ سکتے ہیں کہ جس زمانے میں مرحوم رہبر صاحب نے اخبار جاری کیا تھا تو اس زمانے میں ریاست جموں وکشمیر کے سیاسی حالات کس قدر ابتر تھے۔ ان کے پاس اس اخبار کو جاری رکھنے کے سامان ناپید تھے۔ ہر طرف خون ریزی کا عالم تھا اور قتل غارت گری کا بازار گرم تھا۔ حالانکہ یہ دلدوز اور دل آزار منظر آج بھی جاری ہے۔ تاریخ کشمیر میں ۳۱ جولائی ۱۹۳۱ء ایک سیاہ ترین دن مانا جاتا ہے جب قدیر خان کے مقدمہ کے سلسلے میں سینٹرل جیل سرینگر میں اہالیان وطن کا ایک انبوہ کثیر جمع ہوا تھا اور اسی روز کشمیر کے ۲۲ جیالے فرزند گولیوں کا شکار ہوئے تھے اور اذانوں کی گونج میں ان فرزندان توحید نے جام شہادت نوش کیا تھا اور ان کی پاک روحیں آج بھی خواجہ بازار نقشبند صاحب کے احاطے میں اپنی قبروں سے اپنی جرم بے گناہی اور مظلومیت کی فریاد کر رہی ہوں گی۔

بترس از آہِ مظلومان کہ ہنگامہ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال مے آید

اسی سیاہ ترین اور مردم آزار دور میں جناب محی الدین رہبر نے اہالیان ریاست کی نمائندگی اور ان جذبات واحساسات کی بھرپور ترجمانی کے لیے اپنا یہ اخبار نکالا تھا۔ اگرچہ محی الدین رہبر صاحب یہاں کی تحریک آزادی میں ذاتی طور پر بھی حصہ لیتے تھے اور انہوں نے اپنی قربانیوں سے مشعل تحریک حریت کو روشن رکھا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ صحافتی خدمات سے بھی اس تحریک کی بھرپور مدد کرتے رہے۔

اپنے وقت کے جابر وظالم ڈوگرہ حکمرانوں کے ظلم وستم کے خلاف وہ برابر لکھتے رہے۔ نہتے اور بے گناہ کشمیریوں پر جو ظلم روا رکھے گئے تھے رہبر صاحب نے اپنے قلم کی جولانیوں سے اس کی مخالفت میں اپنا کردار نبھایا اور یہی وجہ ہے کہ آج ان کا جاری کردہ اخبار دہائیاں گذرنے کے باوجود پوری آن بان اور شان کے ساتھ جاری ہے۔ اس وقت میرے مطالعے کی میز پر ہفت روزہ اخبار کے کئی شمارے موجود ہیں۔ ہر ایک اخبار کے مشمولات پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں البتہ چند اخبار میں درج مضامین کی طرف قارئین کرام کی توجہ مبذول کرانا مناسب سمجھتا ہوں۔

اس اخبار میں غالبؔ اور غم روزگار کے یوم وفات پر ایک خاص مضمون شائع ہوا ہے اس کے لکھنے والے جناب حقانی القاسمی ہے۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے غالبیات میں یہ مضمون ایک اضافہ ہے اس میں مضمون نگار نے مرزا غالب کی غربت اور تنگدستی سے متعلق غالب کے اشعار کا انتخاب کیا ہے اس طرح غالبؔ کی عسرت کا یہ گوشہ منظر عام پر آ گیا ہے۔ عاصمہ جہانگیر کی آخری مسکراہٹ کے عنوان سے بھی مضمون شامل اشاعت ہے جو حامد میر صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ میر صاحب نے عاصمہ جی کے تئیں اپنے جذبات اور کچھ باتوں کا اظہار کیا ہے اور ان کی زندگی کے روشن پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ دوسرے اخبارات میں اس خاتون کی زندگی کے تاریک ترین

پہلو بھی اجاگر کیے گئے ہیں اوران کے مرزائی عقیدہ رکھنے والے شوہر کی خوب خبر لی گئی ہے۔ ناموس رسالتؐ کے تحفظ کے خلاف عاصمہ جہانگیر کے کردار کی عکاسی کی گئی ہے۔

(۱۱ مارچ ۲۰۱۸ء جلد ۸۶ شمارہ ۱۰)

اخبار کے اس شمارے میں سعودی عرب کا دنیا کو ایک سرپرائز! آخر ہو کیا رہا ہے کے عنوان کے تحت مضمون درج ہے۔ جو کہ ڈاکٹر عاصف شاہد کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں سعودی عرب میں موجودہ سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے اور مسلمانوں کے لیے مرکزی حیثیت رکھنے والے اس ایمانی مرکز میں جدید تبدیلیوں اور کچھ مغربی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے کام کرنے کی ذکر کی گئی ہے۔

گجرات قتل عام ایک مضمون اس شمارے میں درج ہے اور یہ چشم کشا مضمون شبنم ہاشمی نے تحریر کیا ہے۔ اس میں ۲۰۰۲ء میں گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام اوران پر جور ستم کی دلخراش باتیں درج ہیں جو کہ ۱۵ سال کا عرصہ بیت جانے کے بعد بھی تازہ دم لگتی ہیں اور ہر ایک باحس انسان کا دل پسیج جاتا ہے اسی اخبار میں عارف محمود کسانہ سویڈن کا مضمون بعنوان کے ایچ خورشید سے سردار مسعود خان تک ایک اور مضمون شامل اشاعت ہے۔ مضمون نگار نے اس قیمتی مضمون میں خورشید کشمیر کے کردار اور روشن کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی سیاسی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور قائد اعظم محمد علی جناح کی نظروں میں ان کی محبوبیت اور پسندیدگی کا تذکرہ کیا گیا ہے مجھے بھی وادی کشمیر کے اس فرزند جلیل کے مقبرے پر مظفر آباد میں حاضری نصیب ہوئی تھی جہاں میں نے فاتحہ خوانی کر کے ایصال ثواب سے اس محسن کشمیر کو اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ ان کے ساتھ ہی مہاجر ملت میر واعظ کشمیر مولانا محمد یوسف شاہ کا مقبرہ بھی واقع ہے جہاں حاضر ہو کر میں زیارت قبور سے مستفید ہوا تھا دونوں رہنماؤں نے اپنی بے لوث خدمات سے تحریک کشمیر کو سرفراز کیا ہے۔ کے ایچ خورشید کی قبر پر جلی حروف میں پر یہ الفاظ کندہ ہیں ۔

خورشید حسن خورشید

معذوری سے کائنات کی تسخیر تک جناب سید منیب علی کا تحریر کردہ مضمون ہے جس میں حال ہی میں سائنس دان سٹیفن ہاکنگ کی موت کا ذکر ہے اوراُن کی معذوری کے باوجود ان کے کارناموں سے روشناس کیا گیا ہے یہ بہت ہی دلچسپ مضمون ہے ایک گمنام مجاہد آزادی شیر علی خان آفریدی جناب شاہد صدیقی علیگ کا لکھا ہوا مضمون ہے اس بصیرت افروز مضمون میں اس مجاہد آزادی کے عزائم ہمت اور جرأت مندی سے نقاب کشائی کی گئی ہے۔ شیر علی خان کے فوٹو کا چہرہ دیکھ کر اس پر ایک جلالی شان نظر آتی ہے ۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی (اقبال)

اس شمارے کا ایک اور مضمون غازی علم الدین شہید ہے جو کہ اخبار رہبر کا تجزیہ ہے۔ مضمون بہت ہی اہم ہے اور غازی علم الدین کی دین اسلام سے وابستگی اور عشق رسولؐ سے پیوستہ جذبات کا مظہر ہے۔

غازی علم الدین تاریخ اسلام کا ایک درخشندہ ستارہ ہے۔ جس نے ایک دشمن رسولؐ کو اس کی زہریلی اور توہین آمیز کتاب لکھنے پر کیفر کردار تک پہنچایا تھا اور اس قتل کی پاداش میں خود جام شہادت نوش کر کے ابدی زندگی حاصل کی۔

بناء کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

انہی اخبارات میں اردو زبان وادب کے بلند قامت ادیب و شعراء مثلاً فراق گورکھپوری، ساحر لدھیانوی کی شعرو

شاعری اور ان کی ادبی زندگی پر بھرپور مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں برسرِ اقتدار خواتین کی تصویروں کے ساتھ مختصراً ان کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ جناب منصور الدین فریدی کے سیاسی و تجزیاتی مضامین قابل مطالعہ ہوتے ہیں۔ اس سے قبل بھی گذشتہ شماروں میں کئی اہم اور دلچسپ مضامین شائع ہوئے ہیں مقامی قلم کاروں سے زیادہ بیرون ریاست ہی اس اخبار کے کالم نویس نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی نگارشات اور تخلیقات سے اخبار ہفت روزہ رہبر میں چار چاند لگاتے ہیں اور پڑھنے والوں کے ذوق مطالعہ کی تسکین کرتے ہیں' ان کی تحریروں میں گیرائی کے ساتھ گہرائی بھی نظر آتی ہے۔

اس کے علاوہ اخبار متذکرہ میں تواریخی اور سیاسی مضامین بھی درج ہوتے ہیں۔ ماضی کی تاریخ کے واقعات ہوتے ہیں اور نئی پود کے لیے اپنی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کا سامان ہوتا ہے۔

اخبار کی کتابت بذریعہ کمپیوٹر بہت عمدہ ہوتی ہے۔ مواد کے ساتھ ساتھ تصویروں کی شکل میں بھی اخبار جاذب النظر بن گیا ہے اور یہ اخبار ایک تاریخی دستاویز کی شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں رواں تحریک آزادی کے حوالہ سے بھی اس اخبار میں حالات وواقعات تحریر کیے جاتے ہیں۔

گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا
دیکھئے اس موج کی بحر سے نکلتا ہے کیا

(اقبالؔ)

چونکہ میرے والد مرحوم غلام محی الدین بیگ ایڈیٹر رہبر محی الدین (المتخلص بہ رہبرؔ) کے ہم نام تھے اس وجہ سے بھی مجھے آپ کے اخبار کے ساتھ ایک جذباتی لگاؤ ہے۔

آخر پر میرے دو مضامین بعنوان محی الدین رہبر کا ہفت روزہ اخبار رہبر اور دیگر مضمون بانڈی پورہ میں میرا ایک مصروف ترین دن شائع کرنے پر آپ کا شکر گذار ہوں۔ خدا کرے زور قلم اور بھی زیادہ۔

عزت مآب پتامبر ناتھ دَرفانی

نوشہرہ سرینگر

۱۳ نومبر ۲۰۱۱ء

عزت مآب پتامبر ناتھ دَرفانی

تسلیمات

آج میں پہلی دفعہ یہ ناچیز عریضہ آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں خط لکھنے کا باعث یہ ہوا کہ کل سرینگر میں عرفان ترابی کی کتاب خونیں نوا کا اجرا عمل میں لایا گیا۔ کتاب بہت ہی ضخیم ہے اور خوش نما بھی ہے۔ عرفان ترابی نے کافی محنت سے کام لیا ہے اور غیر مسلم شعراء کا کلام جمع کر کے اس کو مرتب کیا ہے اور زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شعرائے کرام کے سوانحی حالات لکھے ہیں اور رنگین تصویروں سے کتاب کو جاذب نظر بنایا ہے۔ یہ کتاب آنے والے قلم کاروں اور موجودہ دور کے ادیبوں کے لیے بھی سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔

ورق گردانی کے دوران مجھے آپ کی بھی تصویر نظر آئی اور آپ کا کلام بھی کتاب ہذا میں چھپ چکا ہے۔ چونکہ آپ بھی ابتدائی طور میرے ہی علاقہ نوشہرہ میں رہائش کرتے تھے اور وچارناگ میں آپ کا دولت خانہ ہوتا تھا۔ اُن دنوں میں بہت ہی چھوٹا تھا اور میرا شعور ناپختہ تھا البتہ آپ کو نوشہرہ میں گھومتے پھرتے دیکھتا تھا۔ میرے جذبات مچل گئے اور آج ہی بذریعۂ فون آپ کے ساتھ رابطہ کیا اور تفصیلی بات چیت ہوئی اور اپنا تعارف بھی کرایا۔

زمانہ کی ہواؤں کے تندوتیز جھونکے کس طرح آدمی کی زندگی کو تتر بتر کرتے ہیں۔ کچھ ایسی زہریلی ہوائیں چلیں کہ انسان آن کی آن میں ایک دیش سے دوسرے دیش میں منتقل

ہونے کے لیے مجبور ہو گیا۔ خیر یہ ایک الگ داستان ہے۔ آپ کو بھی مہاجرت کی زندگی گذارنی پڑی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اپنے وطن عزیز سے دور رہ کر بھی آپ نے اپنی قلمی کاوشوں کو جاری رکھا ہوگا اور اپنے علم و فکر کے چشموں سے شعر و شاعری کے دُر ہائے بے بہا نکالے ہوں گے۔ اپنی کچھ تخلیقات اگر آپ بذریعہ ڈاک بھیج سکتے ہیں تو راقم الحروف اس سے مستفید ہو جائے گا۔ میری طرف سے اپنے اہل خانہ کو پُر خلوص سلام عرض کریں۔

نیاز مند

بشیر احمد شاکر

Mirza Bashir Ahmad Beigh Shakir
C/o: Seven Star Family Shop
Rajouri Kadal
P.O: S.R.Gunj
Srinagar 190002 Kashmir
M.No: 9797155146

نوٹ: نوشہرہ کے بجائے میں نے اپنا ایڈرس راجوری کدل لکھا ہے تا کہ ڈاک ملنے میں آسانی ہو سکے۔ ورنہ میری رہائش منڈی بل نوشہرہ میں ہے۔

جسٹس جاوید اقبال صاحب

محترم المقام جسٹس جاوید اقبال صاحب
(فرزندِ ارجمند علامہ اقبال)

اَلسَّلامُ عَلَیکُم وَرَحمۃُ اللّٰہ!

امید ہے کہ آنجناب بخیر و عافیت ہوں گے۔ اس وقت یکا یک میری طبیعت آپ کے نام یہ خط لکھنے پر آمادہ ہو گئی حالانکہ ایک مدت سے یہ میری خواہش تھی۔ مگر دن اسی طرح گذرتے گئے۔

حضور والا! میں حضرت علامہ اقبالؒ کا ایک گرویدہ اور عقیدت مند ہوں۔ میں نے اپنی حیاتِ مستعار کے ۶۲ سال پیچھے چھوڑے ہیں۔ دورانِ تعلیم ہی میں علامہ کے نام اور کام سے واقف ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ شوق بڑھتا ہی گیا اور میں اپنی جگہ علامہ کا ہی ہو کر رہ گیا۔ جہاں کوئی کتاب ملتی ہے علامہ سے متعلق بس حاصل کرتا ہوں مجلّے، رسالے، اخبارات کے خصوصی نمبرات، ضمیمے، تراشے سب اپنے پاس اپنی لائبریری میں جمع کیے ہیں۔ مرحوم پروفیسر اکبر حیدری کی وساطت سے پاکستان سے زندہ رود، اپنا گریبان چاک اور مے لالہ فام منگا کر تینوں کتابوں کا انہاک کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اقبالیات پر میرے پاس کوئی تین سو سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔ شعر و شاعری کا بھی شغف رکھتا ہوں۔

حضرت علامہؒ سے متعلق اپنی کشمیری زبان اور اردو میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔ میرے کئی خطوط اکبر حیدری کے حکیم الامت والے رسالوں میں چھپ چکے ہیں اور ان رسالوں میں، میں نے آپ کے مضامین و مقالات اور خطوط کا بھی مطالعہ کیا ہے۔

حکیم الامتؒ علامہ اقبال کی محبت مجھ پر اس قدر غالب آ گئی کہ سال رواں کے اپریل مہینے میں راقم نے ویزا حاصل کر کے لاہور کا رُخ کیا اور اپنے جذبات اور عقیدت کی سوغات لے کر میں مقبرہ علامہ اقبال پر حاضر ہو گیا۔ مدتوں کی آرزو پوری ہو گئی اَلْحَمْدُلِلّٰہ۔ آیاتِ بینات، درود اور دعا کے بغیر میرے پاس تھا ہی کیا جو میں اس مردِ قلندر کی بارگاہ میں پیش کرتا۔ اس خط میں کہاں گنجائش ہے کہ ساری تفصیل لکھوں۔ بھاٹی دروازہ کے بارے میں معلوم کیا۔ وہاں بھی پہنچا اور باہر سے ہی علامہ کے اس پرانے چھوٹے سے مکان کا نظارہ کیا جہاں وہ قیام کرتے تھے۔ علامہ کی یادگار چیزیں وغیرہ دیکھنے کی تمنا تھی مگر صحیح راہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے یہ دیکھ نہیں پایا۔ آج کل میرا

یہ سفرنامہ دورۂ پاکستان، جو کہ آمد و رفت سمیت فقط پانچ روز پر مشتمل تھا۔اس کی روئیداد یہاں کے مقامی اخبار کشمیر عظمیٰ میں نکل رہی ہے اوراس کی کئی قسطیں شائع ہو چکی ہیں۔

گلبرگہ لاہور پہنچ کر آپ کے ساتھ ملاقات کرکے سعادت حاصل کرنے کی شدید خواہش تھی مگر کئی مجبوریوں کی وجہ سے میری یہ خواہش دب کر رہ گئی۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
(غالبؔ)

جناب محترم! اب یہ ناچیز خط آپ کے نام سپرد قلم کر کے اپنی تسلی کر رہا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آپ ضرور اس خط کو پڑھ کر اپنے ہاتھ سے جواب لکھ کر مجھے مشرف فرمائیں گے۔اگر اپنا جوانی کا یا اور کوئی فوٹو گراف بھی خط کے ساتھ روانہ فرمائیں گے تو یہ آپ کی طرف سے ایک شیدائی اقبالؔ کی دلجوئی کا سامان ہوگا۔ (کتابوں کا تو میں عاشق ہی ہوں) یہاں کے کئی اقبال شناسوں کے ساتھ میری شناسائی ہے۔مثلاً پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر بشیر احمد نحوی، مشتاق احمد گنائی وغیرہ۔آپ کی مصروفیات اور عدیم الفرصتی کا بھی مجھے احساس ہے۔مگر اس بات سے میرا حوصلہ بڑھ گیا ہے کہ علامہ کی خدمت میں ادنیٰ و اعلیٰ شخصیات کو حاضر ہونے کی بالکل اجازت تھی اور میں اس ناچیز خط کے ذریعہ اپنے آپ کو علامہ اقبال کی بارگاہ میں ہی حاضر تصور کروں گا۔رسالہ حکیم الامت بابت اکتوبر،نومبر ۲۰۱۲ء اکبر حیدری نمبر میں آنجناب کو میری چند نگارشات نظر سے گذریں گی
والسلام۔

مرزا بشیر احمد شاکرؔ
نوشہرہ
تحریر ۳۰؍نومبر ۲۰۱۲ء رات ۱۰ بجے

منیرہ (دختر علامہ اقبالؒ)

محترمہ و مکرمہ بیگم منیرہ صاحبہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔

گزشتہ سال یعنی مارچ 2014ء میں لاہور گلبرگہ پہنچ کر آپ کے ساتھ ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔مگر آپ کے گیٹ پر تعینات سیکورٹی والے نے مختلف حیلوں اور بہانوں سے اندر آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔آپ کی طرف سے مجھے اس بارے میں ایک تشفی بخش جوابی خط مل چکا ہے۔خیر انسان کی ہر خواہش پوری بھی نہیں ہوتی۔مستقبل میں دوبارہ آجانے کی امید رکھتا ہوں۔انشاء اللہ اطلاع پاکر آپ سے یہی توقع ہے کہ آپ شرف ملاقات سے ضرور نوازیں گی۔

آپ کے برادرِ محترم جناب جسٹس جاوید اقبال کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کا وقت دیا تھا۔ان یاداشتوں پر مشتمل ایک مضمون لکھ چکا ہوں جو کہ ایک ادبی رسالہ حکیم الامت جون 2015ء میں چھپ چکا ہے اور جاوید اقبال کے ساتھ لی گئی تصویر بھی اس میں موجود ہے۔آپ کے مطالعہ کے بعد دبستانِ اقبال کیلئے اس رسالہ کو محترم جاوید اقبال کی وساطت سے آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔بمہربانی رسیدگی اور خط کے جواب سے ایک اور بار نوازیئے۔چونکہ آپ حکیم الامت، دانائے راز حضرت اقبال کی سعادتمند صاحبزادی ہیں، جو کہ میرے لئے باعث صد افتخار ہے،
والسلام۔

خط و کتابت کیلئے پتہ
مرزا بشیر شاکر
نوشہرہ، سرینگر کشمیر
No: 9419674210

ڈاکٹر فرید پربتی

محترم ومکرم ڈاکٹر فرید پربتی صاحب

سلام مسنون!

ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے (فیض)

آنجناب کی کرم فرمائی سے ''شاعر'' دسمبر ۲۰۰۵ء کی ورق گردانی کا موقعہ میسر ہوا۔ اس شمارہ کے سرورق پر آپ کی دیدہ زیب اور جاذب نظر تصویر نظر آتی ہے۔ شکل وصورت بالکل گلاب کے مشابہ ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ اندر مشاہیر اردو ادب کے آپ کی شخصیت' ادب پروری' شاعری وغیرہ پر تاثرات پڑھ لیے سبحان اللہ۔ اردو زبان وادب کے دانشوروں اور ادیبوں نے گویا آپ کو اپنی طرف سے سند عطا کی ہے۔ محمد یوسف ٹینگ اور حامدی کاشمیری کے علاوہ برصغیر کی مسلمہ ادبی شخصیات نے اپنی گرانقدر رائے اور آپ کے روشن مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ ہیچ میدان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس میں شکر گذار ہے کہ آپ جیسی ادب پرور اور انسان دوست شخصیت سے شناسائی ہوگئی ہے۔ آپ صوفیانہ گھرانے اور علمی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں یہ میرے لیے کچھ زیادہ ہی اطمینان بخش ہے۔ مجھے امید ہے کہ بقدر ظرف وقتاً فوقتاً آپ سے استفادہ کرتا رہوں گا۔ آپ کے رباعیوں کی مجھے تلاش رہے گی۔

ہاں احمد ندیم قاسمی مرحوم کی مولانا محمد علی جوہرؔ کے بارے میں کہی گئی نظم فی الحال بھول گیا اور آپ کی نظم ''سرمد کے مزار پر'' پڑھنے کی تشنگی بڑھ گئی۔ امید ہے کہ آپ ساقی بن کر میری پیاس بجھائیں گے ؎

عاشقی صبر طلب ہے اور تمنا بے تاب

جناب عالی! آپ ہی کا ایک شعر آپ کی نذر کرتا ہوں۔

میری تو پیاس بجھے گی تیرا کیا جائے گا
والیٔ آب نہ یوں دل کو دُکھا پانی پر

دُعا گو

مرزا بشیر شاکر

پوسٹ ماسٹر کشمیر یونیورسٹی سرینگر

مورخہ ۱۹ جولائی ۲۰۰۶ء

ایڈیٹر صاحب ''البلاغ'' کراچی

نوشہرہ سرینگر کشمیر

۲۰ اکتوبر ۱۹۸۵ء

مکرمی ومحترمی ایڈیٹر صاحب ''البلاغ'' کراچی

اَلسَّلَامُ عَلَیکُم وَرَحْمَتہُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہ'

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اس ناچیز خط سے قبل بھی قریباً ایک مہینہ پہلے دو عدد پوسٹ کارڈ آپ کی خدمت روانہ کیے ہیں اور قوی امید ہے کہ آنجناب کی خدمت میں پہنچ گئے ہوں گے مگر آج تک مجھے بڑی بے صبری کے ساتھ جواب کا انتظار ہے طویل انتظار کے بعد آج آپ کی خدمت میں دوسری بار یہ خط لکھنے پر مجبور ہوا۔ خدا کے فضل وکرم سے یہی امید ہے کہ میرا یہ ناچیز خط پاتے ہی آپ اس کا جواب مرحمت فرمائیں گے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی عقیدت میرے دل میں ہے۔ کئی مہینوں سے ان کی تفسیر ''معارف القرآن'' کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتا ہوں جس کی وجہ سے ان کی عقیدت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صاحب موصوف کی اور بھی کئی کتابیں اپنے پاس محفوظ کرلی ہیں۔ میں اپنے آپ کو بھی سعادت مند تصور کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے بھی ان کی تصانیف کا ذوقِ مطالعہ عطا کیا مگر اس ذوقِ کے ساتھ ساتھ میرے دل میں

اُن کی سیرت اور سوانحی حالات تفصیل سے جاننے کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔ اُن کے ذوق ومزاج اور اجمالی سیرت وغیرہ کے علاوہ علمی کمالات جاننے کا شوق ہے۔

چنانچہ ہندوستان میں بھی میں نے بہت سے اداروں کو اس بارے میں لکھا اور ان کی سوانح پر کوئی کتاب موجود ہونے کے بارے میں دریافت کیا۔ ساتھ ہی ساتھ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت سے بھی متعلق کوئی کتاب روانہ کرنے کے لیے لکھا۔ مگر کسی بھی ادارہ کی طرف سے مجھے کامیابی نہ ہوسکی۔ جناب والا کی خدمت میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور معلوم ہوا ہے کہ ''البلاغ'' کا مفتی اعظم نمبر بھی شائع ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مفتی اعظم نمبر میں ان کی باغ و بہار شخصیت پر بہت سارے اہل قلم کے مضامین ہوں گے اور خاص کر ان کے قریبی احباب نے بھی ان کی عالمانہ شخصیت کو طرح طرح کے عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہوں گے۔ خیال ہے کہ ان کی زندگی کے بہت سارے پہلو منظر عام پر آئے ہوں گے۔ شاید ان کی شب وروز کی مصروفیات بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے حالات کے علاوہ تجہیز وتکفین تک کے حالات بھی اس نمبر میں چھپ چکے ہوں گے۔ مجھے یہ حالات جاننے کا زبردست شوق ہے۔ کیا آپ مجھ جیسے ادنیٰ عقیدت مند کو یہ حالات جاننے کا موقعہ فراہم کریں گے۔ مجھے یہی امید ہے کہ آپ میرے جذبات کی قدر فرما کر اس ناچیز خط کو نظر انداز نہیں کریں گے اور کسی بھی صورت میں مفتی اعظم نمبر کی کاپی میرے درج ذیل ایڈرس پر روانہ فرمائیں گے۔

''شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را''

یہ بھی التماس ہے کہ آپ مجھے اطلاع دیجئے کہ کیا ''البلاغ'' میرے نام جاری کر سکتے ہیں تاکہ میں بھی آپ کے اس نیک کام میں شریک ہو جاؤں۔ میرے لیے سالانہ فیس کیا ہے اور یہ فیس بھیجنے کا کیا طریقہ ہے۔ اگر ''البلاغ'' کے کچھ شمارے دفتر میں موجود ہوں تو بمہربانی ''مفتی اعظم نمبر'' کے ساتھ یہ بھی روانہ کریں اور یہ سب چیزیں بذریعۂ رجسٹرڈ ڈاک روانہ فرمانے کا بندوبست ہو۔ ان کتابوں کی جو بھی قیمت ہوگی انشاء اللہ قواعد کے تحت روانہ کروں گا۔ دعا ہے کہ خداوند کریم آپ کو اجر عظیم سے نوازے آمین۔ والسلام۔

نیازمند

بشیر احمد بیگ شاکر

میرا پتہ نوٹ فرمائیے:

بشیر احمد بیگ شاکر

محلہ لکھری پورہ نوشہرہ

ڈاک خانہ نوشہرہ سرینگر ۱۹۰۰۱۱

کشمیر۔ ہندوستان

نسرین نقاش

تحریر ۸/نومبر ۲۰۱۱ء

محترمہ نسرین نقاش صاحبہ

ایڈیٹر بین الاقوامی ''صدا''، سرینگر

سلام مسنون!

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

بہت مہینوں سے آپ کا ادبی رسالہ صدا نظروں سے نہیں گذرا ہے۔ مجھے بس ایک یا دو شمارے ہی حاصل ہو چکے ہیں۔ جہاں تک اس رسالے کا تعلق ہے میری رائے میں موجودہ دور میں یہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا معیار بہت ہی اونچا ہے۔ رسالہ میں درج مضامین اور منظومات ادبی اور علمی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

آج کے زمانے میں جب کہ اردو زبان کے تئیں بے رخی برتی جاتی ہے اور چاروں طرف سے اس زبان پر مسموم

ہواؤں کے جھونکے چل رہے ہیں۔ آپ کا اردو زبان میں یہ رسالہ قائم ودائم رکھنا کارے داردوالا معاملہ ہے۔ میری نظروں میں نسرین جی نے ایک قندیل روشن کی ہے اور شائقین اردو کے لیے اندھیرے میں چراغ جلا کر آگے بڑھنے کا بندوبست کیا ہے۔ اس مشعل کی فروزانی اور روشنی سے اردو زبان وادب کا گلستان اپنی گوناگوں رنگین نظاروں سے نظروں کو چکا چوند کر تا رہے گا۔ اللہ آپ کو اور زیادہ اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے کی توفیق دے۔

اس ناچیز خط کے ساتھ ''کتابیں'' عنوان کے تحت ۳۱ اشعار پر مشتمل نظم روانہ کررہا ہوں اور التماس کررہا ہوں کہ اس کو مکمل طور پر اپنے رسالہ ''صدا'' میں شامل اشاعت کریں تاکہ قارئین حضرات کو یہ نظم اپنی پوری توانائی اور رقد وقامت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرسکے۔ یا میری کم مائیگی نظر آئے۔ 'صدا' کے کسی گذشتہ شمارے میں اس نظم کے سارے اشعار شائع نہیں ہوسکے ہیں۔ جس کی وجہ سے راقم کی تشنگی بھی باقی رہ گئی ہے۔ والسلام۔

دعا گو

مرزا بشیر احمد شاکر

نوشہرہ سرینگر

عبدالرشید

۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ء

محترم عبدالرشید صاحب

(نیوز ریڈر)

اَلسّلامُ عَلَیکُم!

میں قریباً پچھلے ۲۰ برسوں سے آپ کی آواز میں خبریں ریڈیو کشمیر سرینگر سے سنتے آیا ہوں اور آپ کی آواز سے بالکل مانوس ہوچکا ہوں۔ سرینگر ٹائمز کے آٹھویں ستمبر کے شمارے میں آپ کی سرینگر سے تبدیلی کے بارے میں پڑھا۔ کل مورخہ ۱۵ ستمبر کو صبح 8.50 منٹ پر آل انڈیا ریڈیو سے آپ کی آواز میں خبریں سننے کا موقعہ ملا۔ نہ جانے آپ کی آواز سن کر میں کیوں کئی یادوں میں کھو گیا۔ یوں تو کئی دیگر کشمیری نیوز ریڈروں کی زبانی بھی خبریں سنا کرتا تھا مگر میں سرسری طور ہی گذر جاتا تھا۔ آپ کی یہاں سے تبدیلی کی وجہ سے مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ میرا کوئی قریب ترین رفیق میری نظروں سے کہیں دور چلا گیا ہے۔ حالانکہ مجھے آنجناب کو قریب سے بھی دیکھنے کا موقعہ بھی نہیں ملا ہے۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ زندگی میں ایک بار خانقاہ نقشبندیہ (خواجہ بازار سرینگر) میں آپ غالباً حضرت نقشبندؒ صاحب کے عرس پر ان کے ملفوظات پڑھ کر سنا رہے تھے۔ مگر بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے آپ کو قریب سے نہیں دیکھ پایا تھا اور آواز پہچان کر آپ کی شخصیت کا اندازہ کرسکا۔ بس آج تک صرف ریڈیو کے رابطہ سے آپ کو جانتا ہوں اور غائبانہ طور جاننے کے باوجود بھی آپ کو نزدیک پارہا ہوں۔ گویا برسوں سے آپ کا غائبانہ شناسا ہوں۔

محترم آپ یقین جانیئے کہ اپنے جذبات سے بے قابو ہوکر آپ کے نام یہ ناچیز خط لکھنے پر مجبور ہوگیا اور حب الوطنی کے جذبے کے تحت یہ سطریں قلم سے نکل گئیں۔ پتہ نہیں اگر میرا یہ ناچیز خط آپ کو موصول ہوجائے گا تو آپ کیا نتیجہ نکالیں گے۔ دہلی میں آپ کی تبدیلی کا معیاد کتنا ہے؟ مجھے آپ کا رہائشی پتہ بھی معلوم نہیں ہے۔ اب میں اس خط کو ریڈیو کے پتہ پر ہی روانہ کررہا ہوں۔ مناسب سمجھیں تو اس خط کا جواب دیجئے درج ذیل ایڈرس پر لکھیں۔

خدا آپ کو ہر حال میں سلامت رکھے۔ آمین!

پتہ: مرزا بشیر احمد بیگ

لکھری پورہ' ڈاک خانہ نوشہرہ سرینگر

ڈاکٹر سعید اختر دُرانی

تحریر 25-11-2007

محترم المقام وعالی جناب ڈاکٹر سعید اختر دُرانی صاحب

اَلسَّلامُ عَلَیکُم وَرَحمَۃُ اللہِ وَبَرکاتہ

امید قوی ہے کہ آنجناب بخیر وعافیت ہوں گے

راقم الحروف پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کے ماہنامہ رسالہ حکیم الامت کا مستقل قاری ہے۔ راقم نے آج کے حالیہ شمارے بابت نومبر ۲۰۰۷ء میں آپ کے مسلسل مضمون ''اقبال کی اردو زبان اور حاجی محمد خان کی آخری قسط کا بھی مطالعہ کیا۔ دورانِ مطالعہ مضمون بہت ساری علمی اور ادبی سرگرمیوں اور موشگافیوں سے لطف اندوز ہوگیا۔ اقبال کی صحتِ زبان اور اس زمانہ کے ناقدین اقبال کی رائے زبان کی درستگی اور ہنگاموں سے واقف ہوگیا۔ مضمون بہت ہی اہمیت کا حامل ہے اور اس کی علمی وادبی افادیت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آپ نے کتنی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اپنے نانا جان مرحوم حاجی محمد خان کی ادب دوستی اور علمی سرگرمیوں سے آپ نے پردہ اٹھایا ہے اور رشائقین اقبال کے لیے آپ نے قابل قدر اور گرانمایہ کام انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی اپنے نانا کے فوٹو سے بھی قارئین کو آپ نے واقف کیا ہے۔

> آپ نے کتنی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اپنے نانا جان مرحوم حاجی محمد خان کی ادب دوستی اور علمی سرگرمیوں سے آپ نے پردہ اٹھایا ہے او رشائقین اقبال کے لیے آپ نے قابل قدر اور گرانمایہ کام انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی اپنے نانا کے فوٹو سے بھی قارئین کو آپ نے واقف کیا ہے۔

دراصل یہ سائنسی علوم اور مزاج کے ساتھ ساتھ آپ کی اردو دانی کا بھی بین ثبوت ہے۔

این کار از تو آید و مردان چنیں کنند

محترم ومکرم! آج کی آخری قسط پڑھ کر آج اسے کوئی سو سال پہلے کی ڈاک رسانی کے انتظام کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ اسی مضمون میں چھ پوسٹ کارڈوں کی تفصیل' ان کی روانگی کا وقت اور تاریخ اور وصول ہونے کی تاریخیں بھی درج ہیں۔ کیسا بندوبست رہا ہوگا محکمہ ڈاک کا برصغیر ہندو پاک میں' ذرا غور کرنے کا مقام ہے اور آج کیا ہے۔

چونکہ راقم السطور بھی محکمۂ ڈاک میں ملازمت کرتا ہے اور ایک ادنیٰ عہدے پر بحیثیت پوسٹ ماسٹر تعینات ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علم وادب کا مشغلہ بھی رکھتا ہے۔ اقبالیات پسندیدہ مشغلہ ہے۔ آپ کا مضمون میرے لیے بصیرت افروز ہے اور راہنمایانہ رول ادا کرسکتا ہے۔

میں بصد احترام وعجز ونیاز آپ سے درخواست کررہا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو متذکرہ بالا چھ عدد پوسٹ کارڈوں کی فوٹو سٹیٹ میرے نام روانہ فرما کر شکریہ کا موقعہ بخشیں کیونکہ میری ان چیزوں سے دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ میں نہ صرف ان کو محفوظ رکھوں گا بلکہ دفتری کام کاج میں استفادہ بھی کرسکوں گا۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ کتاب نوادرِ اقبال یورپ میں کا بھی ایک نسخہ چاہیے۔ میرا قلب وذہن یہ پاکر مسرور ہوگا اور آپ کے لیے ہمیشہ دعا گو رہوں گا۔ اپنی بلند وبالا علمی شخصیت سے مجھ ناچیز کے جذبات کی آپ شاید قدر فرمائیں گے۔

وَالسَّلام۔

مرزا بشیر احمد بیگ شاکر

ساکنہ شہجار کالونی (منڈی بل)

ڈاک خانہ نوشہرہ سرینگر۔ 190011 کشمیر

عبدالمجید کھانڈے

(ڈپٹی کمشنر، کپواڑہ)

مکرم ومحترم عبدالمجید کھانڈے صاحب

اَلسَّلامُ عَلَیکُم!

یادِ ماضی عذاب ہے یارب

مجھے یہ کل ہی کی بات لگتی ہے کہ کئی سال قبل ہم اکٹھے سرینگر جنرل پوسٹ آفس میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ زمانہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم کچھ وقت نکال کر ڈاک خانہ سے باہر شیر کشمیر پارک میں چہل قدمی کرتے تھے اور آپس میں ایک دوستانہ ماحول میں گپ شپ کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہم بنڈ والی سڑک پر بھی چند قدم نکالتے تھے اور بھی کئی دوست ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ بہر حال زمانے کا تیز رفتار گھوڑا سرپٹ دوڑتا رہتا ہے اور پیچھے کی طرف نظر بھی نہیں اٹھاتا ہے۔

وَخ چھُ جَکھ جَکھ کرُن وتہ رُولر
ٹھول کُس کرِ اَتھ فولادس ست

میرے دوست! کل رات ریڈیو سننے کا اتفاق ہوا۔ ساڑھے نو بجے سے ٹھیک دس بجے تک بحیثیت ڈیولپمنٹ کمشنر (Development Commissioner) کپواڑہ ہمایوں قیصر کے ساتھ آپ کا انٹرویو سنا، بہت محظوظ ہوگیا۔ آپ کے بول چال میں کافی مہارت تھی اور مجھے سنتے سنتے دوستی کی وہ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ اس بڑے عہدہ پر فائز ہونے کے لیے میں آپ کو اپنی طرف سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ترقی کے اور بھی مواقع نصیب کرے۔ غلام رسول نجار کی زبانی آپ کے بارے میں پہلے ہی واقفیت ہوگئی تھی ان دنوں آپ AC پلوامہ تھے۔ ایک روز غلام محمد وانی ساکنہ کھریو کے ہاں شادی کے موقعہ پر ہم وہاں جمع ہوگئے تھے۔ آپ کے ساتھ کام کرنے والے کسی ملازم کے ساتھ بھی ملاقات ہوگئی تھی میں نے اُس روز بھی اپنی طرف سے سلام بھیجا تھا۔

کل کے ریڈیو پروگرام نے مجھے آپ کے نام یہ خط سپرد قلم کرنے کی تحریک بخشی۔ ویسے بھی میرا ایک مشغلہ ہے۔ قلم کاروں، ادیبوں، بزرگوں اور دوستوں کے ساتھ خط وکتابت اور جوابات کی وصولیابی، آئندہ یہ خط وکتابت کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے اور آنجناب کے نام آج کا یہ خط بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

میرے محترم!

یہ خط پا کر شاید آپ کی پرانی یادیں بھی تازہ ہوجائیں گی اور امید ہے کہ آپ بھی مجھے خط کا جواب لکھ کر دوستی کا حق ادا کریں گے۔ ایک دوست کے ناطے یہ بھی کہوں گا کہ دنیاوی منازل طے کرکے اور ترقی کرکے بھی آدمی کو عدم آباد کی طرف کوچ کرنا ہے۔ یہ دنیا کی رونقیں یوں ہی رہ جائیں گی۔ اگر ہم دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ آخرت کی بھی فکر کریں تو یقیناً اس میں ہماری کامیابی کا راز مضمر ہے۔ میں بھول گیا ہوں کہ آپ کی رہائش کس جگہ ہے اور آپ کشمیر میں کس جگہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذرا یہ بھی لکھیں۔

میری نیک تمنائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔

والسلام۔

بشیر احمد بیگ
سب پوسٹ ماسٹر
ڈاک خانہ نوشہرہ سرینگر 190011
۱۴ رفروری ۲۰۰۴ء

مراسلہ بنام 'آجکل نئی' دھلی

حسب عادت دو ایک روز قبل ماہنامہ رسالہ 'آجکل' بابت مارچ 2024 خریدا۔ ہاتھ میں لیتے ہی رسالہ کی خوبصورتی اور ٹائٹل کی رنگینی سے دل بہت متاثر ہوا۔ اس پر ساحر لدھیانوی

کی تصویر بھی دی گئی ہے اوراس کے نیچے ساحر کی یوم پیدائش بھی لکھا گیا ہے۔ رسالہ 'آجکل' ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس میں شامل اندرونی مواد چاہے نثر کی صورت میں ہو یا منظوم صورت میں ہر لحاظ سے قابل مطالعہ ہوتا ہے۔ دراصل اردو زبان وادب کا یہ ماہنامہ کوئی نامولود تو نہیں ہے۔ اسکی اپنی ایک الگ پہچان ہے، اور ادب کی تاریخ میں یہ رسالہ سالہا سے جاری وساری ہے۔ کتنے ہی ایڈیٹر صاحبان آئے بھی اور وہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے مگر ہر ایک نے اپنی محنت اور لگن سے اس اردو رسالہ کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوششیں کیں۔ جس کا ثبوت 'آجکل' کے ٹائٹل والے اندرونی صفحہ سے ملتا ہے کہ آپ ہر ماہ اس کی پرانی فائلوں سے کچھ نہ کچھ مواد چھاپ کر قارئین کے ذوق کی آبیاری کرتے ہیں۔

یہ ان حضرات کے خلوص اور دیانتداری کا نتیجہ ہے کہ سالہا سال سے یہ ادبی جریدہ اپنے سفر پر کسی تھکاوٹ یا سستی کے بغیر گامزن نظر آتا ہے۔ اب جب کہ یہ رسالہ آپ کی ادارت میں منظر آم پر آیا ہے تو توقع یہی ہے کہ یہ کامیابی اور کامرانی کی اونچی منزلیں بحسن وخوبی طے کرتا ہی رہے گا۔ آپ کے ساتھ کام کرنے والے دیگر ممبران بھی مبارکباد کے مستحق ہیں جن کے نام رسالہ میں درج ہوتے ہیں۔

حالیہ شمارہ میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی وفات کی خبر پڑھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ راقم الحروف نے فروری 2016 میں ان کے ساتھ ان کے دولت خانہ پر ملاقات کی تھی۔ بہت ہی مہمان نواز اور شریف آدمی تھے۔ انھوں نے میری بہت مہمان نوازی کی تھی۔ اپنی کچھ کتابیں مرحمت فرمائی تھیں۔ ان کے ساتھ مجھے خط وکتابت کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ رخصتی کے وقت کتابوں کا بنڈل خود ہی اٹھا کر باہر تک نکلے تھے، مگر احتراماً میں نے ان کے ہاتھ سے بنڈل چھین لیا تھا۔ اقبالیات پر ناقابل فراموش کام کیا ہے۔ بہر حال موت ایک اٹل حقیقت ہے، اس سے مفر ممکن نہیں۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

ایسے ہی یہاں اپنے ملک ہند میں منور رانا کا انتقال بھی ایک سانحہ ہے۔ منور رانا جیسے شاعر بہت مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔ اردو کے تئیں ان کی خدمات کو کون بھلا سکتا ہے۔ ماں کی عظمت کا بیان ان کی شاعری کا بہت ہی قابل داد حصہ ہے۔ مہاجر نامہ بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر رؤف خیر کا مضمون بعنوان 'منور رانا' ایک قابل مطالعہ مضمون ہے۔ اس میں قلمکار نے اچھے ڈھنگ اور بہترین انداز سے انکی شعروشعری کا جائزہ لیا ہے، اللہ ان کو بھی مغفرت کرے۔

اس کے علاوہ دیگر نگارشات بھی عمدہ ہیں، گو کہ ابھی راقم نے انکا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ آجکل کے رسالے کا سائز گھٹا کر مجھے یہی لگ رہا ہے کہ اسکی زیب وزینت میں نکھار آ گیا ہے۔ کاغذ معیاری استعمال کیا جاتا ہے اور اوراقِ جریدہ کو مختلف رنگوں سے سجا کر قارئین کی دلچسپی کو بھی نظر میں رکھا جاتا ہے۔ آج کل سائنس اور ٹیکنالوجی اپنے عروج پر ہے، اسلئے علمی وادبی معلومات میں بھی تبدل وتغیر ایک لازمی چیز بن گیا ہے۔

ہاں! اپنی طرف سے ملتمس ہوں کہ کتابوں پر جو تبصرے شامل ہوتے ہیں ان میں کم سے کم تبصرہ نگار یا مصنف یا صاحب کتاب کا موبائل نمبر لکھنے کی بھی زحمت گوارا کریں تاکہ مجھ جیسا کتابی شوقین اور مطالعے کا ذوق رکھنے والا موبائل فون پر مصنف یا پبلشر وغیرہ سے رابطہ کر کے کتاب حاصل کر سکے۔

مثال کے طور پر سہ ماہی رنگ کا عالمی خواتین نمبر پر تبصرہ اور دیگر کتابوں پر تبصرہ کوئی اتہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ کتاب کیلئے کس کے ساتھ اور کس طرح رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ میری طرف سے ایک حقیر گزارش ہے۔

باقی اردو زبان وادب کیلئے اس زوال پذیر زمانے میں آپ جیسے غمگسار یقیناً قابل ستائش ہیں کہ مسموم ہواؤں کے چلتے بھی آپ اپنی محنت اور جانفشانی سے اردو کی اس قندیل کو تابان و فروزان رکھنے کا کام شدومد سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

بشیر شاکر

مراسلہ بنام "کونگ پوش" پانپور

مکرمی ایڈیٹر صاحب ''کونگ پوش'' پانپور سرینگر

سلام عقیدت

آفتاب میں اشتہار دیکھا جس میں ادب نواز حضرات سے اپنی نگارشات بھیجنے کیلئے دعوت دی گئی ہے۔ مسرت ہوئی مجھے کوئی شاعر یا ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں البتہ ذوقِ ادب رکھتا ہوں، اور کبھی کبھار مشقِ سخن بھی کرتا ہوں۔ آپ کے حسب ارشاد ایک رباعی اور غزل ارسال خدمت ہے۔ اگر پسند آئے تو ''کونگ پوش'' میں شائع فرمائیں۔ استدعا ہے کہ ناچیز کو بھی شائع ہونے پر یا اس سے قبل اطلاع دیجئے۔ زیادہ بہتر ہوگا کہ کونگ پوش کا شمارہ ہی روانہ فرمائیں۔ رسالہ ملنے پر قیمت کی ادائیگی بھی کروں گا۔ دفتر کا ٹیلیفون نمبر اس طرح ہے۔

۷۶۴۲۹......والسلام

(نوٹ:- سن ۱۹۸۳ کا لکھا ہوا خط)

بشیر احمد بیگ شاکر

لکھری پورہ، نوشہرہ سرینگر-۱۹۰۰۱۱

آفتاب کی گولڈن جوبلی پر خیر سگالی کے پیغامات

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکران کیلئے

آج کل مؤقر اخبار کے جشن زرین منانے کی تیاریاں شدت سے جاری ہیں اور اس تاریخی نوعیت کے جشن کی تاریخ ۲۷/ اگست ۲۰۰۶ء مقرر ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں وادی کے طول وعرض سے اہل علم حضرات کے گراں قدر تاثرات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اصحاب علم ودانش نے اخبار آفتاب اور بابائے صحافت محترم ومکرم خواجہ ثناء اللہ بٹ صاحب مدیر آفتاب کی صحافتی اور ادبی وعلمی خدمات کی صحافتی اور ادبی وعلمی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا ہے اور اپنے بیش بہا خطوط کے ذریعہ اس مؤقر اخبار کا جائزہ لیا ہے۔ چند ایک شاعر حضرات کا منظوم کلام بھی شامل اشاعت ہوگیا ہے جس میں جناب سلطان الحق شہیدی کی پچاس اشعار پر مشتمل ایک پر مغز اور فنی اعتبار سے ایک مکمل نظم بھی شائع ہوگئی ہے۔ اخبار کی وساطت سے ایسی شایانِ شان نظم لکھنے پر سلطان الحق شہیدی کو اپنی طرف سے خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ جناب حسن ساہو ساکن بمنہ کا اخبار آفتاب سے متعلق مضمون بھی تاریخی نوعیت کا ہے اور بہت ہی دلچسپ ہے۔ امید ہے کہ جشن زرین کی تاریخ نزدیک آنے تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ منقول ہے کہ ؎

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

دراصل یہ اخبارِ آفتاب مدیر محترم کا خلوص نیت ہے کہ بیشمار لوگوں اور قدرشناس حضرات نے حقیقت کا برملا اظہار کیا ہے۔ آفتاب کی تحریریں پڑھنے والوں کی دل کی آواز ہے۔ اس پر کتنا اور کیا کچھ لکھا جائے اس کیلئے فرصت اور وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے۔

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکران کیلئے

میری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مؤقر اخبار کے مدیر ذی وقار اور دیگر وابستہ ارکان اخبار کو سلامت رکھے اور نظر بد سے بچائے۔ زیادہ سے زیادہ علمی اور صحافتی خدمت کرنے کی توفیق عطا کرے، آمین۔۔۔۔۔۔مرزا بشیر احمد بیگ شاکر

خوشبو جیسے لوگ ملے افسانے میں
ایک پرانا خط کھولا انجانے میں
گلزار

چند جوابی خطوط
بنام
بشیر احمد شاکر

پروفیسر اکبر حیدری صاحب کا جواب:

جناب بیگ صاحب: تسلیمات:

مورخہ: 22-03-2004

گرامی نامہ مورخہ ۲۶ جنوری سال رواں تقریباً تین مہینے کے بعد مجھے موصول ہوا۔ یاد آوری کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ میں ہر سال نومبر کی ابتداء میں اپنے علمی اور تحقیقی کاموں کے لیے لکھنؤ جاتا ہوں۔ وہاں پرانے کتب خانے ہیں اور چار پانچ مہینے اس سے استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ میں ۱۸ مارچ سرینگر پہنچ گیا ہوں۔ پہنچتے ہی آپ کا خط دیکھ کر مسرت ہوئی۔ خط کا جواب دینا میرا اخلاقی فرض ہے۔ آپ نے جوابی لفافہ لکھ کر مجھے شرمندہ کیا۔ آئندہ ایسی زحمت نہ کریں۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ کو میرا مضمون ''اقبال اور شاد حیدر آبادی'' پسند آیا۔ حالانکہ اس میں کتابت کی غلطیاں در آئی ہیں۔ میری کتابیں اور مضامین زیادہ تر پاکستان میں چھپتے ہیں۔ اب تک ستر (۷۰) سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ مضامین کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے۔ جب آپ کسی دن غریب خانے پر تشریف فرما ہوں گے تو اپنی آنکھوں سے یہ چیزیں دیکھ سکتے ہیں۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ آپ کے خط سے ہی مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرا متذکرہ بالا مضمون شیرازہ میں شائع ہوا ہے۔ میں نے ''کتاب گھر'' لال چوک سری نگر سے بیس روپے میں منگوایا۔ اس کے لیے کس سے شکایت کروں! کون کسی کی سنتا ہے۔

آپ نے شیرازہ کے حالیہ شمارہ میں ''اقبال کے آباواجداد'' پر مضمون پڑھا ہوگا۔ میں اس بات کی پُرزور الفاظ میں تردید کرتا ہوں کہ علامہ اقبال کے جدِ اعلیٰ لولی حاجی باشندۂ سپر تھے۔ اس موضوع پر میرے متعدد مضامین مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔

ایک مضمون انگریزی اخبار ''گریٹر کشمیر'' میں ۱۸ ستمبر ۲۰۰۳ء کو "Distorting Facts" کے عنوان سے شائع ہوا۔ آپ اسے ضرور پڑھئے گا۔ آج تک میری تحقیق کی تردید کسی سے نہ ہوسکی۔

''وائس آف کشمیر'' مورخہ ۴ نومبر ۲۰۰۳ء میں ایک اور مضمون میرا چھپ چکا ہے۔ یہ بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

اس کا عنوان ہے "Iqbal's conception of Nayabati Ilahi" اقبال کا تصور نیابتِ الٰہی۔ یہ مضمون علامہ اقبال کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال کو بہت پسند آیا۔ ان کی فرمائش سے اب اس موضوع پر کتاب لکھنا شروع کر دی ہے۔ آپ یہ مضمون دیکھ سکتے ہیں۔

علامہ اقبال اور غالب پر میری کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ایک کتاب کا نام ہے ''اقبال کی صحتِ زبان'' یہ کتاب پاکستان میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھی گئی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس کتاب کو بہت پسند کیا۔ غالب کی دو کتابوں پر پاکستان کے مشہور انگریزی اخبار "Dawn" اور اردو اخبار ''جنگ'' نے تبصرے شائع کیے ہیں۔ اگر آپ کے پاس فون ہے تو اس کا نمبر مجھے بتا دیجئے گا اور اگر ہو سکے فون سے ہی خط کی رسید سے آگاہ کیجئے گا۔

مزاج گرامی بخیرت ہوں گے۔ والسلام

مخلص: اکبر حیدری

پروفیسر اکبر حیدری کا ایک اور خط بنام مرزا بشیر احمد بیگ شاکر

ہمدانیہ کالونی بمنہ
ڈاک خانہ بمنہ سرینگر
۲۴ جولائی ۲۰۰۴ء

میرے کرم فرما جناب بیگ صاحب

اَلسّلا م علیکُم

حوصلہ افزائی کے لیے ہمہ تن شکر گذار ہوں۔ عبدالصمد ککرو صاحب پر میرا ایک تفصیلی مضمون ''تعمیر''، سرینگر میں شائع ہو رہا تھا۔ اس میں میں نے ان کی ایک تقریر بھی قلمبند کی ہے جو انہوں نے سرینگر کے موقعہ پر ۱۹۰۸ء میں اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر میں کی ہے جلسے میں مولوی محمد یوسف شاہ نے بھی تقریر کی تھی۔ وہ اس وقت طالب علم تھے۔

شیرازہ میں، میں نے حاجی عبدالصمد ککرو کو فارسی شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ ہمیشہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کے جلسوں میں کشمیریوں کے تعلیمی کاز کو فروغ دیتے تھے اور علامہ اقبال کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کو ہمیشہ عزت افزائی فرماتے تھے۔

مجھے آپ کا فون نمبر، گھر کا، پوسٹ آفس نہیں مل رہا ہے۔ مہربانی کر کے فون نمبر اپنا لکھوادیں۔ میرا نمبر ہے 2491187۔ میری کئی تحقیقی کتابیں کلچرل اکادمی سرینگر نے شائع کی ہیں۔ ایک کتاب پاکستان میں چھپ رہی ہے۔ ایک کتاب اس وقت لکھ رہا ہوں۔ میری سبھی کتابیں تحقیقی ہوتی ہیں۔ اگر آپ یہ خط جو آپ نے مجھے لکھا ہے ایڈیٹر شیرازہ کو لکھا ہوتا وہ اسے شیرازہ میں شائع کرتا اور اچھا رہتا۔ آپ کی تحریر مجھے پسند آئی ہے آپ فاضلانہ اور عالمانہ انداز میں لکھتے ہیں۔

مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ والسلام

مخلص
اکبر حیدری

شمس الدین احمد

یونیورسٹی آف کشمیر، شعبہ فارسی
حضرت بل سرینگر کشمیر
سربراہِ شعبہ   مورخہ 03-6-1978

بھائی بشیر احمد بیگ صاحب

اَلسَّلامُ عَلَیکُم

دو روز قبل مجھے آپ کا خط مل گیا ہے۔ جواب آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کو میرا ترجمہ پسند آ گیا ہے۔ سعادت دارین حاصل کرنے کی امید کے علاوہ میری تمنا تھی کہ کشمیری ادب میں بالخصوص نثری ادب میں قابل قدر اضافہ ہو جائے۔ اگر آپ جیسے کشمیر اور کشمیری پرست اہل ذوق کو میری یہ خدمت پسند آئی ہے تو میں اس کو زندگی کا حاصل سمجھوں گا۔ اگر اللہ نے مجھے توفیق عطا فرمائی تو انشاء اللہ میں کشمیری ادب کی خدمت کرتا رہوں گا۔ ایسا کرنا میرا فرض ہے۔

آپ نے اپنے خط میں جس نکتے کی طرف میری توجہ مبذول فرمائی ہے اس کے بارے میں میں آپ سے یہی کہنا چاہوں گا کہ میں نے نعوذ باللہ دیدہ و دانستہ ایسا نہیں کیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہم مسلمانوں کو جو عشق ہے اس میں آپ مجھے بھی شامل سمجھ لیں۔

میں کتاب کا مترجم ہوں مصنف نہیں۔ اس لیے اصلیت کو قائم رکھنا میرا فرض تھا اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ ادبی بد دیانتی ہو جاتی۔ قدیم فارسی میں احترام کے طور پر جمع کے صیغے استعمال ہوتے تھے۔ اب جدید فارسی میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر میں خود ترجمہ میں جمع کے صیغے احتراماً استعمال میں لاتا تو مطالب و مفاہیم کے ادراک میں پڑھنے والوں کو دقت پیش

آسکتی تھی۔میں نے اس سے احتراز کیا۔

مصنف نے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت میں محمد عربی سے تعارف کرایا ہے۔عشق میں حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ہمارے شاعروں نے بھی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق "ژ، چون، چان" وغیرہ الفاظ فرطِ عشق وعقیدت اور کثرت محبت و الفت میں استعمال کیے ہیں: "کرغم دَفع یا حیات النبیؐ" "اور کرہَم چان گارَے یا شفیع المذنبین" "لول چونئے آو واراہ....."۔

آپ نے میری اس کتاب کے جلد اول کا مقدمہ نہیں پڑھا ہے۔اس میں صفحہ ۲۰ پر میں نے قارئین کرام کی جن میں آپ بھی شامل ہیں توجہ ان نکتوں کی طرف دلائی ہے۔اگر آپ وہ پڑھ لیتے تو شاید آپ مجھے خط نہ لکھتے۔لیکن مجھے خوشی ہے اسی ذریعہ احسن سے آپ سے نصف ملاقات ہوگئی۔

اللہ ہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اسلام پر قائم رکھے۔آمین۔

مخلص

شمس الدین احمد

پتامبر ناتھ در (فانی کاشمیری)

گڑگاؤں (ہریانہ)

۳۰ نومبر ۲۰۱۱ء

مُحِب مکرم مرزا بشیر احمد بیگ شاکر صاحب!

السلام علیکم

پہلی بار ۱۳ نومبر ۲۰۱۱ء کو بذریعۂ ٹیلی فون آپ سے غائبانہ ومشفقانہ ملاقات مسرت زا ہوئی۔خاص کر اس بات سے کہ میری زادِ بوم (جنم بھومی) سے ملحق ایک قریبی مقام پر رہنے والے ایک کشمیری مسلم دوست نے کچھ اور دردمند مسلم احباب کی طرح عالم مہاجرت میں مجھے یاد فرمایا ہے۔نیز مذکورہ تاریخ ہی کو لکھے گئے نوازش نامے سے مجھے مشرف کیا ہے۔چنانچہ ۲۵ نومبر ۲۰۱۱ء کو اس نوازش نامہ کے ملنے اور نظر نواز ہونے پر وچارناگ (سرینگر) اور اس کے مضافات کے تمام مناظر اور لوگ میرے دل و دماغ اور آنکھوں کے سکرین (پردے) پر معنوی صورت ہی میں سہی یکے بعد دیگرے جلوہ نما ہوئے۔مجھے یاد فرمانے کے لیے آپ کا تہہ دل سے شکریہ۔

آپ کے حسبِ ارشاد میری حالیہ تصنیف زیر عنوان "وحدت نما و حق سرا" کی ایک کاپی تحفتاً مکتوب ہٰذا کے ساتھ ارسالِ خدمت ہے۔اس کی رسید سے مجھے ممنون فرمائیں۔نیز اپنے اہل خانہ اور میرے جاننے پہچاننے اور انجانے تمام دوستوں کو میرا شفقت بھرا اسلام عرض کیجئے گا۔

آپ کا خیر اندیش و دعا گو

پتامبر ناتھ در (فانی کاشمیری)

رفیع الدین ہاشمی

بخدمت برادرم بشیر احمد شاکر صاحب

سلام مسنون

۴/اپریل کا خط ملا۔مجھے افسوس ہے کہ ملاقات نہ ہوسکی۔اگر آپ اقبال اکادمی والوں سے کہتے تو وہ فون پر بات کرادیتے اور میں ملاقات کا بندوبست کرلیتا۔آپ اُن سے پتہ لے کر گھر بھی تشریف لاسکتے تھے۔مگر آپ نے بہت سادگی اختیار کی۔افسوس ہے کہ آپ اتنے عرصے بعد، اتنی دور سے آئے اور ملے بغیر چلے گئے۔مجھے اپنی محرومی کا احساس ہورہا ہے۔

اس وقت تو یہی سطور لکھ سکتا ہوں۔کتابیں کسی آتے جاتے کے ہاتھ بھیج سکتا ہوں۔اگر کوئی صاحب ادھر آرہے ہوں تو انہیں میرا فون نمبر **0321-4503274** دیں، وہ رابطہ کریں تو کتابیں دے دوں گا۔

باقی، آپ کے لیے دعا گو ہوں، آپ کی دعا کا طالب ہوں۔

لیجئے صاحب!

ایک چھوٹی سی کتاب بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے آپ تک پہنچ جائے۔ والسلام

رفیع الدین ہاشمی ۱۰ ستمبر ۲۰۱۴ء

محترم مرزا بشیر احمد شاکر صاحب

اَلسَلامُ عَلَیکُم

آپ کا طویل خط موصول ہوگیا۔ یاد آوری کا شکریہ قبول فرمائیے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کا سرینگر سے لاہور کا سفر خاص طور پر نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ آپ نے میری ذات کے بارے میں جس شفقت اور محبت کا اظہار کیا ہے اس کے لیے بھی شکریہ قبول فرمائیے۔

آپ کے خط کے ساتھ تو دیگر مخطوطات بھی میری نظر سے گزری ہیں۔ یہ بھی آپ کی محبت کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال

جناب بشیر احمد شاکر صاحب

اَلسَلامُ عَلَیکُم

آپ کے خط مورخہ ۲۶/نومبر ۲۰۱۲ء کا شکریہ۔ خط میں آپ کی حضرت علامہ کی فکر وکلام سے وابستگی کی تفصیل پڑھی۔ اچھی بات ہے کہ آپ نے ان سے عقیدت کی بنا پر سرینگر سے لاہور کا سفر اختیار کیا اور ان کے مزار پر حاضری دے کر اپنے دل کو تسکین پہنچائی۔ میرے ہاں اکبر حیدری مرحوم کا رسالہ حکیم الامت باقاعدگی سے ملتا ہے۔ ''اکبر حیدری نمبر'' بھی پہنچا ہے۔ اس میں آپ کی نگارشات دیکھنے کی کوشش کروں گا۔

آپ کی فرمائش پر تحریر ارسال خدمت ہے۔

خیر اندیش

جاوید اقبال مورخہ ۲۵/دسمبر ۲۰۱۲ء

منیرہ (دختر علامہ اقبالؒ)

دبستان اقبال لاہور

۲۵/اپریل ۲۰۱۴ء

بھائی بشیر احمد

السلام علیکم

آپ کا جذبات وسعادت سے بھرا خط جس میں آپ کی سعی اور محرومی ملاقات کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ یقیناً اس میں ہمارے ملازمین کی کوتاہی آڑے رہی۔ میرے والد محترم (علامہ صاحب) کیلئے آپکے جذبات قابل تعریف ہیں۔

میرے چھوٹے بیٹے اقبال صلاح الدین نے اپنے نانا علامہ صاحب کے افکار کے فروغ کے سلسلے میں ایک ادارہ 'دبستانِ اقبال' کے نام سے شروع کیا ہے، جو ہمارے گھر سے چند قدم کی مسافت پر موجود ہے، جس میں آپکی تشریف آوری چشم براہ ہوگی۔

آپ کی خواہش کے مطابق اپنا ایک فوٹو بھیج رہی ہوں۔ خدا آپکو اور آپکے اہل خانہ کو اپنی حفظ امان میں رکھ۔

آپ کی بہن منیرہ (دختر علامہ اقبالؒ)

میاں اقبال صلاح الدین

دبستان اقبال ۲ ایس۔گلبرگ ۲ لاہور

۱۶/ستمبر ۲۰۱۴ء

محترم جناب بشیر احمد شاکر صاحب اَلسَلامُ عَلَیکُم

گرامی نامہ موصول ہوا۔ خط میں ہمارے اہل خانہ کے متعلق آپ نے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے اس کے لیے انتہائی مشکور ہیں۔ دبستانِ اقبال آپ کی پُرخلوص دعاؤں کا طالب ہے ادارہ کا تحریری مواد چھپنے پر آپ کو مفت ارسال کیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

والسّلام میاں اقبال صلاح الدین

عبدالرشید

News Service Division

New Delhi-1

بھائی بشیر احمد بیگ صاحب 30, Nov. 1987

دُعاوسلام!

آپ کا خط مورخہ ۱۶ ستمبر یہاں دفتر میں اُس وقت موصول ہوا تھا جب سرکاری کام کے سلسلے میں دلی سے باہر چلا گیا تھا۔ واپسی پر یہ خط مجھ تک پہنچا دیا گیا اور مجھے آپ کے گراں قدر تاثرات پڑھ کے نہ صرف مسرت ہوئی بلکہ حوصلہ افزائی بھی۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ میرے فن کی اگر کوئی قدر کرے، نشریات کے شعبے میں مجھ سے جتنا بھی قدمے یا سخنے ہوسکا میں نے کیا اور یہ خالصتاً میرے کرم فرماؤں کے وقت وقت پر حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ میں اس وقت ترقی کے اس زینے پر کھڑا ہوں۔

ریڈیو میں، میں نے زندگی کا بیشتر حصہ گذارا۔ ظاہر ہے کئی لوگ میری آواز سے مانوس ہو گئے ہیں اور یہ بھی ایک قدرتی امر ہے کہ مجھے ہر کنبے کا ایک فرد سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال ہو تو میری غیر حاضری بھی محسوس ہوگی۔ چونکہ آپ نے اپنے آپ کو ایسے افراد میں شامل کیا ہے اس لیے میں یہی توقع رکھوں گا کہ آپ اپنی نیک دعاوں میں مجھے شامل رکھا کریں گے۔ جزاک اللہ۔

مخلص

عبدالرشید

چیف نیوز ریڈر

راجہ نذر بونیاری

برادرم شاکر

تسلیم و خلوص بیکراں!

آپ کا نوازش نامہ صادر ہوا۔ جس کے لیے میں آپ کا سراپا سپاس گذار ہوں۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ آپ مجھے پڑھتے رہے ہیں اور میری اناپ شناپ تحریروں نے آپ کو متاثر کیا ہے۔ دراصل یہ میرے قلم کا کمال نہیں بلکہ یہ آپ کے ایک حساس نرم اور خوب صورت دل کے مالک ہونے کا ثبوت ہے۔ آپ کا ہر لفظ دل کی عمیق گہرائیوں سے نکلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ آپ کا خط پڑھتے ہوئے میری آنکھوں میں غیر شعوری طور پر آنسو آگئے۔ دراصل اس بدقسمت ریاست کے دونوں طرف کے احوال اور واقعات سے میں اپنے ہم عصروں سے زیادہ واقف ہوں۔

ع من آنم کہ من دانم۔ نہ یہ خود پرستی ہے نہ خود ستائش۔ یہ ایک حقیقت ہے میں نے حالیہ زلزلے میں اپنے ۳۵ اعزاء کو کھویا ہے۔ جن میں میری بھابی اور اس کی پانچ بچیاں بھی شامل ہیں اور ایک قریبی رشتہ دار جن کے کاغذات میں نے ستمبر کے آخری ہفتے میں ویری فکیشن کے بعد واپس بھجوائے تھے اگر ۸/ اکتوبر کو زلزلہ نہ آیا ہوتا تو وہ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں ہمارے ہاں آنے والے تھے۔ لیکن .... میر واعظ یوسف شاہؒ۔ چودھری غلام عباس خان۔ کے، ایچ، خورشید۔ خواجہ عبدالصمد وانی۔ میر مقبول گیلانی۔ میر عبدالعزیز۔ خواجہ محمد یوسف صراف۔ خواجہ محمد یوسف بچھ۔ طاؤس بانہالی۔ احمد شمیم۔ مفتی ضیاء الدین۔ زار بٹ صاحب۔ رشید سرور گیلانی۔ اللہ رکھا۔ قدرت اللہ شہاب جیسے سینکڑوں لعل و گوہر غریب الوطنی کے دوران اس خطۂ ارضی میں پیوند خاک ہوئے جسے ۸/ اکتوبر کو قدرت نے تہس نہس کر دیا اور اس طرح اُن کی خاک بھی دھول بن کر اڑ گئی اور جو اس دن تک زندگی کی آخری سانسیں آرزو اور انتظار کے درمیان لے رہے تھے نہ وہ سانسیں رہیں نہ انہیں اب انتظار کرنا پڑے گا لیکن آرزوئیں باقی رہ گئیں جو کبھی پوری نہیں ہوسکتیں۔ آہ۔ مجھے ان میں سے اکثر کے ساتھ ایک سے زیادہ

مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ میری زندگی کے بہترین دن پاکستان میں گزرے ہیں۔ میں 4 مرتبہ 6/6 ماہ کر کے دو سال اس سرزمین پر گزار چکا ہوں۔ میری زرعی اراضی وہاں آج بھی میرے نام موجود ہے جس پر کچھ مقامی لوگ قابض ہیں۔ جن بزرگوں کا آپ نے ذکر کیا ہے اللہ ان کی لحدوں پر شبنم افشانی کرے میرے ساتھ گھنٹوں صرف اسی آرزو کو لے کر باتیں کرتے رہتے تھے کہ وہ مرنے سے پہلے ایک دفعہ اپنے وطن مالوف واپس لوٹنا چاہتے ہیں اور وہیں اُن کی آخری آرام گاہ ہو۔ یہ اُن سب کی خواہش تھی۔ لیکن قدرت کو یہ سب منظور نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ اب (۸/اکتوبر کے بعد) شاید ایک فی صد لوگ ایسے بچے ہوں گے جو ۱۹۴۷ء سے پہلے متحدہ کشمیر کے زمانے کے ہوں گے اور آخری ہچکی کے منتظر ہوں گے۔ آثار وقرائن بتا رہے ہیں کہ اب وہ شوق اور جوش باقی نہیں رہا۔ مزید آٹھ دس سال کے بعد مظفر آباد جانے اور جموں جانے میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ دس سال کے بعد پورے پاکستان میں ایک بھی بزرگ مرد یا خاتون ایسا نہیں ملے گا جو آپ کو یہ کہہ سکے:

"وَلا گوبرا۔ بلائے لگئ۔ یہ برونٹھ کنہِ
بہہ۔ سلامت روز۔ زِندروز۔ بہ
چانہِ رَتہ چھےیہ"۔

بلکہ رونے کا مقام ہے کہ دس پندرہ سال کے بعد اس ملک میں ایک بھی شخص کشمیری بولنے والا نہیں ملے گا۔

آپ نے جو نظم لکھی ہے .... اگر مناسب سمجھیں تو اس کی ایک فوٹو کاپی مجھے ضرور بھجوایئے یا پھر کشمیر عظمیٰ کو بھیج دیجئے۔ جاوید آذر انچارج ادبی سیکشن کے نام پتے پر بھیج دیجئے اور بھی لکھتے رہیے۔ اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں اگر آپ مظفر آباد جانا چاہیں تو ضرور جایئے۔ بلکہ ہو سکے تو جلدی کیجئے تاکہ آپ آج کا مظفر آباد بھی دیکھ سکیں (کھنڈرات) اور جو کچھ باقی بچا ہے وہ بھی دیکھیں اور اپنے کشمیری بھائیوں سے ملیں اور ان کی ڈھارس بندھائیں۔

میرا ارادہ بھی ہے اور میں نے کاغذات جمع کروا لیے ہیں۔ لیکن سچائی یہ بھی ہے دل نہیں مانتا۔ وہاں جا کر خاک کے ڈھیروں سے کیا بات کریں۔ ہمارے راستوں میں اب وہاں کون آنکھیں بچھائے گا۔ کون پُرنم آنکھوں سے رخصت کرے گا۔ چلئے باقی بچے ہوئے لوگوں _____ کے اوپر ہاتھ رکھ کر واپس آجائیں گے۔

میرا فون نمبر بھی نوٹ کر لیجئے۔ لیکن میں اکثر NET سے باہر رہتا ہوں۔ پھر بھی کبھی Try کر لیجئے گا۔ میں بھی کوشش کروں گا۔ کبھی ہو سکے تو آجایئے ہمارے گاؤں Saturdays کو میں اکثر سرینگر ہی رہتا ہوں۔ ایک ڈیڑھ مرلے کا پلاٹ HMT شالہ ٹینگ میں لے رکھا ہے۔ ۲۰۰۶ء میں انشاء اللہ تعمیر کا کام شروع کروں گا۔

یاد آوری کے لیے ایک بار سے شکریہ۔

اللہ کرے مزاج مع الخیر ہوں

فقط

آپ کا بھائی

راجہ نذر بونیاری

4-12-2005

عبدالمجید کھانڈے

محترم بیگ صاحب

اَلسَّلامُ عَلَیْکُم!

آپ کا نوشتہ نامہ آج موصول ہوا۔ پڑھ کر کافی خوشی ہوئی کہ آپ کی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے میری ریڈیو پر ہوئی بات چیت سنی اور آپ محظوظ ہوئے۔ ذرہ نوازی کے لیے

شکریہ۔ میرے دوست میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی دوستی میں بہت خلوص ہے اس لیے آپ میرے بول چال سے متاثر ہوئے۔

بہر حال خط لکھنے اور یاد کرنے کے لیے بہت بہت شکریہ۔

آپ کی یاداشت تازہ کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ میں دامجن قاضی گنڈ اننت ناگ سے تعلق رکھتا ہوں اور ۱۹۸۴ء میں K.A.S میں آیا۔ اس وقت میں سرکل آفس میں تعینات تھا۔ امید ہے کہ آپ کبھی ملاقات کا شرف بخشیں گے۔

وَ السّلام

آپ کا خیر اندیش

عبدالمجید کھانڈے

(ڈپٹی کمشنر' کپواڑہ)

۲۰ر فروری ۲۰۰۴ء

☆☆☆

سعید اختر درانی

3 Selly Close, Selly Park

Birminghan B.29 7G England

بھائی بشیر احمد بیگ صاحب　　　　سلام مسنون!

آپ کا نوازش نامہ کئی ہفتے سے جواب کا طلب گار تھا۔ لیکن کئی ایک مصروفیات آڑے آتی رہیں (نوادرِ اقبال' کے نئے ایڈیشن کی تیاری اور ایک تازہ مضمون: علامہ اقبال کا سفرِ اطالیہ۔ نومبر ۱۹۳۱ء) اور پھر آپ کا خط کہیں کاغذوں میں دب کر گم ہو گیا۔ فقط اس کا خالی لفافہ مجھے یاد دلاتا رہا کہ اس کا جواب ابھی میرے ذمے ہے۔ آخر کار' کل رات کافی تلاش و جستجو کے بعد میں آپ کا خط برآمد کرنے میں کامیاب ہوا اور آخر کار میں یہ جواب لکھنے کے قابل ہو سکا۔ معذرت خواہ ہوں کہ

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

اول تو میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے میرے مضمون (حکیم الامت میں) دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور وہ آپ کو پسند آیا۔ اس مضمون کی تحریر تمام تر اتفاقی تھی۔ کیونکہ میں اپنے نانا کے اس مقالے سے قطعاً بے خبر تھا اور یہ بات ایک حُسنِ اتفاق تھی کہ میں نے حیدری صاحب کی کتاب دیکھی اور ان کی تشویق پر میں نے یہ مضمون قلم بند کیا اور یوں اپنے جدِ امجد کا ایک نا معلوم قرض ادا ہو گیا۔ حیدری صاحب اس تمام معاملے کے بارے میں ایک اداریہ بھی تحریر کرنا چاہ رہے ہیں اور نانا کا ایک آدھ مزید مضمون بھی طبع کریں گے۔ علامہ کے بارے میں ایک نیا مضمون (علامہ کا سفرِ مصر و فلسطین۔ دسمبر ۱۹۳۱ء) بھی میں نے حکیم الامت کو روانہ کیا ہے (جو دراصل میں نے ''اقبالیات'' لاہور (مجلہ اقبال اکادمی پاکستان) کے لیے لکھا تھا۔ لیکن حیدری صاحب نے تقاضا کیا۔)

یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آپ کو میرے نانا کے ان پوسٹ کارڈوں کے اصل (Originals) کے ساتھ دلچسپی ہے۔ دراصل میں نے حیدری صاحب کو اصل کارڈ اس درخواست کے ساتھ بھیجے تھے کہ وہ ان کا عکس بھی شائع کر دیں' تاکہ یوں یہ محفوظ ہو جائیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ان کے اصل قابل اشاعت Quality نہیں رکھتے۔ جو میرے لیے تعجب خیز ہے۔ چونکہ میرے لحاظ سے یہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ بہر حال آپ کی دلچسپی کے پیشِ نظر میں ان کی کاپیاں آپ کے لیے منسلک ہٰذا کرتا ہوں۔ آپ کا یہ فرمانا بجا ہے کہ آج سے ایک صدی پہلے کا انگریزی نظام ڈاک آج کل کے ہندوستان کی نسبت کہیں زیادہ تیز کام اور قابل اعتماد تھا۔ خود میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ چونکہ ان دنوں ٹیلی فون کا زیادہ انتظام نہ تھا (اور e-mail کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اس لیے دنیا بھر میں Postal System میں سب سے زیادہ اہم ذریعہ مواصلات تھا اور اسی کی تیز رفتاری

اہم ترین چیز تھی۔ دن میں چار چار پانچ پانچ مرتبہ ڈاک نکلتی تھی (اور لندن میں آج سے تیس سال پہلے تک بعض لیٹر بکس ہر گھنٹے بعد خالی کیے جاتے تھے۔) اسی طرح ٹیلی گراف کا نظام بھی بڑا زُود رفتار تھا۔ اب متبادل ذرائع بہت رواج پا گئے ہیں۔

آخر میں کتابوں کے بارے میں: بدقسمتی سے میری دونوں اردو کتابوں (اقبال یورپ میں اور نوادرِ اقبال یورپ میں) کے میرے پاس دو تین نسخے ہی باقی ہیں۔ لیکن انجمن ترقی اردو (ہند) نے اول الذکر کتاب دلی سے ۲۰۰۴ء میں اور موخر الذکر ۲۰۰۳ء میں اپنے یہاں سے شائع کی ہیں۔ براہ کرم ان سے براہ راست منگوا لیجئے۔

(سیکرٹری: ڈاکٹر خلیق انجم

پتہ: اردو گھر Rouse Avenue 212 دہلی ۱۱۰۰۰۲)۔

والسلام مخلص سعید اختر درانی

نریش چندر بالی

جانی پور

جموں توی۔ ۲۰۰۸/۱۲/۲۳

برادر بشیر صاحب، کشمیر

سلام۔ آپکی چھٹی زیر جواب تھی۔ بیچ میں ہی خط بھی مل گیا۔ میں طبیعت سے سارے پچھلے ماہ ناساز رہا۔ اسی لئے تاخیر ہوئی۔

[عید مبارک] بھی تاخیر کے ساتھ قبول ہو۔

کون سی ہم سے خطا ہائے، جدید ہوئی
کہ پھر اک بار عید نادید ہوئی
ندیم

جواب کیلئے کچھ دن اور انتظار کریں

آپ کا

نریش چندر بالی

این سی بالی

۳/۱ انصیب نگر جانی پور جموں

بشیر احمد شاکر

تسلیمات

آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس سال چھوٹے بھائی کی وفات پر ملال کی وجہ سے میں سال نو کی دُعا کو تحریری طور پر ارسال نہ کر سکا۔ مگر آپ کو اس کا یقین کرانے کی ضرورت نہیں کہ میں آپ کو تہہ دل سے بروقت خدا تعلیٰ سے دعا گو رہتا ہوں۔ جیسے اپنے نسبی بچوں سے۔ پھر بھی پہلی فرصت میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔

آپکا اپنا خیر اندیش

این سی بالی

ایک خط عبد الرشید[ا] SPM احمد اکدل کے نام بھی ارسال ہے۔ ان سے رسیدگی کے بارے میں پوچھ تاچھ کریں، اور تاکید کریں کہ کیا وہ میری ریٹائرمنٹ کی فوٹو کاپی ارسال کرنا بھول گئے۔

آپکا این سی بالی

ا: نوٹ:- خد نویسندہ سے چوک ہوگئی ہے، اصل میں ان کا نام محمد اشرف ہے۔ دراصل یہ بڑھاپے کا اثر ہوتا ہے۔

مولانا وحید الدین خان

برادر سلام مسنون

آپ کا خط ملا، اسی کے ساتھ عورتوں کی انگریزی تعلیم کے بارے میں کتابچہ بھی موصول ہوا۔ مسلمانوں کے مسئلہ کا حل نہ اس طرح کا کتابچہ شائع کرنے میں اور نہ ان کتابچوں کا جواب دینے میں۔ مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ ان کے اندر صحیح شعور ابھارا جائے اور ان کی ذہنی تعمیر کی جائے جو لازماً لمبا وقت چاہتی ہے۔

الرسالہ کے ذریعے ہم یہی کوشش کررہے ہیں۔ اگر آپ کو ملت کا درد ہے تو الرسالہ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے اندر پھیلائیے۔ یہی آپ کو ہمارا مشورہ ہے۔

دعاگو وحید الدین ۳رجولائی ۱۹۸۸

محمد رحمت اللہ میر قاسمی

دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر

محترم المقام السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج عالی!

منی آرڈر اور گرامی نامہ کافی روز قبل ملا تھا۔ جس میں آپ نے دارالعلوم رحیمیہ دیکھنے کا اشتیاق کو ظاہر فرمایا ہے۔ ضرور وقت نکال کر تشریف لائیے۔ آپ کی تشریف آوری ہمارے لئے باعث سعادت ہوگا۔

'النور' آپ کیلئے جاری کردیا گیا ہے۔ امید ہے کہ آپ تک پہنچ گیا ہوگا۔

مولانا نذیر احمد صاحب بھی یہاں پر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں اور الحمد اللہ غلام نبی نے کلام پاک مکمل کرلیا ہے۔ آنجناب سے خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے، والسلام۔

محمد رحمت اللہ

(مہتمم دالعلوم رحیمیہ بانڈی پور کشمیر)

نشاط انصاری

1.4.99

محترم شاکر بشیر احمد بیگ صاحب

السلام علیکم

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ نہ تو ادبی مرکز کمراز کی سلور جوبلی کے موقعہ پر سرینگر کالج آف ایجوکیشن تشریف لائے نہ پرسوں ۲۵ اور ۲۶ مارچ کو مرکز کے تاریخی سیمینار میں۔ شاید آپ ادبی محفلوں سے اب اکتا گئے ہیں، ورنہ ادیب یا شاعر کبھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوسکتا ہے۔ بہرکیف آئندہ ادبی مرکز کی تقریبات میں ضرور آنا چاہیے۔

میں چند دنوں کے اندر دائرہ ادب دلنہ کی طرف سے اجرا شدہ رسالہ پرتو کا منظور ہاشمی سیمینار نمبر اور اپنا تازہ شعری مجموعہ البلاغ خواجہ محمد اسحاق (برانچ پوسٹ آفس) آف گنڈ خواجہ قاسم کے ہاتھ روانہ کرونگا۔ ان کے مطالعہ کے بعد اپنے تاثرات ضرور لکھیں۔ محمد اسحاق صاحب کی ہمشیرہ میری دختر نسبتی (نوش) ہے۔ اس لئے اس پر اپنا دست شفقت ہمیشہ رکھا کریں۔ ان کا خاندان ہماری وادی کا بہت اونچا رئیسانہ خاندان ہے اور ان کا نانا خواجہ صفدر علی آف گنڈ خواجہ قاسم اپنے وقت کے ہری سنگھی ذیلداروں میں پڑھا لکھا ذیلدار تھا۔ مگر اب انقلاب زمانہ کے باعث اسی کا نوری ہم نوا نوکری کرنے کیلئے مجبور ہوا ہے۔

ہاں میں نے پیکرتہ سال آپ سے عرض کیا تھا کہ کونسا پوسٹل راستہ ہے جسکی وجہ سے مجھے اپنی پبلی کیشنز پر کم سے کم پوسٹل اخراجات دینے پڑیں۔ اچھا یہی ہوتا اگر آپ اس ضمن میں تحریری طور رہنمائی کرتے، والسلام۔

طالب دعا نشاط انصاری

سردار اعوان (معتمد ذاتی صدر موسس)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

بسمہٖ 14/اکتوبر 2004

مکرمی بشیر احمد بیگ شاکر صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا ۱۴رستمبر کا گرامی نامہ ۲۲رکو مل گیا تھا۔ جواب دینے میں تاخیر ہوگئی جس کیلئے معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے لاہور کے حوالہ سے جن جذبات کا اظہار فرمایا ہے ہم ان کا احترام کرتے ہیں مگر ہمیں علامہ اقبال یا حضرت داتا گنج بخشؒ کے مقبروں سے کوئی عقیدت نہیں بلکہ انہیں

اس طور سے نمایاں کرنا اور دنیاوی مفادات کیلئے استعمال کرنا خلاف اسلام سمجھتے ہیں۔ البتہ ان کے افکار، نظریات، خصوصاً علامہ اقبال کے، ہمارے لئے بہت ہی لائق تحسین ہیں۔ رہی لاہور کی علمی اور ادبی اہمیت، وہ بھی اب ناپید ہے۔ ان گزارشات کا مقصد آپ کی دل شکنی کرنا ہرگز نہیں، بلکہ جو احوال واقعی ہیں وہ عرض کرنا ہے۔ تاہم ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی یہ خواہش پوری کرے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کی ایک کتاب 'اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش' ارسال خدمت ہے، امید ہے دلچسپی کا باعث ہوگی۔

آپ سب بھائیوں کی خدمت میں ہمارا اسلام۔ والسلام

Dr. Javid Iqbal

Former Senator

مورخہ ۱۹ / مارچ، ۲۰۱۴ء

محترم ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی

السلام علیکم

بشیر احمد شاکر صاحب آپ کا خط لیکر میری طرف آئے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ اب کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی میں اپنے فرائض اور منصبی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

شاکر صاحب کی صحبت میں خوب وقت گزرا۔ میں نے اقبال اکیڈیمی لاہور کی شائع کردہ اپنی ایک کتاب انہیں تحفہ کے طور پر دی۔ میرا خیال ہے کہ آپ خود بھی اقبال اکیڈیمی لاہور کے ڈائریکٹر سہیل عمر صاحب کو خط لکھ دیں تا کہ اکیڈیمی کی کوئی نئی اشاعت آپ کو ارسال کر سکیں۔

خیر اندیش۔۔۔۔۔۔ جاوید اقبال

فاروق القاسمی

فاضل دیوبند، ایم اے (عثمانیہ)

ماہنامہ 'البلاغ' کراچی ۱۴

مکرمی ومحترمی جناب بشیر احمد بیگ صاحب دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

ہم آپ کی مقبول ترین دعاؤں کے طفیل خیریت سے ہیں، آپ کا عنایت نامہ ملا، جواب دینے میں تاخیر ہوئی۔ آپ نے مفتی اعظم نمبر طلب فرمایا ہے، اسکی قیمت پاکستانی روپیہ میں -/80 ہوتی ہے، ڈاک خرچ میں کم از کم اتنا ہی لگتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی صاحب آپ کی طرف سے یہاں آنے والے ہوں تو ان کے ذریعہ طلب فرمالیں، ہمیں روانہ کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ البلاغ ہم روانہ کر رہے ہیں۔ ہندوستان کیلئے سالانہ چندہ -/160 روپیہ ہے۔ آپ مندرجہ ذیل پتہ پر -/160 روپیہ بذریعہ منی آرڈر کر کے اسکی رسید ہمیں روانہ کر دیں، ہم رسید ملتے ہی البلاغ آپ کو جاری کر دینگے۔

پتہ یہ ہے:

حضرت مولانا خورشید عالم صاحب۔

منظور منزل۔ محلہ بنے خان

دیوبند 242554 یوپی، انڈیا، ضلع سہارنپور

امید ہے کہ اپنی دعاؤں میں ہمیشہ یاد فرماتے رہیں گے۔ خاص کر میرے بچوں کیلئے کہ اللہ انہیں جلد از جلد حافظ قرآن بنائے اور مجھے حج کی سعادت سے سرفراز فرمائے، آمین۔ اگر مفتی اعظم نمبر منگوانا چاہیں تو -/120 روپیہ کی نئی منی آڈر اسی مندرجہ بالا پتہ پر روانہ کر کے رسید ہمیں بھیج دیں۔ ہم رجسٹرڈ مفتی اعظم نمبر روانہ کر دینگے۔

فقط طالب دعا کا

دستخط فاروق القاسمی

عبدالرحمن سیف عثمانی

Date: 7/10/2021

Ref. No: 1

عبدالرحمن سیف عثمانی

Abdurrahman Saif

قابل صد احترام مرزا بشیر احمد شاکر صاحب وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا خط ملا، بہت خوشی ہوئی آپ نے مجھ حقیر کی تحریر کو توجہ سے پڑھا، اللہ پاک آپ کو صحت اور عافیت کے ساتھ سلامت رکھے۔ ویسے تو میں ہمیشہ سبھی کا فون قبول کرتا ہوں، آپ کا فون جس وقت آیا اس وقت میں کمرے سے باہر تھا اور فون اندر تھا، بعد میں دیکھا اور سوچا کہ فارغ ہو کر آپ سے بات کروں گا، لیکن مصروفیت کے سبب میں آپ کو کال کرنا بھول گیا اور اب آپ کا خط پڑھ کر یاد آیا کہ آپ نے فون کیا تھا۔ بہر حال شاہنامہ اسلام بس اتنا ہی ہے۔ مولانا عامر عثمانیؒ اس سلسلہ کو آگے بڑھانا چاہتے تھے لیکن تجلی کی بے انتہا مصروفیات نے اس کا موقع نہیں دیا۔ اب تو جو ہے بس یہی ہے اور یہی ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ کی مانند ہے۔ اللہ پاک میری اس کاوش کو قبول فرمائے، اتنا بھی یہ پروردگار کے فضل و کرم سے شائع ہو گیا ورنہ یہ نایاب ہی تھا۔

آپ کے خط کا مقصد جو ہے اس کیلئے انشاء اللہ مل کر بات ہوگی۔ یہ موضوع چند سطروں پر مشتمل اس خط میں سما جانے والا نہیں ہے۔ ہاں آپ مزید تحقیقی اور تشفی کیلئے کتاب ’تاریخ کے قاتل‘ کا مطالعہ کیجئے۔ اس ایک کتاب میں اتنا تاریخی اور تحقیقی مواد موجود ہے جو آپ نے پہلے کبھی پڑھنا تو دور کی بات سنا بھی نہیں ہوگا۔ ہر ایک بات دلیل و برہان کے ساتھ اس کتاب میں جمع کی گئی ہے۔

مولانا مودودی کی بات جہاں تک ہے تو راقم بھی ان کو انسان ہی تصور کرتا ہے فرشتہ نہیں۔ بے شک ان سے خطائیں ہوئی ہوں گی لیکن ہمارا اعتراض بس اتنا ہے کہ جو لوگ مولانا مودودی کی چند عبارتوں کو اچھال اچھال کر انہیں دین کا دشمن باور کرتے ہیں وہی لوگ ان لوگوں کے بارے میں اپنی زبان کیوں نہیں کھولتے جنہوں نے مولانا مودودی سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں اسی بات کو کہا جس پر مودودی کو دشنام طرازی سے نوازا جاتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں آپ معرکہ نور و ظلمت میں دکھ سکتے ہیں۔ محترم آپ میرے چودہ صفحات کو دوبارہ پڑھئے اور دل سے پڑھئے، ہر ایک لفظ پر غور کیجئے۔ جی ہاں ایک ایک لفظ بہت سوچ سمجھ کر لکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے اعتراض میں نرمی آئے گی۔

خیر بہت جلد انشاء اللہ کشمیر آرہا ہوں، آمنے سامنے بیٹھ کر بات کریں گے۔ تب شاید اعتراض کا جواب دے کر آپ کے اضطراب کو تسکین میں تبدیل کر سکوں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو، سلامت رہیں اور مجھ ناچیز کو بھی اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں اور یہ بھی دعا کریں کہ اللہ پاک مجھے چند ایسے صاحب خیر افراد مہیا کرادے جو مولانا عامر عثمانی کی لازوال تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کیلئے میری معاونت فرما سکیں۔ بے شک مولانا عامر عثمانی کی تحریریں ہر دور میں امت کیلئے مفید اور مشعل راہ ثابت ہوئی ہیں۔ خدا حافظ

رویندر روی

اللہ اکبر

لودھی کالونی

مورخہ ۲۷ ماہ جنوری

اتوار بوقت ۱ بجکر ۲۴ منٹ دن

محترم مرزا بشیر احمد شاکر صاحب

آداب عرض

مجھے امید ہے آپ خدا تعالیٰ کے فیض وکرم سے بہ خیریت و عافیت ہونگے۔ سپیڈ پوسٹ کے اندر آپکا پوسٹ کارڈ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ یہ باعث مسرت ہے کہ آپ نے آکاشوانی کی وساطت سے پوسٹ کارڈ کو روزنامہ آفتاب کے اوراق کی زینت بنوایا ہے۔ اس کے توسل سے آپ نے جہاں عوام الناس کو کارڈ کے متعلق ایک حیرت انگیز خبر سے آگاہ کرایا، وہیں علم کے متلاشیوں کو نئی معلومات سے بھی روشناس کیا ہے۔ آپ نے بحر پیکراں کو ایک کوزے میں بند کرنے کی سعی کی ہے جس میں آپ بیشک ہم کنار ہوگئے ہیں۔ کارڈ کا تواریخی پس منظر، اسکے کارنامے، اسکے اقسام، پیار ومحبت، دوستی اور اخوت کی آبیاری کرنے میں اسکا کردار عصر حاضر میں اسکی اہمیت وافادیت، اسکی مطابقت نیز ڈاک خدمات کے احوال جیسے موضوعات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈال کر قابل ستائش کام انجام دیا ہے۔ بیانیہ قابل تحسین ہے۔ آپ کا پر مغز نوشتہ کئی اہم نکات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بحث کا تقاضہ کرتے ہیں۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ پوسٹ کارڈ وجودِ ڈاک کی روح ہے اور بغیر روح وجود کی کوئی ذات نہیں ہوتی۔

برقی، مواصلاتی، سائنسی، ٹیکنالوجی اور مادی عروج کے باوجود پوسٹ کارڈ جیسے تبرکات اپنی حیثیت کسی بھی حالت میں قائم ودائم رکھنے میں کامیاب ہونگے۔ آفتاب نہ کبھی بوڑھا ہوتا ہے اور نہ ہی پرانا بلکہ ہر نئے دن نئی آن بان اور شان کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور ساری مخلوق کو منور کرتا ہے۔ ناسخ'

جو عندلیب کی آنکھوں سے دیکھے اور سمجھے
ظہور ہے اسی گل کا چمن کے پردے میں

دعا گو

رویندر روی

پروفیسر اکبر حیدری (ص 90 سے آگے)

علامہ اقبال نے بجا فرمایا ہے

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبالؔ

اردو ادب کے اس مجنون صفت اور شیدائی اقبال کی ساری زندگی کی محنت کا نتیجہ ہے کہ راتوں کی نیند حرام کرکے وہ بس مطالعہ کتب اور تحریری کام میں اپنا قیمتی وقت صرف کرتے تھے۔ تلاش وجستجو ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ اردو کی آبرو کے ساتھ ساتھ وہ تحقیق کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی تحقیق قابل اعتبار تصور کی جاتی ہے۔ مگر بہت دکھ اور درد بھرے دل کے ساتھ قلم یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ ایسے بلند قامت اور سخن شناس ادیب کی جو قدر و منزلت ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی۔ کشمیر سے باہر لکھنو، حیدرآباد اور دیگر مقامات پر حیدری صاحب کے نام اور کام کو بصد خلوص و احترام پہچانا گیا۔ اور ان کو اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

پروفیسر اکبر حیدری کے ادبی کارناموں پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے اور اس محنت طلب کام کو شیدایان اردو اور عاشقان اقبال انجام دے سکتے ہیں۔ تاکہ نئے واردان ادب کے لیے اکبر حیدری نے جو معیار مقرر کیا ہے وہ اس پر چل کر اپنے مستقبل کو روشن کر سکتے ہیں۔ آخر پر جناب شفیع شاداب کے درج ذیل مدحیہ اشعار کو لکھ کر اپنے اس مقالہ کو ختم کرتا ہوں:

روشن ترے افکار سے ہے بزم زمن دیکھ
سیراب ہے آباد ہے الفت کا چمن دیکھ
شاداں ہے قلم، شاد ہے قرطاس سخن دیکھ
نازاں ہے تیرے کام پر سارا یہ وطن دیکھ
دم تیری بڑائی کا زمانہ یہ بھرے گا
ہر بار محبت سے تجھے یاد کرے گا

سفر نامے

فقیر احد صاحب سوپور کی قبر پر حاضری

مرزا بشیر احمد شاکر

قصبۂ سوپور وادی کشمیر کا ایک معروف و مشہور قصبہ ہے۔ اس حصۂ زمین کو قدرت کی فیاضیوں نے ہر طرح سے نوازا ہے۔ یہاں ہر طرف قدرت کے حسین و جمیل نظارے نظروں کو فرحت و سرور بخشتے ہیں۔

بر سبیل تذکرہ عصر رواں میں قصبۂ سوپور نے کشمیر میں رواں عسکری تحریک کے حق میں اپنی شناخت قائم کی ہے اور یہاں کے پیر و جوان، مرد اور مستورات نے بیش بہا قربانیاں دے کر اپنی بے مثال اور انمٹ وطن دوستی کے نشانات تاریخ کشمیر میں محفوظ کیے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے یہاں کی سرزمین کو باغات اور لہلہاتی کھیتوں سے مالا مال کیا ہے ہر طرف اور ہر سو سرسبز اور شاداب نظارے نظر آتے ہیں۔ خاص کر کشمیر کے سیب کی صنعت سے قصبۂ سوپور اپنی شہرت کو پہنچ گیا ہے۔ یہاں کے سیب اپنی لذت اور شیرینی سے الگ سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ زمین کے لمبے لمبے رقبوں پر یہاں کے سیب کے باغات پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سیب کے خوش نما اور سبزا سبز درخت قطار اندر قطار ایک حسین و جمیل نظارہ پیش کرتے ہیں۔

یہاں اس قصبہ نے بہت سے اہل علم اور صاحبانِ دانش پیدا کیے ہیں۔ جنھوں نے اپنی علمی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے اپنا نام کمایا ہے۔ ان شخصیات میں سے معروف ترین شخصیت جناب سید علی شاہ گیلانی کی ہے۔ جو کہ عرصۂ دراز سے کشمیر میں تحریک آزادی کی قیادت کر رہے ہیں۔ جناب غلام رسول بچہ مرحوم کی شخصیت بھی محتاج تعارف نہیں ہے جنھوں نے علم و ادب کے شمع دانوں میں اپنی لگن اور محنت کا روغن ڈال کر ان کو فروزاں رکھا۔ اسی طرح حکیم عبدالاحد اور عبدالاحد وکیل بھی یہاں کے مشاہیر میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ غلام رسول کار بھی یہاں کی ایک سیاسی شخصیت تھے۔ مرحوم صوفی محمد اکبر تحریک آزادی کشمیر کے پُر خلوص رہنما سوپور ہی میں آسودہ ہیں۔ عصر حاضر میں بھی اس علاقے میں بہت سارے ادیب قلم کار اور شاعر حضرات علمی و ادبی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اسی طرح ادب اور فن کاری میں بھی یہاں بہت سارے نامی گرامی پیدا ہوئے ہیں۔ آنجہانی واسدیو ریہہ ایک نابینا شاعر قصبۂ سوپور ہی کی پیداوار تھے۔ جن کے مشہور اشعار یعنی ”آلو میانی شہرَ ن گامَن ہوشا ہوش“ یہاں کے سرینگر کے ریڈیو اسٹیشن سے گونجتے رہتے ہیں۔ دیگر ادیب حضرات نے بھی اپنی تخلیقات سے علمی گلستان کو سیراب کیا ہے۔

سوپور کی سب سے بڑی اور قابل قدر شناخت اس وجہ سے ہے کہ وادی کشمیر کے سربلند اور روحانیت کے بلند ترین

مقام پر سرفراز سلطان العارفین شیخ مخدوم حمزہ کشمیریؒ تجر شریف میں ہی پیدا ہوئے تھے جن کے روحانی فیوض وبرکات سے اہالیان کشمیر ان کے مرہونِ منت ہیں۔ ان کے والد گرامی کا اسمِ مبارک بابا عثمان رینہ تھا۔ بہت سال پہلے راقم الحروف کو حضرت شیخ کے مولد یعنی تجر شریف جانے کا موقعہ میسر ہوا تھا۔ میں نے اپنی کتب بینی کے شوق کے پیش نظر یہاں گھومتے گھومتے حضرت سلطان العارفینؒ کی سوانح حیات پر بھی عبد المجید سائرؔ کی کتاب خریدلی۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت ہی تصور کرتا ہوں کہ مجھے حالیہ دنوں میں یعنی ۵ مئی ۲۰۱۸ء کو ایک اور بار وادی کے اس حسین ترین خطہ میں جانے کا موقعہ نصیب ہوا اور بمقام عشہ پیر اپنے ایک رشتہ دار جناب صوفی غلام محمد کے دولت خانہ پر رات کو ٹھہرنے کا موقعہ ملا۔ جناب صوفی غلام محمد اور ان کے اہل خانہ نے میری مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی اور اپنے دل کی گہرائیوں سے میرے ساتھ محبت اور خلوص کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے اجر عظیم سے نوازے۔ افرادِ خانہ نے بڑے خلوص کے ساتھ منت سماجت کر کے رات کو قیام کرنے پر آمادہ کیا جو ان کی بلند ظرفی کا ثبوت ہے۔

دوسرے روز صبح سویرے ہی میں صاحب خانہ کے فرزند ارجمند طارق صاحب کے ہمراہ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر اس تاریخی قصبے کے اطراف و اکناف میں بغرض سیاحت نکل پڑا۔ مجاہدین آزادی اور فوج کے درمیان شمالی کشمیر اور سرینگر میں کشت وخون کی خبریں زوروں پر تھیں اور وادی بھر کے علاوہ سوپور کی سڑکیں بھی سنسان نظر آتی تھیں اور سارے بازار بند پڑے تھے اور غم و یاس کا عالم ہر سو چھایا ہوا تھا مگر اس سب کے ہوتے ہوئے بھی میرے دل میں سوپور کی بستیاں اور راہم مقامات دیکھنے کی خواہش دل میں موجزن تھی۔

دوران سیاحت مجھے بہتے ہوئے دریائے جہلم کے کنارے زیارت شاہ ہمدانؒ پر حاضری نصیب ہوئی۔ میں اندر داخل ہو گیا اور میرا ہمراہی طارق احمد اپنی گاڑی میں ہی باہر بیٹھا رہا۔ مسجد شریف کے باہر والے احاطے میں مجھے مقبرہ سادات متولیان شاہ ہمدان دیکھنے کا موقعہ میسر ہوا۔ یہاں صدر دفتر اوقاف کمیٹی اور اسلامک لائبریری زیر اہتمام اوقاف کمیٹی بھی نظر آ گیا مگر ہڑتال کی وجہ سے دونوں دروازے مقفل تھے۔ مسجد شریف کے باہر توسیعی عمارت کا کام بھی شروع کیا گیا ہے۔

میں مسجد شریف کے اندر داخل ہو گیا اور دو رکعت نماز بطور تحیۃ المسجد ادا کی۔ مسجد بڑی شاندار ہے اور کشادہ بھی ہے۔ محراب کے بائیں طرف شیشہ بند الماری کے اندر ایک تحریر نظر آتی ہے۔

عکس قدم مبارک حضرتِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

اپنی عقیدت سے میں نے اس بابرکت شیشے کو اپنے گنگار ہاتھوں سے چھولیا۔ ایک فریم بند کاغذ پر خوش خطی کے ساتھ حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کا نعتیہ کلام نظر آ گیا جس کا مطلع اس طرح ہے۔

دِلم افگار یا رسول اللہؐ
بہر دیدار یا رسول اللہؐ

بیرونی سڑک والے گیٹ پر ایک بڑا سائن بورڈ لگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے۔

زیارت شاہِ ہمدانؒ سوپور

یہاں کے صحن میں ایک خاتون بھی عجز وزاری کر رہی تھی اور دعائیں مانگتی تھی۔ پھر یہاں سے رخصت ہو کر تھوڑی سی مسافت پر دریائے جہلم کے کنارے پر یہاں کی جامع مسجد دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہاں بھی گیٹ کے اوپر برنگ سبز اور عبارت لکھے ہوئے یہ دو بورڈ لگے ہوئے تھا۔

۱۔ جامع مسجد سوپور ۲۔ صدر دفتر انجمن معین الاسلام

میں اندر چلا گیا اور دریا جہلم پر ایک نظر ڈالی۔ یہ عظیم دریا بھی کشمیر کی سنہری اور سیاہ ترین تاریخ کا ایک عینی گواہ ہے اور بزبانِ خاموش یہاں کے ستم رسیدہ عوام پر کئے گئے ظلم و جور اور جفا کی کہانی سناسنا کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ کتنے ہی ستم زدہ گان اس جہلم کی پانیوں کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں اور کتنے ہی معصوم اس پانی کی خرمستیاں کرنے والی موجوں نے نگل لیے ہیں۔ صدیوں سے چلتے چلتے روانی کے ساتھ عظیم الشان دریا بالآخر سرزمین پاکستان تک پہنچ جاتا ہے

میں مسجد شریف کی پہلی منزل میں داخل ہو گیا اور یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سر بہ سجود ہو کر اپنی نیاز مندی کا اظہار کیا۔ یہ مسجد بھی بڑی شاندار مسجد ہے۔ یہاں ایک سبزہ زار بھی نظر آ گیا جس کے اردگرد باضابطہ جنگلہ بندی کی گئی ہے۔ بڑا خوش نما باغیچہ لگتا ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک بڑا حمام بھی تعمیر شدہ ہے اور یہاں بغرض وضو تیرہ غسل خانے تعمیر کیے گئے ہیں۔ مسجد کے اردگرد اور دریائے جہلم سے پار نظریں دوڑائیں تو بہت سارے مکانات دیکھ لیے۔ اکثر مکانوں پر زنگ خوردہ ٹین کے چھت دیکھ لیے۔ پھر بھی یہ جگہ ایک حسین و جمیل منظر پیش کرتی ہے۔ دراصل مساجد اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت کی جگہیں ہوتی ہیں۔ ان کے میناروں سے رات دن اللہ کی کبریائی اور اس کی وحدانیت کی آوازیں اذانوں کی صورت میں بلند ہوتی ہیں اور اللہ کے آخری رسول یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دیتی ہیں۔ اگرچہ موجودہ دور میں ہماری نمازوں سے اس کی اصل روح غائب ہے مگر پھر بھی مساجد، مدارس، مکاتب اور خانقاہیں ہماری عظمتِ رفتہ اور مستقبل میں کام آنے والی ہمارے اعمال کے لیے روشنی کے عظیم ترین میناروں کی علامتیں ہیں۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبال:

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے
رہ گئی رسم اذان روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

اب اپنے اصل موضوع کی طرف:

اللہ کے کرم سے سوپور میں اپنی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے دل میں یکایک یہ داعیہ پیدا ہو گیا کہ ذرا فقیر خدا مست او رفنا فی اللہ احد صاحب المعروف احد بب کے مقبرے پر حاضری دے کر دل کی مراد پوری کروں۔ اگرچہ ان کی ظاہری حیات میں ایک دو بار مجھے ان کے دربار میں حاضر ہونے کا بھی موقعہ ملا تھا۔ مگر اب کی بار ان کے انتقال پُر ملال کے بعد آج میں وہاں پہلی دفعہ جا پہنچا اور میرے ہمراہی بھی میرے ساتھ نو پورہ میں واقع ان کی قبر مبارک پر حاضر ہو گئے۔ جناب احد صاحب زمانے کے بہت ہی معروف و مشہور قلندر تھے۔ اطراف و اکناف اور ردور دراز علاقوں سے حاجت مند وہاں آتے تھے اور اپنے درد کا درمان ڈھونڈتے تھے۔ حسب مقدور بہت سارے لوگوں کی حاجت روائی ہو جاتی تھی۔ لوگ ان کی چوکھٹ اور ردہلیز پر پڑے رہتے تھے۔ آنسو بہاتے تھے۔ آہیں بھرتے تھے اور سسکیاں لیتے تھے دلوں میں اپنا مدعا و مقصد لیے اندر سے ہی دعائیں مانگتے تھے اور اسی خدا رسیدہ مرد فقیر کو وسیلہ سمجھ کر اپنی حاجت براری کا ذریعہ تصور کرتے تھے

خاصانِ خدا، خدا نہ باشند
لیکن زِ خدا جدا نہ باشند

یہاں محفل سماع کی مجلسیں جمی رہتی تھیں اور صوفیائے کرام کے روح پرور کلام سے ان محفلوں کا رنگ نکھر جاتا تھا۔ کیا امیر کیا غریب وقت کے کیسے کیسے کج کلاہ اور سلیمان جاہ اس فقیر

خدا کی بارگاہ میں حقیر ترین نظر آتے تھے کبھی ان کا جاہ وجلال بھی نمایاں ہوتا تھا لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے اور یہ مرد خدا ایک دم اٹھ کر گاڑی یا ٹانگے میں بیٹھ کر کہیں اور چلا جاتا تھا۔ اپنی دنیا میں مست اور اپنے حال سے الگ کسی اور دنیا میں متفکر نظر آتا تھا۔ غرض رات دن عجیب سماں رہتا تھا۔ کبھی چائے نوشی کرتا تھا اور کبھی کچھ اوڑھنے والا کپڑا اوڑھ کر یونہی سویا ہوا شیر محسوس ہوتا تھا۔ غرض یہ عشق خدا مختلف قسم کے رنگ اور روپ دھار لیتا ہے اور حیرانگی ہی حیرانگی کا عالم پیدا کرتا ہے۔

کبھی تنہائی و کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرور و انجمن عشق

بالآخر سودائے عشق کا یہ مارا آدم بھی اس فانی دنیا کو چھوڑ کر یہاں سے چلا گیا اور اپنے پیچھے اپنے کارہائے نمایاں اور کرشموں اور کرامتوں کی ایک رنگین اور پُرکشش داستان چھوڑ گیا کبھی برہنہ نظر آتا تھا اور کبھی ملبوس، کبھی اندر، کبھی باہر، صدرنگ جلوؤں کا مظہر۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن اگر نچوڑ دیں جلوے کہاں سمائیں

ان کے آستانے پر آج کی بار حاضری نصیب ہوئی۔ زیب وزینت والا آستانہ۔ اسلامی اقدار کا ایک عظیم مینار۔ یہ مرد درویش آج اپنی قبر کے اندر محو استراحت ہے۔ آج بھی دلوں پر راج کرتا ہے۔ عقیدت مند آج بھی یہاں حاضر ہوتے ہیں اور اپنی محبتوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

دربارِ شہنشی سے خوشتر مردانِ خدا کا آستانہ (اقبال)

چند ہی روز قبل یہاں سالانہ عرس منایا گیا تھا اور لوگوں میں بطورِ غذا چاول کی کوئی پندرہ سو ترامیاں دسترخواں پر بچھائی گئیں تھیں۔

قیمتی لکڑی سے آستانے کو تعمیر کیا گیا ہے۔ اوپر سے آسمان کی روشنی بالکل قبر مبارک پر پڑتی ہے۔ چاروں طرف سے قبر کے اردگرد شیشے لگے ہوئے ہیں اور سفید روغن سے چاروں جانب سورۃ اخلاص یعنی قُل ھُو اللّٰہُ اَحَد لکھا گیا ہے۔ احد یعنی خدا کی ذاتِ واحد اور یکتا۔ ہاں خدا کے خاص بندے یعنی عبدالاحد نام رکھنے والے اس نام مبارک میں رنگے جاتے ہیں اور اللہ کی ذات واحد کا عکس ان کی ذات میں نظر آتا ہے۔ وہ اللہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے ہاتھ اللہ کے ہاتھ بن جاتے ہیں۔ ان میں صفت ذات کی دل پذیری ہوتی ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب وکارآفرین کارکشا' کارساز (اقبال)

اوپر سے اس مردِ جلیل وجمیل کے آستانے پر عمدہ گنبد تعمیر کیا گیا۔ جو کہ ان کی عظمت کا نشان ہے۔ قبر کے ساتھ والے چبوترے کے چاروں طرف زائرین کے لیے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی ہیں اور اس پر قالین بچھے ہوئے ہیں۔ لوگ آتے ہیں بابا کی وسالت سے اللہ سے دعائیں مانگتے ہیں۔ کلمات کا ورد کرتے ہیں۔ آیات مقدسہ کی تلاوت کرتے ہیں اور بابا کو اسی صورت میں اپنا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ میں مفلس وگدا بھی حاضر ہوا اور یہی سوغات پیش کی اور اپنی خستہ دل کی مدعا کا اظہار بھی کیا۔ دائیں بائیں اور آگے اپنی نگاہیں دوڑائیں اور ایک روحانی سکون محسوس کیا۔

باہر نکلا لنگر میں تبرکاً چائے کی کچھ چسکیاں لیں۔ کچھ کچے چاول مل گئے یہاں اپنی عقلمندی اور بے نام کی افلاطونیت کو چھوڑنا پڑتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے ابھی محوِ تماشا لب بام ابھی

اللہ والوں کے باطن میں عشق الٰہی اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تمنائے وصال کی آگ گلزار بن جاتی ہے اور وہ

اس کی خوشبو میں ہر دم محو اور مست رہتے ہیں۔ عشق کی آگ گل وگلزار بن کر ان کے اندر ایک جہاں آباد کر دیتی ہے جس کے کرشمے اور ہر لمحہ ظاہر ہوتی کرامت انہیں اپنے اندر اس طرح جذب کر لیتی ہے کہ وہ خارجی دنیا سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور باطن کے نظاروں میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ان کے پاس آنے والے ہر شخص کے حالات ان پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی آنے والے حالات' حادثات اور واقعات قطار اندر قطار ان کی نگاہوں میں اترنے لگتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی جگہ پر بیٹھا صوفی دوسرے جہانوں' اور بلند مقامات کی سیر کراتا ہے۔ دنیا داروں یا دنیا والوں کے باطن کا کشفی دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ہی احساسات یا محبت ونفرت کی آگ میں اس طرح جلتے رہتے ہیں کہ انہیں جلنے کا احساس ہوتا ہے نہ اپنی ہی آگ سے زندگی کی موم بتی پگھلنے کا پتہ چلتا ہے۔

غرض جناب احد صاحب کا آستانہ صاحب دل اور عام لوگوں کے لیے ایک روحانی مرکزیت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ آستانے کی عمارت پختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہے اور یہاں سنگ سیاہ اور سنگ مرمر بھی تعمیر میں استعمال میں لائے گئے ہیں۔ یہاں اس مرد کامل کے مکان میں ان کی نشست گاہ بھی ہے اور بہت سارے لوگ وہاں بھی حاضری دے کر گزری ہوئی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ خادموں اور ملازمین کی خدمات سے بھی یہاں آنے والوں کی مہمان نوازی کی جاتی ہے۔ جناب پروفیسر حبیب جو کہ اس مرد خدا کے ایک مرید اور عقیدت مند ہیں نے اپنے اس پیر باصفا کی سیرت اور حالات وواقعات پر ایک عمدہ کتاب احد بب کے نام سے شائع کی ہے۔ جس میں انہوں نے عالمانہ انداز سے اس مرد قلندر کی حیات' کمالات' درویشانہ زندگی اور ان کے فقر وغنا پر تفصیل سے حالات وواقعات کا بیان کیا ہے۔

کچھ تشفی پا کر اور زیارت سے فارغ ہو کر راقم الحروف اپنے ساتھی کے ہمراہ پھر اپنے میزبان کے گھر پر حاضر ہو گیا اور تھوڑی دیر ٹھہراؤ کے بعد ان سے رخصت لے کر ضلع بارہمولہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہڑتال بالکل جاری تھی۔ مگر کوئی کوئی سوموگاڑی چل رہی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے کے اندر میں بارہمولہ کے بازاروں سے گذر کر اپنے ایک ہمدم دیرینہ اور قلم کار جناب عبدالخالق میر المعروف خالق پرویز کی خدمت میں حاضر ہوا۔

محترم خالق پرویز کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے ان کو قدرت نے علم وادب اور شعر وشاعری کے ذوق سے نوازا ہے۔ ان کی تصنیف کردہ کتاب جلاء وطن (دو جلدیں) علمی حلقوں میں داد تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہ تحریک حریت کی کہانی بیان کرتی ہے اور جناب پرویز صاحب اور ان کے دوساتھیوں کو رنج و آلام کے ساتھ پرانے زمانے میں مملکت خداداد پاکستان میں زبردستی دھکیلنے کی داستان سے پُر ہے اور پھر کئی سال کی مہاجرت کے بعد اپنے وطن واپس پہنچنے کی دلیل سے بھی روشن ہے۔ اس کے علاوہ صاحب موصوف ایک پختہ کار شاعر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ اگر چہ میری طرح علمی حلقوں میں زیادہ شہرت نہیں رکھتے ہیں۔

جناب پرویز صاحب اور ان کے اہل خانہ نے بھی دل کی گہرائیوں سے میرا استقبال کیا۔ چائے کے علاوہ دوپہر کے طعام کا بھی بندوبست کیا گیا اور میں نے اس طرح پیٹ کی

غرض جناب احد صاحب کا آستانہ صاحب دل اور عام لوگوں کے لیے ایک روحانی مرکزیت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ آستانے کی عمارت پختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہے اور یہاں سنگ سیاہ او رسنگ مرمر بھی تعمیر میں استعمال میں لائے گئے ہیں۔

آگ بجھادی۔ پرویز صاحب کے دولت خانہ سے بارہمولہ چاروں جانب سے پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ دور سے ان پہاڑوں کا نظارہ بہت ہی نظر نواز اور دلکش لگتا ہے۔ بارہمولہ میں شمالی پہاڑ کی چوٹی پر مغربی پہاڑ اور جنوب ومغرب پہاڑ کی چوٹیوں پر بھارت کا قومی جھنڈا الہراتا نظر آتا ہے۔ مشرق ومغرب کے پہاڑوں کے اوپر آرمی ہیڈ کوارٹر موجود ہے۔ چاروں اطراف سے بھارتی فوجیوں نے اس مردم خیز اور نظر نواز خطے کو گھیر رکھا ہے۔ بارہمولہ میں بھی ہڑتال کی وجہ سے ساری دکانیں بند تھیں قصبہ بارہمولہ بھی اپنی سنہری یادوں سے تاریخ کا حامل ہے۔طوالت کے خوف سے یہاں اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔اسی بارہمولہ سے صوبہ کشمیر کا قدرتی اور اصلی راستہ یعنی راولپنڈی روڑ پاکستان کی طرف جاتا ہے جو کہ ظالم وجابر حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے دہائیوں سے بند کیا گیا ہے اور نفرتوں کے دیوار کھڑے کیے گئے ہیں۔دونوں اطراف کے قریبی رشتے یعنی کشمیری ایک دوسرے سے بچھڑ کے رہ گئے ہیں اور ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ وہ دن جلد نصیب کرے کہ ظلمتوں کی یہ سیاہ راتیں دور ہوجائیں اور ایک روشن ترین صبح دیکھنے کو ملے۔خدا کرے کہ کشمیری عوام کی یہ دیرینہ آرزو پوری ہوجائے اور محسنِ کشمیر شاعر مشرق علامہ اقبال کی یہ پیشن گوئی پوری ہوجائے۔

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

پھر دو چار گھنٹے پرویزؔ صاحب کے ہاں بیٹھ کر خوب باتیں ہوئیں اور یہاں وارد ہوئے دو اور مہمانوں کے ہمراہ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر میں سرینگر کی طرف روانہ ہوگیا اور زبردست بارشوں کے دوران بھیگا ہوا خدا خدا کر کے نامساعد حالات کے اندر بخیر وعافیت اپنے گھر پہنچ گیا۔

سفر لداخ کی راہوں پر

لداخ ایک وسیع خطۂ ارض ہے جو کشمیر کے اور مشرق میں پھیلا ہوا ہے اس کے شمال مشرقی حصے پاکستان کے کنٹرول میں ہیں جب کہ جنوبی مشرقی حصہ بھارت کے زیر انتظام ہے اور شمال مشرقی علاقے چین کے کنٹرول میں ہیں۔ لداخ کا کل رقبہ ۴۵ ہزار مربع میل یعنی ایک لاکھ سترہ ہزار مربع کلومیٹر ہے۔لداخ دنیا کے بلند ترین علاقوں میں شامل ہے۔ یہاں انتہائی بلندی پر وسیع میدان اور انتہائی گہری وادیاں پائی جاتی ہیں۔ بلند سطح مرتفع کے علاقے زیادہ تر مشرق میں ہیں جب کہ مغرب کی جانب بڑھتے ہوئے میدان بتدریج کم ہونا اور پہاڑی سلسلے بڑھنا شروع ہوجاتے ہیں یہ جنوب مشرقی علاقے میں تقریباً ساڑھے تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر جھیلوں کا سلسلہ ہے جو شمال مغرب میں زانسکار رینج تک پھیلا ہوا ہے۔

راقم السطور کی ڈیوٹی آج سے کوئی ۴۷ سال قبل یعنی ۱۹۷۵ء۔۱۹۷۶ء لیہہ لداخ میں لگ گئی تھی۔آج بھی پرانے لیہہ بازار کا ناک نقشہ اور دوکانات ومکانات کا سماں میری نظروں میں سمایا ہوا ہے۔اس وقت لیہہ کا بازار بالکل مختصر حدود میں تھا۔ میرے دل میں یہ شوق پیچ پیچ میں انگڑائیاں لے رہا تھا کہ آج کے لداخ اور پرانے زمانے کے لداخ میں کتنا کچھ بدل چکا ہوگا۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چند نیک سیرت بزرگوں اور دوستوں کے ساتھ یک بیک طے پایا کہ کرگل اور لداخ کی طرف سفر کریں۔ہمارا قافلہ ایک بچے کے سمیت چھ افراد پر مشتمل تھا ہم نے لداخ کی طرف رخت سفر باندھ لیا اور ہم ۲۰۱۲ء ستمبر کی ۱۸ تاریخ کو عازم سفر ہو کر صبح کے 10:30 پر سرینگر سے نکل گئے۔ 12:30 پر ہم کنگن سے دور سُنبھل میں ہم ٹھہر گئے۔

دوپہر کا کھانا اپنے ہم سفر بزرگ جناب ماسٹر عبدالاحد صاحب (ریٹائرڈ) کے دولت خانہ پر کھایا۔ اس کے بعد قصر کر کے ظہر کی نماز باجماعت ادا کی اور دوبارہ خدا کا نام لے کر اپنی ٹویرا گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے ہم سونہ مرگ پہنچ گئے اور سونہ مرگ کے قدرتی نظاروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی اور سبزہ زاروں کا منظر نظروں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ گھوڑے والوں کا نظارہ بھی خوب تھا اور سیر و تفریح کی غرض سے سیاح لوگ گھوڑوں پر بیٹھ کر تھاجہ واس اور دیگر پُر فضا جگہوں کی جانب رواں دواں تھے۔

یہاں سے روانہ ہو کر ہم زوجیلا کے اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھنے لگے۔ زوجیلا پہاڑ سطح سمندر سے ۱۰۴۹۰ فٹ کی اونچائی پر ہے۔ زوجیلا پہاڑ تو پہلے ہی ایک دشوار گزار راستہ فراہم کرتا ہے مگر ہمارے سفر کے دن اس میں کچھ خرابی پیدا ہوئی تھی اور بیکن پروجیکٹ والے اس کی مرمت میں پوری طرح منہمک تھے جس کی وجہ سے ہمیں اس پُرخطر پہاڑ پر دوسری مسافر گاڑیوں کے لیے ساتھ قریباً ڈھائی گھنٹے کے لیے روک دیا گیا۔ یہ وقفہ ہمارے لیے کافی حوصلہ شکن اور صبر آزما تھا۔ زوجیلا پہاڑ کوئی پندرہ کلومیٹر لمبا ہے اور اکثر جگہوں پر راستہ خراب نظر آتا ہے اور اس راستے میں کھڈ بن گئے ہیں جس کی وجہ سے ہماری گاڑی کشتی کی مانند ہچکولے کھائے جا رہی تھی۔ نیچے گہرائی کی طرف نظر کرتے ہوئے رونگٹھے کھڑے ہو جاتے تھے اور ڈر کی وجہ سے ہماری زبانوں پر کلمات کا ورد چل رہا تھا۔ تاریخ میں اس پہاڑ کے کئی نام دیئے گئے ہیں۔ پرانے نقشوں میں اسے کانتل کہا گیا ہے۔ جس کا مطلب اونچا پہاڑ ہے۔ ایک پادری فادر ڈیزی ڈیری نے اپنے سفر نامہ میں زوجیلا کو اس نام سے یاد کیا ہے۔ انہوں نے ایک اور پادری فادر فریدے کے ہمراہ مئی ۱۷۱۵ء میں اس درہ کو عبور کیا تھا۔ کشمیر کی طرف سے بال تل سے چوٹی تک 2118 فٹ اونچا ہے اور سات میل کا فاصلہ بنتا ہے۔ بال تل کشمیری میں اوپر نیچے کا مطلب دیتا ہے۔ زوجیلا نے آج تک ہزاروں جانیں لی ہیں۔ خدا خدا کر کے ہم نے اس سخت اور دشوار ترین راستے کو عبور کیا حالانکہ حکومت کی طرف سے اس پہاڑ پر ٹنل نکالنے کی Survey بھی کر دی گئی ہے۔ مگر خدا جانے یہ کام کب تکمیل کو پہنچ سکے گا۔ ساتھ ہی ساتھ کئی مقامات پر چالو راستے کے علاوہ اوپر اوپر سے دوسرا راستہ بھی زیر تعمیر ہے جس سے مستقبل میں آمد و رفت کا سلسلہ آسان ہو سکے گا۔

شام کے ۷ بجے کے قریب ہم دراس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ راستہ کی خرابی اور شام کے اندھیرے کی وجہ سے ہم ٹھیک راستہ کو پہچان نہیں پائے اور گاڑی کا ڈرائیور بلال راست راستہ کے بجائے کسی اور راستہ پر چلنے لگا۔ ہم نے کوئی ۱۰۔۱۲ کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ راستہ بڑا ناہموار تھا اور اس پر تعمیری کام ہونے کا اندازہ ہو کر ہم واپس آ گئے۔ کوئی آدم ذات یا ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا جس سے ہم ٹھیک راستہ کے بارے میں دریافت کر لیتے۔ بھٹکتے بھٹکتے ہم ایک آرمی کیمپ کے نزدیک پہنچ گئے اور ہمت کر کے اور خدا کا نام لے کر دو آدمی راقم اور عادل گاڑی سے باہر نکل گئے۔ گاڑی کو دیکھ کر فقط ایک فوجی جوان بارک سے باہر آ گیا اور ہمارے بتانے پر ٹھیک راستے کی نشاندہی کی مگر شومئ قسمت ہم اندھیرے میں پھر اسی غلط اور ناہموار راستے پر چلنے لگے اور شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے۔ رات کا سناٹا آدم ذات ناپید، نہ بازار، نہ دوکان، نہ کوئی روشنی، ہم اور دھیرے دھیرے اونچائی کی طرف روانگی آخر کب تک۔ ہمت ٹوٹنے لگی۔ کلمات ورد زبان سلامتی اور عافیت کی دعائیں لبوں پر بس خدا کی رفاقت

ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا
زمین کا سخت ہو جانا، فلک کا دور ہو جانا

ہمارا ڈرائیور نہایت شریف النفس تجربہ کار اور باہمت تھا۔ جس نے بیرونی ممالک میں بھی اچھی طرح اور سلیقہ سے گاڑی چلائی ہے۔ اندھیرے اور نابینا راستے سے ہم پھر واپس مڑ گئے اور رفتہ رفتہ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بھٹک کر ٹھیک راستہ پر آ گئے اور راستے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ واپسی پر ہمیں معلوم ہوا کہ ہم راستہ بھٹک جانے کی وجہ سے شاید Tiger Hills کی طرف سفر کر رہے تھے مگر اس بارے میں بھی وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

کوئی رات کے نو بجے ہم دراس سے کرگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سفر دراس سے کوئی ۶۲ کلومیٹر دور ہے۔ دراس ساری دنیا میں ایک سرد ترین مقام ہے جو سطح سمندر سے ۳۲۰۰ میٹر کی اونچائی پر واقعہ ہے۔ Tiger Hills کی جنگ بھارت اور پاکستان کے درمیان ۱۹۹۹ء میں لڑی گئی تھی اور اس جنگ کی وجہ سے دراس کے باشندوں کا جانی اور مالی نقصان ہوا تھا۔ اندھیرے میں سفر کے دوران کچھ خاص پتہ نہیں چل سکا اور ہمارا قافلہ بس چلتا ہی رہا۔ کہیں سست رفتاری کے ساتھ اور کہیں تیز و تند رفتار سے۔ یہاں تک کہ ہم کرگل بازار میں رات کے 10:45 منٹ پر وارد ہو گئے۔ ہمارا میزبان پہلے سے ہی ہمارے لیے کرگل بازار میں چشم براہ تھا۔ جونہی ہماری گاڑی رک گئی تو آپ نے ہمارا خندہ روئی کے ساتھ استقبال کیا۔ سامان سفر گاڑی سے اتروا کر اپنے عارضی قیام گاہ پر ہمیں بٹھایا۔ چائے سے ہماری تواضع کی۔ چائے نوشی کے بعد مسافر حضرات نے وضو وغیرہ کر کے عصر سے عشاء تک کی نمازیں قصر کر کے ادا کیں اور دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد طعام سے تازہ دم ہو گئے اور بستروں میں محو آرام ہو گئے۔ میزبان نے پوری طرح اور فراخدلی کے ساتھ مہمان نوازی کا حق ادا کیا۔ امیر قافلہ کے ساتھ ہم کو بھی میوہ جات پیش کیے گئے۔ میزبان کا نام نامی محمد حسین ہے اور راج پورہ پلوامہ سے تعلق رکھتے ہیں اور بغرض ملازمت کرگل میں مقیم ہیں۔

مسلمان کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروت حسن عالم گیر ہے مردانِ غازی کا
(اقبالؔ)

یہ ۹ ستمبر ۲۰۱۲ء کی تاریخ تھی کہ راقم رات بھر استراحت کے بعد صبح سویرے وضو کر کے کرگل کی حنفیہ مسجد کی اور چلا جہاں فجر کی نماز با جماعت ادا کی یہ مسجد یہاں حنفی مسلک رکھنے والوں نے بنائی ہے اور بہت ہی شاندار مسجد ہے۔ ہمارے میزبان نے اس دن ہمیں اپنی قیام گاہ پر ٹھہرنے کے لیے اصرار کیا۔ پھر ایک پروگرام طے پایا اور ہم چھتوک پاور پروجیکٹ کی طرف چل نکلے جو کرگل سے کوئی ۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ پاور پروجیکٹ NHPC نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ ایک اونچے پہاڑ کو کاٹ کر دریا کے کنارے یہ پروجیکٹ زیر تکمیل ہے اس کی صلاحیت 4500 کی ہے اور اس کی بدولت سارے کرگل شہر اور ملحقہ دیہاتوں کو بجلی فراہم ہو سکے گی۔ پہاڑ کے اندر اس کو کوئی ۵۰ فٹ کے برابر گہرا کھودا گیا ہے۔ کام کرنے والے عملہ نے اس کی سرسری تفصیلات سے روشناس کیا۔ دوسری طرف سے کوئی ۳ کلومیٹر دور دریا کی سطح کو بلند کر کے پروجیکٹ والے پہاڑ کے اندر پانی پہنچانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہاں سے نکل کر گاڑی میں بیٹھتے ہی بطرف سانکو چلنے کا ارادہ کیا چونکہ اس روز بارش بھی ہو رہی تھی۔ ہوا میں خنکی بھی تھی اور پیدل چلنا بارش کی وجہ سے تکلیف دہ تھا۔ سانکو کا علاقہ کرگل والوں کے لیے ایک تفریح گاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہاں کے باشندے سانکو دل بہلائی کے لیے جاتے ہیں۔ ہم چلتی گاڑی سے ہی سانکو کے خوش نما نظاروں کا لطف لے رہے تھے۔ دائیں اور بائیں اونچے اونچے اور بلند چوٹیوں والے پہاڑ تھے جن پر سرسبز اور خوش کن

سبزہ کی چادریں بچھی تھیں۔ بید کے لمبے لمبے درخت بھی نظر آرہے تھے۔ پیڑ پودے بالکل جوبن پر اور بکھرے ہوئے تھے۔ راستے میں پہاڑ کے دامن میں وہ جگہ دیکھنے کو ملی جو یونیورسٹی کیمپس کے لیے رکھی گئی ہے اور اس کا رقبہ کافی وسیع و عریض ہے۔ سانکو کے باغات اور باغیچوں میں خوبانی کے درختوں کی قطاریں نظر آگئیں۔

یہاں دیگر اشیائے خوردنی کی پیداواریت بھی ہوتی ہے۔ یہاں جو کی کاشت بھی خوب ہوتی ہے چونکہ علاقہ سانکو جناب قمر علی آخون کا آبائی علاقہ ہے یہاں کی سڑک بالکل اچھی اور قابل آمدورفت ہے۔ آخون صاحب حکومت جموں وکشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر براجمان رہے ہیں۔

سانکو کے نظاروں سے محظوظ ہوکر گاڑی میں بیٹھے ہی ہم واپس مڑ گئے کیونکہ بارش کی وجہ سے ہم چلنے پھرنے سے قاصر رہے۔ کرگل واپس آکر راقم السطور بالکل اکیلا کرگل بازار کی طرف چل نکلا۔ اتوار تعطیل کا دن ہونے کے باوجود کرگل بازار کی اکثر دوکانیں کھلی تھیں اور کاروبار چل رہا تھا۔ میں شیعہ مسجد میں داخل ہوگیا جوکہ بڑی شاندار مسجد ہے اور یہ مسجد دو منزلہ ہے۔ یہ مسجد بازار میں واقع ہے یہاں انجمن اثناء عشریہ کا ایک بڑا مدرسہ بھی ہے اور یہ بھی بازار کرگل میں واقع ہے۔ محرم اور دیگر مخصوص ایام کے لیے یہ مدرسہ ماتم سرا کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

رات کو اپنے میزبان کے ہاں قیام کرنے کے بعد دوسرے روز یعنی ۱۰ ستمبر کو ہم صبح 6:35 منٹ پر ہم لداخ کی راہوں پر گامزن ہوگئے۔

لیہہ کی راہوں پر روانگی:

موسم بھی سہانا تھا اور کھلی دھوپ میں ہماری تویرا گاڑی ریگستانی اور پتھریلی راہوں پر چل رہی تھی۔ کرگل سے لیہہ تک ۲۲۶ کلومیٹر کا لمبا سفر ہے۔ راہ چلتے ہمارا چھ نفری قافلہ دائیں بائیں پہاڑوں کے نظاروں میں کھو گیا۔ بظاہر پتھروں کے پہاڑوں کا سلسلہ در سلسلہ ایک عمدہ نظارہ پیش کر رہا تھا۔ یوں تو یہ بے جان اور بے زبان بھاری اور ہلکے پتھر لگ رہے تھے اور یہ چٹانیں خاموش لگتی تھیں مگر چشم بصیرت سے دیکھنے والوں کے لیے ان میں قدرت کی کاری گری اور صناعی نظر آرہی تھی۔ پہاڑوں کا یہ دراز ترین سلسلہ دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ یہ پہاڑ بہت ہی بلند وبالا اور کہیں چھوٹے چھوٹے نظر آرہے تھے۔

پہاڑ بالکل مختلف رنگ کے تھے۔ ان پتھریلے پہاڑوں میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ جن میں سلاجیت کے خزانے چھپے ہوئے ہیں جو کہ بنی نوع انسان کے لیے بہت ہی فائدہ مند شے ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان پہاڑوں کی گہری کھائیوں اور ان کے دامن میں راجوری اور دیگر جگہوں سے آئے بکروال طبقوں کے ریوڑ بھی نظر آتے تھے۔ ریوڑ کو چرانے کی غرض سے مختلف مقامات پر بکروالوں نے اپنا ڈیرہ جمایا تھا اور یہ ریوڑ ہرے بھرے گھاس سے اپنا پیٹ بھر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ ہنہناتے ہوئے گھوڑوں کی آوازیں بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں اور زنجیر بکر دن کتے بھی ان کے ساتھ رکھوالی پر مامور تھے۔ راستے میں چلتے چلتے بمقام ملہ بیک مہاتما بدھ کی مورتی نظر آگئی جس کی اونچائی تقریباً ۴۰ فٹ تھی۔ لیہہ جاتے ہوئے شرگول کے مقام پر پہاڑوں کے درمیان ایک گمپا بھی نظر آگیا۔ کرگل سے روانگی کے بعد صبح کے آٹھ بجے تک یعنی دو گھنٹوں کے اندر ہم نے ۵۰ کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ ان خشک اور خاموش پہاڑوں کے درمیان گزرتے ہوئے کسی بھی قسم کا کوئی چرند و پرند نظر نہیں آیا۔ سڑکوں پر خچروں کے قافلے بھی بیچ بیچ میں دیکھنے کو ملے۔ خدا کی اس وسیع کائنات میں کوئی بھی چیز بے فائدہ نہیں بنائی گئی ہے۔ ہر ایک شے کچھ نہ کچھ مقصد رکھتی ہے اور

یہ ساری کائنات بنی آدم کے لیے مسخر کی گئی ہے۔ بقول شیخ سعدیؔ ؎

اَبر و باد و مہہ و خورشید ہمہ درکار اند
تاتو نانے بکف آری و نہ بہ غفلت خوری

راہ چلتے چلتے ہمارے قافلہ کو بیکن والوں کے ساتھ ساتھ خطہ لداخ سے تعلق رکھنے والی جوان سال عورتیں بھی نظر آگئیں جو کہ سڑک کی مرمت اور تعمیری کاموں میں مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتی تھیں۔ بیلچے وغیرہ ہاتھ میں لیے یہ مزدوری کے کام میں مصروف تھیں اور بالکل کمر بند باندھے ہوئے چاک و چوبند دکھائی دیتی تھیں۔فوتیلا کی طرف چلتے ہوئے ایسے بھی بلند و بالا پہاڑ دیکھ لیے جن کی چوٹیاں بہت ہی بلند اور جاذب نظر تھیں۔ ان بلند چوٹیوں پر قدرت کے کاریگر ہاتھوں نے رنگ آمیزی کی تھی اور یہ چوٹیاں ایک ہی سیدھ میں خوب صورت اور خوش نما نظر آ رہی تھیں۔ ہماری گاڑی سڑک پر رک گئی اور ان بلند اور رنگین چوٹیوں کو اپنے پیچھے کی طرف کر کے ہم نے تصویریں کھینچوائیں۔ عقل مند اور غور وفکر کرنے والے آدمی کے لیے یہ بات توجہ طلب ہے کہ کس طرح قدرت کے مضبوط اور طاقتور ہاتھوں نے مٹیالے اور ریتلے رنگ کے پہاڑوں کو بھی تھام کے رکھا ہے اور یہ صدیوں سے قدرت خداوندی کی کاریگری دکھاتے ہیں ۔ اس پہاڑی سلسلہ کے اوپر اوپر چلتے ہوئے اور رُکے ہوئے بادل کے ٹکڑے بھی نظر آگئے اور اس طرح اس سفر کا نظارہ اور خوب صورتی دوبالا ہو رہی تھی۔

تفریح طبع کے لیے ہماری تویرا گاڑی میں لگے ٹیپ ریکارڈر بلکہ صحیح تر لفظوں میں پین ڈرائیو یا میموری کارڈ چالو کر کے ہم موسیقی بھی سن رہے تھے اور ہلکی ہلکی صوفیانہ موسیقی کی لے سے محظوظ ہو کر ہم اپنی استعداد کے مطابق صوفیانہ رموز اور روحانی دنیا کی باتوں سے بھی فیض یاب ہو رہے تھے۔ کشمیری موسیقاروں کی دھنوں اور ساز و آواز سے ہمارے دل کے ساتھ ساتھ کانوں میں بھی رس گھول رہا تھا اور ہم لوگ اپنے ہمراہ صوفی بزرگ سے ان رموز و کنایات سے رہنمائی حاصل کر رہے تھے جس کی وجہ سے ہمارا لداخ کا سفر آسان اور پُر لطف ہو رہا تھا۔ سڑک کے نشیب و فراز اور گہری کھائیوں کو دیکھ کر ہماری زبان سے خود بخود مقدس کلمات رواں ہوتے تھے۔سڑک کے کنارے کنارے چلتے چلتے بہتے ہوئے دریا کا نظارہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ پانی کا رنگ ہلکے نیلے رنگ کا نظر آ رہا تھا اور تیز رفتار دریا کی اُچھلتی ہوئی لہریں کچھ ہیبت سا بٹھا رہی تھیں۔ کئی پہاڑوں پر ریت کی تہیں بچھی ہوئی تھیں اور یہ بالکل پُرسکون تھیں بکھرنے کے ان میں کوئی آثار نہیں تھے۔ کئی پہاڑ اس ہیئت میں بھی دیکھنے کو ملے کہ گویا وہ خالق کائنات کے سامنے بالکل سجدہ ریز تھے۔

کھلسی سے چلتے چلتے اب لیہہ تک کی مسافت ۸۶ کلومیٹر رہ گئی تھی کھلسی میں لداخی باشندوں کی بستیاں نظر آگئیں۔وہی پرانے طرز کے چھوٹے چھوٹے مکانات اور پرانے طریقہ کی دکانیں، سیدھی سادی زندگی، خوبانی اور شلغم بیچنے والیاں سڑک کے کناروں پر بیٹھی ہوئی تھیں اور مقررہ ریٹ پر اشیائے خوردنی بیچ رہی تھیں۔Nuria Top Chi کے مقام پر پہنچ کر مسافروں کے اس چھوٹے سے قافلے کو ایک بہتا ہوا صاف وشفاف دریا نظر آ گیا۔ یہاں کے بیچ میں اتر گئے اور تازہ دم ہونے کی غرض سے ہم نے وضو کیا اور اپنے امیر کی اقتداء میں قصر کر کے نماز ظہر ادا کی۔ یہاں ارد گرد نظریں دوڑا کر بڑا خوش نما نظارہ تھا جو آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

تراشیدہ پتھروں کے پہاڑ دیکھنے کو ملے گویا کسی ماہر سنگتراش نے بنائے تھے اور سلیقہ مندی کے ساتھ ان کی ساخت دلوں کو موہ لیتی تھی۔ ان پہاڑوں پر برگ و بار والے چھوٹے چھوٹے درخت بھی اُگے تھے۔ کسی نرم زمین یا پانی کی کوئی

ضرورت نہیں تھی اور نہ سینچائی کی محتاجی قدرت نے ایسے خودرَو پودوں اور درختوں کے لیے خود ہی باطنی انتظام کیا ہوا ہے۔ انسانی عقل یہ بھید سمجھنے سے قاصر ہے ؎

ہر گیاہے کہ از زمین روید
وحدہٗ لا شریک لہ گوید

میگنٹک پہاڑ Magnetic Hill پر چل کر گاڑی کی رفتار خود بخود کم ہوجاتی ہے۔ گویا اندر سے ہی کوئی کشش گاڑی کو دھیرے دھیرے چلنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی ہے خداوند قدوس کی شان کہ بے جان پتھروں کے اندر کیا کیا چھپا کے رکھا ہے۔ سفر کی دشواریوں کو سہتے سہتے اور پُرکیف نظاروں کا لطف لیتے لیتے ہم اب لہہ پہنچنے والے تھے اور اب منزل مقصود تک پہنچنے میں کوئی ۲۷ کلومیٹر رہ گئے تھے۔ ہماری گاڑی کا ڈرائیور بلال صاحب اگرچہ عمر کے لحاظ سے چھوٹا تھا مگر گاڑی چلانے کا اچھا تجربہ رکھتا ہے۔ دشوار گذار راستہ اور پُرپیچ راہوں پر چلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر مذکورہ ڈرائیور نے اپنی بھرپور صلاحیت کا ثبوت دے دیا اور خطرناک راستوں سے گاڑی کو جلد بازی کے بغیر ٹھیک طرح چلاتا رہا۔

لیہہ پہنچنے سے پہلے دائیں اور بائیں طرح کھلے او روسیع میدان نظر آرہے تھے۔ ایک مقام پر یونیورسٹی آف کشمیر کیمپس کے لیے جگہ مخصوص رکھی گئی ہے۔ یہاں ITB فورس اور دیگر فوجی ٹولیوں کے لیے چھاونیاں بنائی گئی ہیں اور ساتھ ہی ہوائی جہازوں کے لیے بھی بہت بڑا اڈہ تعمیر کیا گیا ہے۔ گذرتے گذرتے ہم ٹھیک 4:15 منٹ پر لیہہ پہنچ گئے۔ لیہہ کے بازار میں وارد ہوتے ہی راقم السطور کی نظروں میں آج سے قبل ۴۷ سال کا لیہہ بازار گھومنے لگا۔ اس زمانے میں یہ بازار مختصر ہی تھا دوکانوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ گاڑیوں وغیرہ کی آمدورفت بھی محدود تھی۔ اس زمانے کی یادوں کو تازہ کرکے آج کے لیہہ کا ناک نقشہ ہی بدل کے رہ گیا ہے۔ بازار ہر سو پھیل گئے ہیں۔ دوکانات اور جدید مکانات کی ایک خاصی تعداد نظر آرہی ہے۔ لیہہ کے اندرونی علاقوں تک بڑے بڑے بازار سجائے گئے ہیں۔ ہر طرف گہماگہمی نظر آتی ہے۔ بیرونی ممالک سے آئے ہوئے سیاحوں کی تعداد بھی کشمیر کی نسبت بہت زیادہ ہے ہر طرف ترقی کا دور دورہ ہے۔

لداخی لوگوں کو زندگی کی سہولیات فراہم کرنے کی غرض سے مہربان لوگوں نے بہت کچھ کیا ہے۔ طبی سہولیات بہم پہنچانے کے لیے صنم زربو ہسپتال قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ طبی ادارے کھولے گئے ہیں۔

ٹیلی فون آسائش کے لیے بی ایس این ایل کا باضابطہ انتظام کیا گیا ہے۔ لوگوں کے مسائل اور مشکلات سے نمٹنے کے لیے منی سیکرٹریٹ قائم کیا گیا ہے۔ جموں وکشمیر بنک اور دیگر بنکوں کی شاخیں بھی مصروف عمل رہتی ہیں۔

چونکہ راقم السطور محکمہ ڈاک کا ملازم رہ چکا ہے اور ملازمت کے سلسلے ہی ۷۵۔۱۹۷۶ء میں میری ڈیوٹی لیہہ کے ڈاک خانہ میں تھی۔ آج ان سہولیات کو وسعت دے کر لیہہ میں ایک ہیڈ پوسٹ قائم کیا گیا ہے جو کہ جدید سہولیات مثلاً کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ای میل سسٹم سے لیس اس کے علاوہ لیہہ سٹی میں بھی پرانا ڈاک خانہ قائم ہے اور راس کی عمارت بھی نئے سرے سے تعمیر کی گئی ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے میں پوری طرح ان چیزوں کا مشاہدہ نہیں کرسکا۔

ٹرانسپورٹ کی کافی چہل پہل ہے۔ ہر طرف سومو گاڑیاں، تویرا اور ٹیکسیوں کا جال بچھا ہوا نظر آرہا ہے۔ آبادی بھی کافی دور دور تک پھیل گئی ہے۔ لیہہ بازار میں قائم قدیم جامع مسجد کو بھی از سر نو تعمیر کرکے اس کو وسعت دی گئی ہے۔ یہاں حضرت شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانیؒ کی زیارت بھی ہے۔ جس کی

تاریخی اور دینی اہمیت ہے۔ یہاں اس تاریخی مسجد میں ہم نے مغرب کی نماز باجماعت ادا کی۔ آج مجھے لداخ میں رہنے والے لوگوں کی زندگی گزارنے کے طور طریقوں میں بہت بدلاؤ نظر آ گیا۔ ان کی زیست بھی جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگئی ہے۔ تعلیمی میدان میں بھی یہ لوگ آگے نکل گئے ہیں۔ لداخ سے باہر ان کے لڑکے اور لڑکیاں ملک کے دیگر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیور تعلیم سے آراستہ ہو رہے ہیں۔

رات کا قیام ہم نے بازاروں سے دور کھمبا گیسٹ ہاؤس میں کیا جہاں ہمارے ایک کشمیری میزبان نے ہماری مہمان نوازی اور خاطر داری کی۔ یہاں ایک لڑکا کوئی ۳۲ سال کی عمر کا نظر آ گیا جو کہ کمبوڈیا سے بغرض سیر وسیاحت آ گیا تھا اور وہ بقول اس کے ایک آرکٹیکٹ تھا۔ ہمارے میزبان کے پاس قیام پذیر تھا وہ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ طعام تیار کرنا' چائے بنانا' برتن وغیرہ مانجھنا اس کی ڈیوٹی تھی اور وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر یہ کام انجام دے رہا تھا۔

صبح سویرے بیدار ہو کر ہم وضو کر کے نماز سے فارغ ہوگئے اور اپنے میزبان سے رخصت ہوئے جنہوں نے مزید قیام کے لیے بھی اصرار کیا مگر وقت کی تنگ دامانی کے پیش نظر ہم نے الوداع کہا۔

لیہہ کے بازار سے گزرتے ہوئے ہم شئ کی طرف روانہ ہوگئے چوگلمسر پہنچ کر دریافت کرنے پر ہماری گاڑی کسی اور راستہ پر چلنے لگی اور ہم اپنے خیال میں شئ کے ٹھیک راستہ پر چل رہے تھے مگر کوئی ۵۱ کلومیٹر چل کر ہم کو واپس مڑنا پڑا کیونکہ یہ راستہ ہماری منزل شئ کی طرف نہیں جا رہا تھا۔ پھر معلوم کرنے پر ہماری گاڑی شئ کی طرف دوبارہ اور صحیح سمت میں روانہ ہوگئی اس طرح ہم نے کوئی ۱۳ کلومیٹر کا سفر طے کیا اور ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔

مسجد شریف شئ لداخ:

لداخ میں شاہ ہمدانؒ کی آمد کا سال ۷۸۳ھ یا ۷۸۴ھ مطابق ۱۳۸۱ء یا ۱۳۸۲ء ہے۔ شئ تب لداخ کی راجدھانی تھی۔ شئ کی اس پرانی مسجد کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے پُرفضاء مقام پر واقع مسجد مرکز فیض پناہ پروفیسر مجیب کے مطابق شاہ ہمدانؒ نے زانسکار کے صدر مقام پڑح میں بھی ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ ۱۵۸۳ء میں مسجد کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا ہے۔ شاہ ہمدانؒ نے پہلے لداخ اور بلتستان کو اسلام سے متعارف کرایا تھا۔ روایت کے مطابق شاہ ہمدانؒ نے چینی ترکستان موجود شین شانگ میں تبلیغ دین کے لیے تشریف آوری سے قبل یہ مسجد تعمیر کی تھی۔ ۱۵۹۵ء۔ ۱۶۱۶ء کی مسلم رانی گیال خاتون ہر جمعہ کو اپنی خادمہ کے ہمراہ نماز ادا کرنے کے لیے بزگو سے شئ آتی تھی۔

ہمارے چھ افراد پر مشتمل مختصر قافلہ نے اس تاریخی مسجد میں چند رکعتیں نماز ادا کیں اور ایک روحانی سکون محسوس کیا۔ مسجد کے اردگرد زمین کا ایک خاص رقبہ موجود ہے جو کہ مسجد کے ساتھ ملحق ہے اور مسجد کی ملکیت میں شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مقبول برگزیدہ بندے جہاں جہاں بھی تشریف لے گئے ہیں انہوں نے ہر جگہ دین حق کی اشاعت وتبلیغ کی ہے اور خدا کے بندوں کو اپنے رب سے قریب تر کرنے کی غرض سے مساجد اور خانقاہیں تعمیر کی ہیں اور یہ مساجد ان کی عظمت واحترام کی دلیل ہیں۔ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کے تئیں حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کر کے صحیح لکھا ہے:

سید السادات سالار عجم
دست او تقدیر معمار امم
خطہ را آں شاہ دریاء آستین
داد علم و حکمت تہذیب و دیں

اس طرح اس مقدس مقام سے فارغ ہو کر ہم نے کرگل کی راہ لے لی اور پیچ در پیچ پہاڑوں کے سفر میں پھر کھو گئے۔

راستے میں پھر وہی نظارے، بھیڑ بکریوں کے ریوڑ، خچروں کے کارواں، گھوڑوں کی دوڑ دھوپ، پتھریلے پہاڑ، بلند بالا چوٹیاں، پہاڑوں کے مختلف رنگ، شام تک ہم کرگل واپس پہنچ گئے اور رات کو ہم نے دوبارہ کرگل میں قیام کیا راقم نے کرگل کی حنفیہ مسجد میں نمازیں ادا کیں۔ دوسرے روز یعنی ۱۱ ستمبر کو ہم کرگل سے بہ طرف سرینگر چلنے لگے۔ یہ صبح کے 6:30 منٹ کا وقت تھا۔

کرگل سے ہوتے ہوئے ہم دس بجے کے قریب مٹائن پہنچ گئے۔ مٹائن کو دس کلومیٹر پیچھے چھوڑ کر ہم ایک کھلے او ر پُر فضا میدان میں بہتے ہوئے دریا کے کنارے بیٹھ گئے۔ دریا کی بل کھاتی ہوئی لہریں اور صاف وشفاف پانی کا زور وشور بہت ہی دلکش تھا۔ یہاں پر چائے نوشی کی لطافت سے محظوظ ہو گئے۔

یہاں بھی چاروں جانب بلند وبالا پہاڑوں کا دیدہ زیب منظر دعوت فکر دے رہا تھا۔ یہاں سے نکل کر ہم پھر اپنی منزل کی طرف چل نکلے۔ نالہ گمری کا پیچ در پیچ انداز جاذب نظر تھا۔ یہ دریا بھی پوری روانی اور جوش وخروش کے ساتھ محو سفر تھا۔ میرے اندر ہی اندر کشمیری شاعر عبدالاحد آزاد کی نظم دریا کے اشعار گونج رہے تھے۔ جس کا ایک مصرعہ یوں ہے ؎

یوان چھُم زندگی ہندسوز سفرن منزلن اَندر

زوجیلا کے پُر خطر اور دشوار پہاڑ کو ہم نے خدا خدا کر کے طے کیا وہی گہری کھائیاں، ناہموار راستہ بارش کی وجہ سے کیچڑ، اس پہاڑ کو خدا کے فضل وکرم سے پار کیا اور سونہ مرگ کی حسین اور خوب صورت فضاؤں میں پہنچ کر ہم کھو گئے۔ چلتے چلتے ہم سنبھل، کنگن پہنچ گئے اور ہمارے قافلے میں شامل افراد اپنی اپنی منزل کی طرف چل دیئے اور اس طرح یہ مختصر داستان سفر اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

خاتمُ المحدِثین

حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

کے آبائی گاؤں کا سفر

پتھر سے زیادہ مضبوط اور پھول سے زیادہ نرم و نازک انسان کے سینے میں جو دل ہے اس میں زندگی بھر کتنی ہی خواہشیں اور تمنائیں پروان چڑھتی ہیں، کتنی ہی آرزوئیں ہوتی ہیں مگر اس کی ہر کوئی خواہش اور تمنا پوری بھی نہیں ہوتی اور اکثر تمنائیں اندر ہی اندر سکڑ کر ختم ہو جاتی ہیں۔

بقول مرزا غالبؔ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بنی نوع انسان ہونے کے ناطے میرے دل میں بھی خواہشیں جنم لیتی رہتی ہیں اور رب ذوالجلال کے فضل وکرم سے ہزاروں خواہشوں کے باوجود کتنی خواہشات پوری ہو کر رہ جاتی ہیں اور اکثر خواہشیں اندر دم گھٹ کے رہ جاتی ہیں۔

مدت مدید سے راقم کے دل میں اپنے وادیٔ گل پوش یعنی کشمیر کے حسین وخوب صورت مناظر قدرت سے مالا مال وادیٔ لولاب کے سیر وتفریح کرنے کی زبردست تمنا تھی، اگر چہ بہت سارے سیاحتی مقامات اور جاذب نظر جگہوں مثلاً گلمرگ، پہلگام، کوکرناگ، اچھ بل، ویری ناگ اور دیگر مغل باغات کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ حال ہی میں خدا تعالیٰ نے وادیٔ لولاب کو دیکھنے کا بھی ایک سنہرا موقع عطا فرمایا۔ اس کی تحریک دو ایک باتوں سے سالہا سال قبل ملی تھی۔ اول یہ کہ اس وادی کو خدا تعالیٰ نے یہ شرف بھی بخشا کہ یہاں اپنے وقت کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت

یعنی امام العصر، محدثِ کبیر اور اسلام کے بطل جلیل علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری پیدا ہوئے تھے جو کہ اسلامی علوم وفنون کے ایک درخشاں آفتاب کی طرح مطلع علم پر اپنی عمر عزیز میں چمکتے رہے اور اپنی علمی ضیا پاشیوں سے سارے برصغیر ایشیاء کو منور کرتے رہے بلکہ برصغیر سے باہر بھی تشنگانِ علم کو سیراب کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ فرزندِ اسلام حضرت علامہ اقبالؒ کی نظم بھی پڑھ لی تھی، جس کے آغاز میں علامہ مرحوم لکھتے ہیں:

پانی تیرے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
اے وادیٔ لولاب اے وادیٔ لولاب

''یہ نظم دراصل علامہ اقبال نے حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے تئیں بطور خراج عقیدت لکھی ہے''۔

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

چونکہ اپنی عقیدت کی بناء پر مجھے کئی سال قبل حضرت علامہ کشمیریؒ کے مقبرہ واقعہ دیوبند پر حاضری کا شرف حاصل ہوا ہے، جہاں یہ اسلام کا مہر درخشاں اپنے دیگر اہل خانہ کے ساتھ محو خواب ہے۔ چند سال قبل ان کے دوسرے فرزند شیخ الحدیث حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ بھی انتقال فرما کر اسی مقبرے میں دفن کر دیئے گئے۔ اپنی حاضری کے موقع پر یہ عاجز مولانا انور شاہ صاحب مرحوم جیسے فقید المثال عالم دین کو ایصالِ ثواب کے طور پر تلاوتِ قرآن اور بلندیٔ درجات کی دعا کے بغیر اور کیا پیش کر سکتا تھا۔ بزرگوں نے فرمایا ہے۔ ع

بہ جنازہ گر نہ آئی بہ مزار خواہی آمد

اور دو دفعہ اس مزار پر انوار پر حاضری دے کر زیارت قبور کی مسرت بھی حاصل ہوئی تھی۔

اپنے دلِ ناصبور میں تمنا کو انگڑائیاں لیتے ہوئے دیکھ کر حالیہ ایام میں ارادہ کیا اور وادیٔ لولاب کی طرف رختِ سفر باندھ لیا۔ سرینگر سے نان اسٹاپ بس میں بیٹھ کر نارہ بل پہنچ گیا، جہاں سے کپواڑہ تک نوے کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ راستے میں دورانِ سفر نا معلوم کن کن خوابوں اور خیالات کی دنیا میں کھو گیا، ساتھ ہی ساتھ سوپور کی راہوں سے ہماری گاڑی بطرف کپواڑہ رواں دواں تھی، چلتے چلتے قدرت کے حسین مناظر اور خوش نما باغات اور ہرے بھرے دھان کے کھیت اور سیب کے باغات دل کو بہلاتے رہے اور اونچے اونچے پہاڑوں کا منظر بھی نگاہوں کو بہت خوب بھاتا تھا۔ غرض ؎

معصوم نظاروں میں یوں ہی کھو گیا میں بھی
جیسے ترا اک جزوِ حسیں ہو گیا میں بھی
صدرشک ترے قرب سے ہے عظمتِ تقدیر
اے جنتِ کشمیر

محدث کبیر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے آبائی گاؤں ''ورنو'' اور ان کی رہائش گاہ کو دیکھنے کا جذبہ بے تابانہ دل میں لیے ہوئے میں طویل سفر کو طے کرتے ہوئے کپواڑہ پہنچ گیا۔ اس دوران میرا میزبان درد پورہ، لولاب کا رہنے والا محترم عبدالحمید مجھے وقفے وقفے سے برابر ٹیلی فون کرتا رہا اور وہ برابر میرا انتظار کرتا رہا۔ مولانا محمد انور شاہ کی یادوں سے بھرپور اپنے جذبات کو گوشۂ دل میں چھپائے ہوئے میں نے ''ورنو'' کے بجائے پہلے درد پورہ لولاب کے سفر پر روانگی کا ارادہ کیا، مگر روانگی سے قبل کپواڑہ کے ڈاک خانہ میں داخل ہو گیا، چونکہ راقم السطور نے چالیس سال سے زیادہ محکمہ ڈاک میں پوری فرض شناسی سے اپنی ملازمت کی معیاد پوری کی ہے اور ایک سبکدوش شدہ ملازم کی حیثیت سے ڈاک خانہ کپواڑہ میں انچارج پوسٹ ماسٹر کے ساتھ متعارف ہوا، موصوف ایک بااخلاق اور ملنسار شخص ہے، جوش اخلاقی کے ساتھ مجھے جوس کی ایک بوتل پیش کی اور ان کے اپنے گھر پر آنے کی دعوت بھی دے دی۔ ان کا نام محمد یسین بابا ہے مگر ڈاک خانہ کی حالت آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی

جوں کی توں ہے' حالانکہ اب اکثر ڈاک خانوں کو جدید لائنوں پر استوار کیا گیا ہے مگر کھیا ڈاک گھر ہونے کے ناطے بھی کپواڑہ کے اس ڈاک خانہ کی ترقی اور تعمیر کی طرف ابھی محکمہ کی طرف سے توجہ نہیں دی گئی ہے اور یہ پرانے طرز کے کباڑ خانے کے مانند نظر آتا ہے' جس کے لوگوں کے ذہن و دل پر منفی اثرات پڑ سکتے ہیں۔ خیر ملازمین ڈاک خانہ سے کچھ رہنمائی لے کر میں گاڑی میں بیٹھ کر درد پورہ کی راہوں پر عازم سفر ہو گیا۔ ہر سو قدرت خداوندی کے حسین و جمیل اور پُرکشش مناظر مجھے مسحور کرتے رہے اور ہر گام پر دعوت فکر دیتے رہے' خوب صورت باغات' اخروٹ کے پُرثمر درخت' سیبوں کے خوش نما اور گھنے باغات جگہ جگہ نظر آتے گئے' بیچ بیچ میں ساگ زار اور دیگر اگائی ہوئی سبزیوں کے باغیچے' نگاہوں سے دور ہر طرف بلند و بالا پہاڑ اور ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر قطار در قطار خود رَو درخت اور ان کے نظارے میرے دل کو تہہ و بالا کر رہے تھے۔ دراصل درد پورہ لولاب کی راہوں پر دورانِ سفر میرے دل کا چھپا ہوا درد جاگ اٹھا' درد اس بات کا کہ ایک طرف قدرت کے فیاض ہاتھوں نے اس وادی بے نظیر کو کس طرح ایک نویلی اور پر جوبن شہزادی کی طرح سجایا ہے اور رنگین اور خوب صورت مناظر سے مالا مال کیا ہے تو دوسری طرف اسی اشرف المخلوقات کا لقب پانے والے انسان کے بے رحم ہاتھوں سے اس کی حسن اور خوب صورتی کو ملیامیٹ کیا جاتا ہے' یہ بے رحم ہاتھ اور زور آزما پنجے درندگی کی مانند لہلہاتے کھیتوں پر سرسبز جنگلات کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

فارسی شعراء نے اپنے کلام میں اس کی خوب صورتی کا برمحل پر بھرپور تذکرہ کیا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

یا

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است با بال و پر آید

بات کو طول دیئے بغیر اور قدرت کی کاری گری کو دیکھتے دیکھتے کوئی ایک گھنٹے کے بعد میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ ذرا دم لے کر پھر دار العلوم النظریہ کے مقام پر اپنی ظہر کی نماز سے فارغ ہوا اور اتنے میں میرا میزبان بھی وہیں پر آ پہنچا اور اپنے ہمراہ مجھے اپنی رہائش گاہ پر لے گیا' میزبان نے اپنے اخلاق کریمانہ سے میری مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چائے اور گھر میں بنائی ہوئی (روٹیوں) پھلکوں جو کہ گھی ڈال کر تیار کی گئی تھی' میری خاطر تواضع کی' ان کا گھر کیا ہے جنگل کے بیچوں بیچ دیودار کی لکڑی سے تعمیر شدہ ایک سیدھا سادا مکان ہے جو کہ کئی کمروں پر مشتمل ہے۔ ایک سادگی کا عالم ہے' پرانے طرز تعمیر کا ایک نمونہ جو کہ زمانہ ماضی کی بلا تکلف زندگی کی یاد دلاتا ہے' دہائیاں گزرنے کے باوجود بھی یہ گاؤں آج بھی بجلی کی سہولیات سے محروم ہے۔ صاحب موصوف کے گھر سولر سسٹم سے بجلی فراہم ہوتی ہے' مکان کے باہر وادیٔ لولاب کے بلند اور خوب صورت پہاڑ ہر طرف نظر آتے ہیں اور گھنے جنگلوں سے یہ وادی بہت اچھی لگتی ہے' یہ نظارے آدمی کی نظروں کو چکا چوند کر دیتے ہیں۔ خیر چائے نوشی سے فارغ ہو کر یہ راقم السطور تازہ دم ہو گیا۔ اس کے بعد عصر کی نماز سے فراغت پائی۔

غور طلب اور قابل توجہ:

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

میرا میزبان عبدالحمید اپنے گھر سے دور مجھے اس گھنے

جنگل کے ایک بالائی حصے کے سرسبز اور خاموش میدان کی طرف لے گیا' ہر چند میرے لیے اس کی بلندی پر چڑھنا قدرے دشوار تھا مگر ہمت سے کام لے کر یہ مرحلہ بھی آسان ہو گیا' اونچے اونچے اور گھنے دیوداروں کے مانند درختوں سے گھرا ہوا یہ جنگل بہت ہی پُر رونق تھا' بھینی بھینی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے چلنے کی سرسراہٹ کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی تھی اور ان فرحت رساں ہواؤں سے میرے دل کے غنچے تروتازہ ہو رہے تھے۔ ادھر چھوٹے چھوٹے پہاڑی لڑکے اور لڑکیاں اپنے سروں پر سوکھی ہوئی لکڑی کے گٹھے سروں پر لاد کر بالائیوں سے نیچے کی طرف آ رہے تھے۔ چند نوجوان پہاڑی لڑکوں کو بھی دیکھا جو اپنی اپنی کمر پر کپڑوں میں بندھے ہوئے جنگلی جڑی بوٹیوں سے پُر چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں لے کر اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ ان جنگلوں میں چھوٹی چھوٹی مگر صاف اور شیرین پانی کی ندیاں بھی بہہ رہی تھیں' گھومتے گھومتے محترم میزبان نے اس جنگل کی ایک اور بلندی پر چڑھنے کے لیے آمادہ کیا۔ ایک ایسی پُراسرار جگہ دکھائی جہاں ایک خدامست فقیر رہا کرتا ہے' یہ فقیر انہی جنگلوں او صحراؤں میں گھومتا پھرتا بھی ہے' اس پُراسرار جگہ پر مذکورہ فقیر نے ٹین سے بنائی گئی چہار دیواری کے اندر پہلے ہی اپنی لحد کھدوا کے رکھی ہے اور اس کے اوپر موٹی لکڑی کے تختے بچھا کے رکھے ہیں' ٹین سے ہی اس احاطہ کی چھت بندی بھی کی گئی ہے اور فقیر نے بوقت انتقال ان کو اسی جگہ دفن کرنے کی بھی وصیت کر رکھی ہے۔ یہاں اور بھی دو ایک بزرگ اپنی اپنی قبروں میں محوِ خواب ہیں' یہ ایک سنسان جگہ ہے' راقم نے یہ بھی سنا جب اللہ کا یہ پیارا او راس کی رضا کا طالب یہ بندۂ خدا یہاں اس مقام پر قیام کرتا ہے تو کبھی کبھی ایک شیر بھی اس کے ساتھ یہاں بیٹھا کرتا ہے اور اس دوران ملاقاتی حضرات فقیر کی خدمت میں بیٹھ کر اپنی غرض و غایت بیان کرتے ہیں مگر اس وقت شیر کی مجال نہیں ہوتی ہے کہ کسی کو چھیڑنے کی حرکت کرے۔ اس خدا دوست کے کشف وکرامات کے بارے میں بھی سنا جن کی یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ فقیر مستورات کے ساتھ کوئی بات چیت یا کلام نہیں کرتا ہے' فقیر کے بارے میں یہ بھی سنا کہ اکثر قبرستانوں میں پھرتا رہتا ہے۔

غرض بقول علامہ اقبال ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

کرشمۂ خداوندی کا ایک اور نمونہ:

جنگل کی تنہائیوں اور پُراسراریت سے نکل کر صاحب خانہ کے گھر پہنچ گیا اور رات کو وہاں قیام کر کے دوسرے روز اپنی منزل مقصود کی طرف چلنے سے قبل میرے میزبان نے میری ملاقات اپنے چچا سے کرائی جن کا نام غلام علی لوہار ہے۔ یہ بندۂ خدا اس کے اپنے بیان کے مطابق ڈیڑھ سو برس کا ہے۔ میرے استفسار پر اس نے اپنی زندگی میں ہوئے تین دفعہ بندوبست اراضی کی بات سنائی جو کہ بقول اس عمر رسیدہ شخص کے اس کی حیات میں ہر چالیس سال کے بعد انجام دی گئی تھی اور پہلی بندوبست کے موقع پر ٹھیک تیس سال کی عمر کا تھا' اس طرح موجودہ دور تک اس کی عمر ڈیڑھ سال بنتی ہے۔ اس شخص کے نئے دانت بھی نکل آئے ہیں اور آج بھی چند نئے دانت نمودار ہو رہے ہیں' اپنی صحت کے لحاظ سے مجھے وہ بہت کمزور نظر آیا اور اس کی آنکھوں سے بھی اس کی کمزوری جھلکتی تھی' چھڑی کے سہارے دھیرے دھیرے چل رہا تھا' پھٹے پرانے اور بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس تھا اور اس کے تن بدن سے غربت اور مفلسی ٹپک رہی تھی۔ اس کی شریک حیات بھی عمر رسیدہ ہے۔ اس رنگین اور فنا پذیر دنیا میں چشم بصیرت رکھنے والوں کے لیے کتنے ہی سامان ہیں۔

جانب ورنو:

کافی تھکاوٹ کے باوجود میرا ذوق مجھے اسلام کے بطل جلیل اور علمائے دیوبند کے سرخیل علامہ انور شاہ کے آبائی گاؤں اور ان کی رہائش گاہ کی طرف 'ورنو' پہنچنے کی مہمیز دے رہا تھا۔ اپنے اندرونی کرب اور درد کے تقاضا کے پیش نظر میں نے تھکن کے باوجود اور گرمی کی شدت کو سہتے ہوئے اپنے قدم اٹھائے' کچھ پیدل سفر کر کے اور کچھ سومو کا سہارا لے کر درد پورہ سے واؤورا پہنچ گیا۔ جہاں سے مجھے 'ورنو' کے لیے سومو پکڑنا تھا مگر کھلی دھوپ اور کچھ چھاؤں میں رہ کر طویل انتظار کے باوجود سومو یا اور کوئی ذریعہ ٹرانسپورٹ میسر نہیں ہوا' ایک طرف یہ دقت اور ایک طرف اپنی دیرینہ خواہش کی باہمی کشمکش دل ناصبور نے یہی فیصلہ لیا کہ واؤورا (Wawoora) سے کیوں نہ براہِ راست کپواڑہ واپس چلوں' کسی تاخیر کے بغیر ایک سومو گاڑی میں سوار ہو گیا اور کپواڑہ پہنچ گیا اور یہاں تک یہ کوئی بائیس کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ کپواڑہ پہنچ کر ایک مقامی ہوٹل میں کھانا کھایا اور مسجد جامع میں ظہر کی نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ جہاں جماعت اسلامی کا سالانہ اجلاس چل رہا تھا۔ لوگوں کی ایک خاصی تعداد مسجد اور مسجد سے باہر موجود تھی۔ کپواڑہ کے پُر ہجوم بازار کا بھی مشاہدہ کیا اور فراغت پا کر اپنی خواہش اور تمنا کی تکمیل کی غرض سے ایک سومو میں سوار ہوا اور بے تابانہ جذبات اور امنگوں کے ساتھ 'ورنو' کی جانب روانہ ہوا۔ گاڑی میں بیٹھ کر دائیں بائیں از سر نو پُر رونق اور مست و مدہوش نظاروں میں کھو گیا۔ نظروں سے دُور بلند پہاڑ اور ان پہاڑوں پر اونچے اونچے درختوں کی قطاریں' پہاڑوں کے دامن بھی ہرے بھرے سبزہ زاروں سے مخملیں چادروں کا بچھا ہوا منظر پیش کر رہے تھے۔ پھر دھان کے وسیع اور عریض لہلہاتے کھیت' بیچ بیچ میں کہیں کہیں بھیدوں کے سرسبز درخت' دائیں بائیں بہتی ہوئی چھوٹی چھوٹی ندیاں' یہ مناظر اور نظارے بہت پُر فریب تھے' شہ زور کشمیری نے وادی کشمیر کے زیر عنوان ایک طویل نظم میں حسن پسندی کا اظہار کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کریں ؎

تیری ہر شام مستی اور رنگ و بو میں پلتی ہے
تری ہر رات گویا کیف کی موجوں میں ڈھلتی ہے
گلوں کی انجمن اور چاند کی سیمیں ضیا باری
کہ حوروں کے شبستان میں یہ شمع نور جلتی ہے
جمال وشان حق ظاہر ہے آب ورنگ سے تیرے
صدا تکبیر کی آتی ہے خشت وسنگ سے تیرے

بہر صورت نظاروں کی دل بستگی کے ساتھ ساتھ میرا سفر طے ہوا اور ایک مقام پر پہنچ کر 'ورنو' کے گاؤں چلا گیا۔ تھوڑی سی پیدل مسافت طے کر کے اور معلومات حاصل کر کے یکا یک میری متجسس نگاہیں ڈیڑھ سو سالہ قدیم عمارت پر ٹھہر گئیں جس کو حضرت علامہ انور شاہ کی جائے تولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ مکان بڑے سائز کا ہے اور تین منزلہ ہے' دیوار کی لکڑی سے یہ تعمیر شدہ ہے' حالانکہ بوقت ضرورت اور کہیں کہیں خستہ حالی کو دیکھ کر مرمت سے بھی کام لیا گیا ہے۔ یہ عمارت تاریخی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ یہاں ایک فقید المثال اور علمی شخصیت نے جنم لیا ہے جس کے علمی اور دینی چشمۂ فیض سے بڑے بڑے اور جلیل القدر اساتذہ' مفسرین اور محدثین فیض یاب ہوئے ہیں۔ ان کے علمی کمالات' درس حدیث' حالات و واقعات' علمی یاداشتوں پر مشتمل کتابیں معرض وجود میں آچکی ہیں' خاص کر اپنے وقت کے فلسفی شاعر اور اسلام اور قرآن کے شیدائی علامہ محمد اقبال بھی مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی عالمانہ شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات پر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دوسرے ایک اور بزرگ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ نے وفات

کی خبر سن کر فرمایا تھا:

''صحابہ کا قافلہ جارہا تھا اور یہ پیچھے رہ گئے تھے''۔

اسی طرح اپنے باذوق قارئین کی ضیافت طبع کے لیے شورش کشمیری کے درج ذیل مدحیہ اشعار قلم بند کرتا ہوں ؎

حاشیہ بردار دربار رسول اللہؐ کا
ماضیؒ مرحوم کے اعجاز دکھلاتا رہا
آدمی کے روپ میں قدرت کا روشن معجزہ
علم کی ہیبت سے رزم وبزم پر چھاتا رہا
سادگی میں عہد اول کے صحابہ کی مثال
سیرت پیغمبرؐ کونین سمجھاتا رہا
یہ جہاں فانی ہے کوئی چیز لافانی نہیں
پھر بھی اس دنیا میں انور شاہ کا ثانی نہیں

حضرت مولانا محمد انور شاہؒ کے اس آبائی مسکن میں اندر جا کر تھوڑی دیر بیٹھنے کا موقعہ بھی ملا اور یہاں اس تاریخی اور یادگار عمارت میں پانی پینے کی سعادت حاصل ہوئی' یہاں سے نکل کر مجھے ایک دوسرے مکان میں لے جایا گیا جہاں حضرت علامہ مرحوم کے رشتہ دار تھے۔ انہوں نے میری مہمان نوازی کی اور رات کو قیام کرنے پر اصرار کیا' مگر میں نے عدیم الفرصتی کی وجہ سے ان سے رخصت لے لی۔ دو تین حضرات کرام مسلم مہمان نوازی کے جذبے سے سرشار میرے ساتھ باہر نکلے اور مجھے علامہ انور شاہ کے والد محترم کا مدفن دکھایا' آیات بینات کی تلاوت کر کے اس کا ثواب میں نے صاحب قبر کی روح کو بخش دیا۔

خدا کے فضل سے میری مدتوں کی تمنا بھر آئی' رب کائنات نے قرآن مقدس میں مقدس آثار اور روحانی مقامات کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی نظر سے راقم نے بھی اس فیض رساں مقام کا نظارہ کیا۔

یہ مدفن بھی اندرونی سڑک کے کنارے بلندی پر ہے لکڑی کے چبوترے سے اس کو باندھا گیا ہے اور اس کے اندر خالص مٹی کے نیچے کسی پتھر وغیرہ کے بغیر یہ بزرگ ہستی آسودہ ہے۔ اس پر کیکر کے درخت اُگ آئے ہیں' اس موقع پر مجھے مرزا غالب کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ گیا۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

میں غور وفکر کر کے بحر عمیق میں ڈوب گیا کہ کیسے کیسے اولوالعزم دنیا میں آئے اور کارہائے نمایاں انجام دے کر آخر منوں مٹی کے نیچے دب کر رہ گئے اور اپنے کارناموں کی وجہ سے دنیا میں نقشِ دوام چھوڑ کر چلے گئے۔ قبر سے باہر ایک آویزاں تختی پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
ہوالمعظم
شیخ الشیوخ حضرت مولانا معظم شاہ صاحب سہروردی
والد ماجد حضرت علامہ انور شاہ کشمیری
بتاریخ ۱۷ ذی الحجہ بروز جمعتہ المبارک ۱۳۵۶ھ
ازفردوس زمین بجانب فردوس بریں
رحلت فرمود نور اللہ مرقدہ وطالب ثراہ

اَلحَمدُ لِلّٰہ مدتوں کی تمنا پوری ہونے کے بعد یہ رہ نورد مسافر اس مزار مقدس کو چھوڑ کر اور صاحبان خانہ سے رخصت لے کر نیک جذبات کی سوغات لیے روانہ ہوگیا حالانکہ اصرار یہ تھا کہ گاڑی نہ ملنے کی صورت میں لوٹ آؤں مگر تھوڑے سے انتظار کے بعد ایک تیز رفتار سومو میں جگہ مل گئی اور 'ورنو' لولاب سے لمبی مسافت طے کر کے میں کپواڑہ پہنچ گیا مگر وہاں پر سرینگر کے لیے اس وقت کوئی بھی ذریعہ ٹرانسپورٹ نہیں تھا۔ کئی حضرات نے سیدھا سوپور جانے کا مشورہ دیا جہاں سے سرینگر

کے لیے گاڑی ملنے کی پوری امید تھی مگر پھر بھی سوپور پہنچ کر اندھیرے میں کوئی بندوبست نہیں ہوسکا۔ اور مجبوراً مجھے سوپور میں بمقام عشہ پیر صاحب اپنے رشتہ دار جاوید احمد وانی کے یہاں رات کو قیام کرنا پڑا' دیر گئے رات وہاں پہنچ کر ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ مصافحہ اور بغل گیری کے ساتھ ساتھ ساتھ اندر سے دونوں جانب گرم جذبات کی رو چل رہی تھی' توقع سے زیادہ مہمان نوازی اور خاطر تواضع ہوگئی اور باہمی طور پر خیر و عافیت دریافت ہوگئی۔ صبح ناشتہ کرنے کے بعد سوپور سے روانہ ہوگیا اور اپنے ایک دوست سے بغرض ملاقات بارہمولہ کی جانب نکلا۔ فوجی کانوائے کی وجہ سے ہمارے ڈرائیور کو متبادل راستہ اختیار کرنا پڑا اور وہ سیر جاگیر سوپور کے راستے سے بارہمولہ پہنچ گیا۔ معلوم کر کے اپنے دوست کا پتہ حاصل کیا' میرا یہ دوست معروف قلم کار' ادیب' شاعر او ردو جلدوں پر مشتمل کتاب ''جلاوطن'' کا مصنف خالق پرویز ہے' اس کی شخصیت بھی ایک محیر العقول شخصیت ہے' دہائیاں قبل یہ آدم ذات کن سختیوں' کن دشواریوں اور ناقابل بیان مشکلات سے ٹکرا ٹکرا کر وقت کے ظالم حکمرانوں کے اذیت ناک پنجوں سے بچنے کے لیے پاکستان کی طرف دھکیلا گیا تھا اور سالہا سال وہاں گزارنے کے بعد کس طرح اپنے وطن مالوف یعنی کشمیر اور کن دشوار گزار راستوں اور پہاڑوں سے واپس آیا تھا۔ یہ ساری سچی اور حیرت انگیز داستان ستم والم انہوں نے اپنی جلاءوطن کتاب میں رپورتاژ کی صورت میں قلم بند کی ہے اور یہ کتاب بہت ہی سبق آموز او ر دلچسپ ہے۔ اپنے اس مہربان قلم کار دوست کے دولت خانہ پر پہنچ کر باہم کافی گرم جوشی اور مہمان نوازی کا مظاہرہ ہوا' یہاں سے نکل کر ہم دونوں ایک ساتھ حضرت جانباز ولیؒ کی درگاہ پر بہ صد عقیدت و احترام حاضر ہوگئے اور رب کریم کے دربار میں اپنی مرادیں مانگیں۔ علامہ اقبالؔ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

قبلۂ شاہ و گدا مظہر اطرافِ ازل
کعبۂ اہل صفا روضۂ جانباز ولی
دربار شہنشاہی سے خوشتر
مردان خدا کا آستانہ

اپنے وقت کے ایک سیاسی رہنما اور حریت پسند جناب مبارک شاہ کی قبر بھی اس درگاہ کے مقبرے میں ایک کنارے پر نظر آگئی۔ اپنے دوست سے رخصت لے کر اور دل نواز یادوں کی بارات لے کر بارہمولہ سے میں سرینگر کی جانب گھر کے لیے چل نکلا۔ ۵۴ کلومیٹر کا یہ طویل سفر کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوگیا اور میں خدا کی نوازشوں سے بخیر و عافیت سرینگر سے نوشہرہ اپنے گھر واپس پہنچ گیا اور اس طرح میرا یہ ارمان بھرا دورۂ لولاب ایک یادگار سفر بن گیا۔

پہلگام (ص 201 سے آگے)

یہاں اس عالیشان دل کش مناظرِ قدرت سے مالا مال بے تاب ویلی سے نظریں اوپر اٹھا کر پہاڑ کے ساتھ ساتھ سڑک تعمیر شدہ ہے اور اسی راستے سے ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے آنے والے یاتری امرناتھ گھپا تک درشن کی نیت سے ہزاروں کی تعداد میں سالانہ آتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ دو مہینوں سے زیادہ تک جاری رہتا ہے۔ یہاں کے مقامی باشندوں کے لیے یہ ایام روزگار کمانے کا وسیلہ فراہم کرتے ہیں۔ اب شام کا وقت بھی قریب آ رہا تھا اور گھنے اور پر رونق جنگل نما پہاڑوں میں آفتاب کچھ روپوش ہونے لگا تھا۔ یہ ایک دن کا تھکا دینے والا مگر پُرلطف اور یادگار سفر یہاں پر ختم ہوتا ہے۔ یہاں سے نکل کر ہم نے بطرف سرینگر گاڑی کا رخ موڑا اور کسی رکاوٹ کے بغیر ہم دیر گئے رات اپنے گھر پہنچ گئے اور اس ایک دن کے یادگاری سفر نے میرے ذہن و دل میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

دورۂ پہلگام

گذشتہ پانچ مہینوں سے جاری عالم گیر کورونا وائرس کی وجہ سے خطہ کشمیر کے باشندگان بھی گھروں میں محصور ہو کے رہ گئے ہیں۔ بازار، سرکاری دفاتر، سکول اور کالج بالکل بند نظر آتے ہیں گو کہ سرکاری احکامات کے تحت اب اس صورت حال میں کسی حد تک نرمی برتی جارہی ہے اور عوام الناس کی روزمرہ مشکلات کو دیکھتے ہوئے رہنما خطوط جاری کیے گئے ہیں۔ راقم السطور بھی طویل بندشوں اور گھریلو ماحول میں ہی محصور رہنے کی بناء پر اپنے گھر اور علاقہ سے ذرا کچھ دور جانے کی تمنا کرنے لگا اور بے چارہ دل کسی صحت افزا مقام پر جانے کی انگڑائیاں لینے لگا۔ اپنے افراد خانہ کے ساتھ مشاورت کے بعد پہلگام جانے کا ارادہ باندھا اور بالآخر گذشتہ ہفتے کی اتوار (۲۳ راگست ۲۰۲۰ء) کو چند افراد خانہ اور بال بچوں کو تیار کر کے کچھ ضروری لوازمات اور خورد ونوش کے بندوبست کے ساتھ ہم اپنے پروردگار عالم کا نام لے کر عازم سفر ہوئے اور ٹھیک صبح آٹھ بجے رختِ سفر باندھ کر گھر سے روانہ ہو گئے۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کر کے ہم براستہ بٹوارہ بطرف اننت سڑک پر رواں دواں تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے دائیں اور بائیں سرسبز اور پُر بہار چناروں کے درخت نظر آ رہے تھے اور سڑک پر زیادہ تر پرائیویٹ گاڑیوں، سکوٹروں اور بائیکوں کا رش نظر آ رہا تھا۔ سونہ وار کے راستے سے ہی درختوں کی ہریالی جوبن پر تھی۔ پہنچتے پہنچتے ہم اتھواجن پہنچ گئے۔ یہاں سڑک کے بائیں کنارے پر ایک بالائی حصے پر شاعر کشمیر پیرزادہ غلام احمد مہجور کا مزار نظر آتا ہے۔ کشمیر کے اس نامی گرامی شاعر کو اگرچہ بعد از وفات اپنے آبائی گاؤں مِتری گام پلوامہ میں ہی دفن کیا گیا تھا مگر اُس زمانے کے ڈپٹی پرائم منسٹر مرحوم بخشی غلام محمد کی صوابدید اور احکامات سے اس قدر ومنزلت والے شاعر کو قبر سے واپس نکال کر شہر سرینگر کے اتھواجن علاقے میں ہی سڑک کے کنارے از سرنو سپرد خاک کیا گیا تھا۔ کئی دانش ور حضرات اور راقم السطور کی رائے میں حضرت مہجور کشمیری کی تدفین کے لیے آخری آرام گاہ کی یہ جگہ موزون نہیں ہے۔ یہ سارا مقبرہ اور اس پر تعمیر شدہ چھوٹی سی عمارت دن بھر کے ٹریفک کی وجہ سے گرد وغبار سے اٹی رہتی ہے اور یہاں دن بھر گاڑیوں وغیرہ کا شور شرابہ رہتا ہے۔ آخر ایک زندہ اور باشعور قوم پر اپنے بزرگوں، محسنوں اور شعراء کرام کا بھی حق ہوتا ہے اور ایسی شخصیات کی تدفین کے لیے مناسب جگہوں اور مقامات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ مہجور کشمیری نے بھی اپنی کشمیری شعر وشاعری کے ذریعہ اہالیان کشمیر کے جذبات کی بھرپور ترجمانی کی ہے اور ان کو زندگی اور زندہ دلی کا ایک عظیم پیغام دیا ہے۔ نمونہ کے طور پر اس دردمند شاعر کے درج ذیل کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں ۔

ولو ہا باغوانو نو بہارُک شان پیدا کر
پھلن گل گتھ کرن بلبل ترتھی سامان پیدا کر
کری کُس بلبلا آزاد ژ پنجرس منز نالان چھک
ژپنہ نے دستہٕ پنہ نن مشکلن آسان پیدا کر

اسی طرح ان کے یہ اشعار بھی پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہیں ۔

بلبلن دوپ گلس حُسن چھے پوٗر
کیاہ وَنے زو چھے نہٕ سُے چھے قصور

بے زبان ییتہٕ چھنہ زِند روزان
مار متہٕ وار وتہٕ لاگ میون پان

بہر حال یہ ضمنی طور پر دورانِ تحریر بات آ گئی اور میں یہ لکھنے کی طرف متوجہ ہو گیا کیونکہ انسان کی اپنی زندگی ہی دراصل ایک سفر نامہ ہوتا ہے اور گردش لیل ونہار کے درمیان انسان کو اپنی زندگی کے مشاہدات اور تجربات بھی یاد آتے رہتے ہیں اور انسان کے ضمیر کو یہ چیزیں بیدار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہاں سے نکل کر ہم چلتے رہے۔ سڑک کی دائیں جانب دریائے جہلم کا بہتا پانی نظر آرہا تھا مگر حالیہ بارشوں کی وجہ سے سارا پانی گدلا اور مٹیالا ہو گیا تھا اور پانی کی سطح بھی بڑھ گئی تھی۔ سفر کو جاری رکھتے ہوئے ہم لیتہ پورہ پہنچ گئے جہاں سے پہلگام تک ۷۷ کلو میٹر باقی رہ گئے تھے۔ لیتہ پورہ اور اسی سے آگے دائیں بائیں دوکانات نظر آ گئے اور ان پر سائن بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر زعفران کے بارے میں لکھا گیا تھا اور اکثر و بیشتر یہاں پر زعفران کی فروخت کا عندیہ ملتا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ سڑک کے ہر طرف ہندوستانی فوج کے چاک و چوبند جوان نظر آرہے تھے جو کہ اپنی وردیوں میں ملبوس تھے اور دیکھ ریکھ میں مشغول نظر آتے تھے۔ اُن کے معمولی سے اشارے پر گاڑیوں کو ایک دم رکنا پڑتا تھا اور کہیں کہیں پوچھ تاچھ اور تلاشیوں کا سلسلہ بھی حسب معمول چل رہا تھا۔ دوسری طرف میری نگاہیں سڑک پر بھی رک جاتی تھیں۔ مجھے تار کول بچھائی ہوئی سڑک بہت خوب صورت لگ رہی تھی اور اس کشادہ سڑک کو بیچ میں سے سفید روغنی لکیر کا نشانہ لگا کر تقسیم کر کے یک طرفہ آمدورفت کے لیے بہت آسان بنایا گیا ہے اور بہت حد تک حادثات یا ٹکراؤ سے حفاظت بھی ہو سکتی ہے۔ تار کول پر سفید روغن سے موٹی موٹی لکیریں بھی کھینچی گئی ہیں اور ان سے سڑک کی خوب صورتی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ چپ و راست میں سرسبز اور بلند و بالا سفیدے کے درخت بھی خوب صورت نظارہ پیش کر رہے تھے۔

اونتی پورہ اور بیج بہاڑہ کے راستوں سے گذرتے ہوئے ہمیں کئی صعوبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا عام ٹریفک کے پیچھے چلتے ہوئے ایک دو مقامات پر ہمیں فوجی جوانوں کی طرف سے روک دیا گیا۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد پتہ چلا کہ ہمارے پیچھے پیچھے ملٹری کا نوائے چل رہی تھی۔ ملٹری گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں سست رفتاری کے ساتھ محوِ سفر تھیں۔ تمام پرائیویٹ گاڑیوں اور دیگر ٹرانسپورٹ ذرائع کو کانوائے کے ختم ہونے تک روک کر ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔

حالانکہ دیکھنے میں یہ بھی آ گیا کہ ہماری سڑک کی دوسری جانب مخالف سمت سے ملٹری کانوائے آرہی تھی اور ہم سڑک کے اِس پار دوسری جانب بلاوجہ روک دیئے گئے۔ دوسری جانب حکومت کی طرف سے عوام کی سہولیات کے لیے بلند بانگ دعوے کیے جاتے ہیں ؎

پھر نظر آئے گی کب بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھولیں گے کتنی برساتوں کے بعد

گلشن کشمیر کے لالہ زاروں میں پھڑ پھڑانے والی بلبلیں اور بے رحم شکاریوں کے نرغے میں پھنسے جانور کسی بہار کی آمد کے انتظار میں ہیں اور سختیوں پر سختیاں جھیل کر اس خیال کے ساتھ امید کا دامن تھامے ہوئے ہیں مگر زمانہ ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر نہیں چلتا ہے ؎

وہ دور بھی دیکھا ہے تاریخ کی آنکھوں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

ہائے رے اپنی بے حسی اور مستی کا عالم:

ہم نے اننت ناگ کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اور ہی کوئی سیدھا راستہ اختیار کیا اور کسی سے پوچھے بغیر ہم رواں دواں سیدھے قاضی گنڈ پہنچ گئے اگر چہ یہ بھی حقیقت ہے کہ راقم سفر نامہ اور گاڑی چلانے والا میرا فرزند کئی بار اس راستے پر چل

کر براہ راست اننت ناگ سے ہوتے ہوئے پہلگام گئے تھے۔مگر آج کی بار نہ جانے کیسے سرمستی اور نظاروں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے کیسے اور کہاں قاضی گنڈ پہنچ گئے۔قاضی گنڈ پہنچ کر ہم دریافت کرنے لگے اور ہمیں واپس مڑ کر براستہ ویسو اننت ناگ پہنچنے کا بتایا گیا۔خیر حسب ہدایت ہم ایک جگہ پہنچ کر دائیں مڑ کر ویسو کے گاؤں سے چلنے لگے۔یہ بھی زندگی کا ایک کٹھن تجربہ ثابت ہوا۔کچی اور پکی سڑکوں پر ہم چل رہے تھے۔کسی جگہ سڑک تنگ تھی اور کسی جگہ کشادہ' رُک رُک کر اور تیز تیز پھر چلتے رہے اور بیچ میں آنے والے گاؤں کو بھی دیکھتے گئے۔ترقی کے باوجود بہت سارے لوگ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرتے ہیں۔جگی جھونپڑیاں اور پرانے مکانات بھی دیکھے۔زنگ خوردہ ٹین پوش مکانات نظر آرہے تھے۔کھیت اور کھلیان بھی پُر رونق تھے۔دائیں بائیں سرسبز درخت لہلہا رہے تھے۔پرانے اور بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے غریب لوگ بھی دیکھے۔یک منزلہ کچی اینٹوں کے مکانات بھی تھے اور دوسری طرف اونچے دو منزلہ' سہ منزلہ پکی اینٹوں کے سجے سجائے مکانات بھی دیکھ رہے تھے۔رنگین ٹین پوش بلڈنگیں بھی دیکھیں۔خوشحال گھرانے بھی دیکھنے کو ملے۔ہائے رے اللہ کی قدرت کہ وہی ذات باری تعالیٰ بانٹنے والی ہے کہ کس کو کیا ملے اور کون کیا کرے۔

کشمیری زبان کے جدید اور نامور شاعر دینا ناتھ نادمؔ کا یہ شعر میرے ذہن میں گونجنے لگا۔

ہُم بنگلہ چھِ آسن وال یُہند دُنیا چھُ اَلگ
یِمہ پہھر چھے زخمن کرال یُہند دُنیا چھُ الگ
ژیے تہِ واتِی کُنہ وِزِ وار ژ پکھ ہلہپار لگے

کچھ تھکن اور افسردگی کے ساتھ ہم ساڑھے گیارہ بجے اسلام آباد کے بازاروں میں پہنچ گئے۔ہم جنگلات منڈی سے دھیرے دھیرے گذر رہے تھے۔یہاں کا حال ہی عجیب تھا۔پُر رونق بازار'لوگوں کا ہجوم' گاڑیوں کی آمد ورفت' ہارن بجنے کی آوازیں' چھٹی یعنی اتوار کا دن ہونے کے باوجود یہاں ساری دکانیں کھلی نظر آرہی تھیں۔ہجوم اور دھکم پیل سے کافی بھیڑ بھاڑ لگ رہی تھی۔دکاندار' دوافروش' سبزی والے' میوہ فروش' ریڑے بان' چھاپڑی فروش غرض اسلام آباد کی رونق دوبالا لگ رہی تھی۔ادھر مہینوں سے وبائی بیماری کا پھیلاؤ' ادھر لوگوں کا ہجوم' حکومتی اعلانات اور راہنما خطوط کے باوجود عام لوگ اپنے حال میں مست' بہت لوگ ماسک پہنے بغیر خرید وفروخت میں مصروف تھے اور کئی ماسک پہنے اور دیگر ہدایات پر عمل پیرا بھی تھے۔

ان پُر ہجوم اور با رونق بازاروں سے دھیرے دھیرے نکل کر ہم K. P. Road اننت ناگ پر آگئے اور اللہ کے فضل وکرم سے پورے اطمینان کے ساتھ اب اپنی منزل مقصود یعنی صحت افزا مقام پہلگام کی طرف چلنے لگے۔اب میں دوبارہ قدرتی نظاروں میں کھونے لگا۔ہر طرف سبزا سبز نظارہ نظر آرہا تھا۔سفیدے کے درخت' بید کے لاتعداد درخت جن پر ہریالی ہی ہریالی تھی۔بہت سارے ساگ زار اور دیگر سبزیوں کے باغات' بہت سارے سیبوں کے باغات اور پر ثمر درخت اور گھنے باغات کہ دھوپ کا سایہ سطح زمین سے غائب تھا۔ساتھ ہی ساتھ مسافتوں کے ساتھ مساجد کے بلند وبالا مینار اور ان پر سجاوٹ کے لیے سبز رنگ اور روغن۔یہ مینار گولائی کی ساختوں کے ساتھ سج رہے تھے۔یہی مینار دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کی علامات ہیں۔ان بلند میناروں سے وحدہٗ لاشریک کی آوازیں ہشت پہر گونجتی رہتی ہیں اور رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی دی جاتی ہے۔ان مساجد میں باایمان بندگانِ خدا سر بہ سجود ہوجاتے ہیں اور اپنی لاچاری اور بے بسی کو سجدوں کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔دورانِ سفر ہمیں عیش مقام پہنچ کر

ولی کامل اور برگزیدہ شخصیت حضرت زین العابدینؒ ولی کا آستانہ بھی نظر آگیا جو کہ پہاڑ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں چڑھنے کے لیے تراشیدہ پتھروں کی اونچی اونچی سیڑھیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ وادی کشمیر میں اکثر مقامات پر اولیاء کرام کی آرام گاہیں موجود ہیں۔ ان نفوسِ قدسیہ نے اپنی محنت سے تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام دیا ہے اور اہالیانِ وادی کے دلوں میں ایمان و یقین کی جوت جگائی ہے۔ اکثر و بیشتر پاک باز اور پاک روح بندگانِ خدا نے پہاڑوں کی بلندیوں اور خلوت گاہوں میں سکونت اختیار کی تھی اور لوگوں کے ہجوم سے یکسو ہو کر یادِ خدا میں زندگی کی ساعتیں بسر کی تھیں جیسا کہ مفکر ملت نے اپنی شاعری میں یہ پیغام دیا ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

صدیوں سے لوگوں کے دلوں میں ان کی عقیدت اور احترام موجود ہے۔ پہلگام کی طرف چلتے ہوئے ہمیں ایک جگہ لکڑی کے دیوار پر بیٹھے کچھ بندر بھی دیکھنے کو ملے۔ اپنے بچوں کی دلچسپی اور خوشی کے لیے ہم نے گاڑی روک لی اور بچوں کی دل بہلائی کے لیے بندروں کو بسکٹ ڈال دیئے۔ بندر جھنڈ کی صورت میں جمع ہونے لگے مگر دو یا تین بندروں نے ہی ہماری پیش کردہ غذائیں منہ میں ڈال کر پیٹ میں پہنچائیں اور باقی بندر دیکھتے ہی رہ گئے۔ بچے لوگ شور مچا مچا کر تالیاں بجا رہے تھے اور کچھ اچھل رہے تھے۔ مخلوقات کی بہت ساری اور عجیب قسمیں اس روئے زمین پر نظر آتی ہیں۔ یہ ساری چیزیں اسی خدائے عز و جل کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے۔ ہم اپنی راہ پر چل رہے تھے۔ ادھر چلتے چلتے سڑک کی دائیں طرف ایک نہر یعنی نالہ لدر بھی سفر میں مصروف تھا۔ نہر کا پانی بالکل صاف ستھرا تھا اور نیلے رنگ کا تھا۔ تیز رفتاری کے ساتھ پانی رواں تھا۔ کوئی کوڑا کرکٹ، پالیتھین لفافے اس میں نہیں بہہ رہے تھے جیسا کہ شہر سرینگر کے دریاؤں میں نظر آتا ہے۔ دل چاہتا تھا کہ ذرا ایک بار اس صاف و شفاف پانی میں ڈبکی لگاؤں اور اس کی خنکی سے اندرونی گرمی کو ٹھنڈا کروں۔ مگر انسان کی بہت ساری خواہشیں پوری ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ سرینگر سے آرام دہ اور کٹھن راستوں کا سفر طے کرتے کرتے ہم لوگ ٹھیک دن کے ایک بجے اپنی منزل مراد یعنی پہلگام پہنچ گئے۔

پہلگام:

پہلگام وادی کشمیر کے گرمائی دار الخلافہ سرینگر سے ۹۴ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے اور اس مقام کی یہ لمبی مسافت طے کرنے میں دو تین گھنٹے لگ جاتے ہیں جب کہ ہم بیچاروں کو یہاں پہنچنے پر پانچ گھنٹے صرف ہو گئے۔ ضلع اننت ناگ سے پہلگام تک ۴۶ کلومیٹر کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ سطح سمندر سے یہ سیاحتی جگہ ۸۹۹۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے جو کہ میلوں کے حساب سے ۲۷۴۰ میل بن جاتے ہیں۔ ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ۵۹۲۲ افراد پر مشتمل ہے اور یہاں کی آب و ہوا بہت ہی مردم خیز ہے۔

پہلگام کا کیا لکھوں یہ ایک مختصر خطۂ زمین جنت نشان ہے۔ دراصل وادی کشمیر ہی خدا تعالیٰ کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ اس کی تعریف و توصیف میں فارسی اور اردو زبان کے قادر الکلام شعراء نے بہت کچھ لکھا ہے۔ فارسی شعراء کے یہ درج ذیل اشعار مدتوں سے ہماری سماعتوں سے ٹکراتے آئے ہیں مثلاً:

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است ہمیں است (عرفی)

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغِ کباب است باباِل و پر آید (ملا عرفی)

آبش چوں گلاب گشتہ رواں
خاکش زِ زمین جنت آوردہ نشان

اردو کے معروف شاعر چکبست لکھنوی کا شعر ہے۔

ذرہ ذرہ ہے میرے کشمیر کا مہمان نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

جناب عبدالاحد ساز بمبئی کشمیر کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

پیش نگاہ شوق ہے کشمیر کی بہار
گلزار، سبزہ زار، سمن زار، لالہ زار
کہسار، برف زار، شفق زار، آبشار
ہر جرعۂ نفس میں حیات آفرین خمار
پیش نگاہ شوق ہے کشمیر کی بہار
گلزار، سبزہ زار، سمن زار، لالہ زار
کہسار، برف زار، شفق زار، آبشار
ہر جرعۂ نفس میں حیات آفرین خمار
سرشاریوں میں کیف سا اک اضطرار کا
عشرت کدہ ہے یہ دل بے اختیار کا

زیر تحریر پہلگام کے بارے میں یہ دل نواز اشعار دل کے تاروں کو مضراب دے کر اندر ہی اندر موسیقی کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

کہسار سے گرا ہوا خطہ یہ پہلگام
ریوڑ، مکان، کھیتیاں، بازارِ خاص و عام
یوں سب کو ایک لے میں پروئے ہوئے خرام
آب زمردیں کا ترنم فضا خرام
کلفت کا روز و شب کی مٹاتی ہے جوں ملال
پس منظر حیات میں موسیقئ خیال

مگر بڑی دل سوزی کے ساتھ اپنے قلم کو یہ لکھنے پر مجبور پاتا ہوں کہ یہی فردوس بر روئے زمین کہلانے والی کشمیر کی وادی گذشتہ تیس سالوں سے آتش و آہن کے شور و غل سے گونجتی ہے۔ ناعاقبت اندیش اور شیطانی خصلت رکھنے والوں نے اس وادی گلپوش کو جہنم زار بنالیا ہے۔ یہاں درندہ صفت انسانوں نے اپنے ظلم وستم کے تیز تر پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ آہوں اور سسکیوں کی آوازیں ہیں۔ بے نام و نشان قبریں ہیں۔ جگہ جگہ نئے نئے قبرستان ابھر گئے ہیں۔ کیا اپنے اور کیا پرائے سب کو دیکھ کر انسانیت کا سر شرم سے جھک گیا ہے۔ کسی شاعر نے بجا طور پر مچلتے جذبات کی ترجمانی اس طرح کی ہے۔

پہاڑوں میں جہاں جھرنے سریلے گیت گاتے ہیں
اسی کشمیر کو جہلم نے کچھ مشکل میں پایا ہے
وہیں جہلم کے پانی نے یہ نغمہ آج چھیڑا ہے
تبھی جہلم کا پانی کہہ رہا ہے غم زدہ ہوکر
میرے کشمیر ہی کو حُسن یہ قدرت نے بخشا ہے
شفق کو دیکھ کر مایوس ہوجاتا ہوں میں اکثر
کہیں ہے شور ندیوں کا کہیں جھیلوں کی خاموشی
مجھے لگتا ہے ہر شے خون میں جیسے نہائی ہے
کہیں حدِ نظر تک مخملی میدان ہیں پھیلے
کہاں سے دفعتاً بارود کی بو آسمائی ہے

چلئے! اب اپنے اصلی موضوع کی طرف دوبارہ رُخ کرتا ہوں اور جنت نشان خطۂ ارض یعنی پہلگام کے بارے میں اپنے تاثرات تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ پہلگام پہنچتے ہی یہاں کا بازار شروع ہوجاتا ہے۔ مگر وبائی بیماری یعنی کووڈ ۱۹ کے ہوتے ہوئے سرکاری بندشوں سے یہاں یہ بازار بالکل بے رونق تھا۔ ساری کی ساری دکانیں بند پڑی تھیں۔ بازار میں کوئی چہل پہل نہیں تھی۔ دائیں اور بائیں اونچی اونچی اور خوش نما بلڈنگیں تھیں اور ان بلڈنگوں پر اکثر ہوٹلوں اور

ریستورانٹ کے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے۔ان عمارتوں کے اندر آنے والے سیاحوں نے ڈھیرہ ڈالا تھا اور وہ نہ معلوم کتنے دنوں کے لیے سیر و سیاحت کی غرض سے ان ہوٹلوں کے اندر مقیم تھے۔بازار کے دائیں بائیں سڑک پر کافی تعداد میں پرائیویٹ گاڑیاں، سکوٹر اور موٹر کاریں موجود تھیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آجکل کے گرمی کے موسم میں اس بازار میں کافی گہما گہمی رہتی تھی اور بازار کی ساری دکانیں کھلی رہتی تھیں۔مگر کورونا وائرس نے دنیا بھر کے کاروباری طبقے کو اپنی لپیٹ میں لے کر کافی حد تک روزی روٹی سے محروم کر دیا۔

خیر چلتے چلتے ہم نے بھی ایک موزون جگہ پر اپنی گاڑی کو کھڑا کیا اور اب پارک کے اندر جانے لگے۔مگر یہاں پہلگام کی سبھی پارکیں بند رکھی گئی تھیں مگر ایک بڑی پارک یعنی Levender Park کو عام لوگوں کی آمد و رفت کے لیے کھلا رکھا گیا تھا۔ہم بے چارے بھی اسی پارک میں داخل ہو گئے اور سایہ دار چیڑھ کے درخت کے چھاؤں میں اپنا ڈھیرہ ڈال دیا اور کچھ ستانے لگے بہت سارے لوگ اسی پارک میں کہیں درختوں کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے اور بہت لوگ کھلی دھوپ میں بیٹھ کر محو نظارہ تھے۔ یہ پارک بھی ایک وسیع وعریض رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔کیا لکھوں اور کیسے لکھوں کہ کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوائیں چل رہی تھیں اور ہم لوگ ہواؤں کی ٹھنڈک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔دھوپ میں بیٹھے ہوئے حضرات بھی دھوپ کی تمازت زیادہ محسوس نہیں کر رہے تھے۔

اس خوش نما اور خوب صورت باغ کے بیچوں بیچ کہیں کہیں خودرو زرد رنگ کے پھولوں کی قطاریں اُگی ہوئی تھیں جو کہ دور دور تک پھیلی تھیں اور اس کے نظارہ سے بھی دل بہل جاتا تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ بچھائے ہوئے کپڑے کے شیٹ پر بھی میں لیٹے ہوئے یہاں سبزے کی ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا اور سرینگر کی جھلسا دینے والی گرمی سے راحت محسوس کر رہا تھا۔ باغ کی دوسری جانب دریا زور و شور سے بہہ رہا تھا اور نیلے اور رصاف پانی کے نظارہ سے آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی تھی۔دریا کے کنارے کم رفتار پانی میں بچے نہا بھی رہے تھے اور اپنی اپنی تصویریں بھی اتروا رہے تھے۔میری عمر رسیدہ زندگی میں بھی جوانی کا جوش اُبلنے لگا اور میں نے بھی اپنی پوتیوں کے ساتھ دریا میں اتر کر ایک تصویر اُتروائی

کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے مسافر کو

خورد و نوش کا بھی ہم نے انتظام کر رکھا تھا۔اسی جاذب نظر اور خوب صورت پارک میں بیٹھ کر ہم نے دسترخوان بچھا کر پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ ہماری نگاہیں چار سو محوِ نظارہ تھیں۔ جہاں بھی دیکھو اونچے اونچے پہاڑ دکھ رہے تھے۔پہاڑوں پر خودرو جنگلی درخت اور دیگر قسم کے درختوں کے علاوہ چیڑھ کے بلند قامت درخت نظروں میں سما رہے تھے۔ ہرے بھرے اور گھنے جنگلات پہاڑوں کی چوٹیوں تک پھیلے ہوئے تھے۔اونچی اونچی چوٹیوں کے درمیان جمی ہوئی سفید برف بھی اپنا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ اگرچہ پہلگام کی دیگر پارکیں اور باغیچے بند رکھے گئے تھے۔ مگر یہ سبھی بزبان خاموش سیاحوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے۔لہلہاتے سرسبز و شاداب درخت، پھولوں کی کیاریاں، بہتی ہوئی اور گنگناتی ندیاں قدرت خداوندی کی آپ اپنی دلیل پیش کر رہی تھیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قدرتی نظاروں کو محفوظ رکھنے، ان کو مزید خوبصورت بنانے اور ان کی دیکھ ریکھ کرنے کی غرض سے Pahalgam Development Authority نے اپنا رول نبھایا ہے۔ مختلف پارکوں میں رات بھر ٹھہرنے کے لیے لکڑی کی Huts بنائی گئی ہیں جہاں کرایہ ادا کر کے سیر سپاٹے پر

آئے لوگ رات کو قیام کر سکتے ہیں۔ چلنے پھرنے کے لیے پگڈنڈیاں بنائی گئی ہیں۔ بچوں کے لیے جھولے بھی لگوائے گئے ہیں اور دیگر سہولیات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ قدرت نے اپنے ہاتھوں سے پہلگام کے گرد و نواح کو سنوارا اور سجایا ہے اور شاعر نے ان دیدہ زیب نظاروں کو یوں زبان دے دی ہے ۔

وادی میں نیلی جھیل کہیں لالہ گوں چنار
ہر سطحِ مرتفع پہ مہکتے سے مرغزار
ڈھلتی پہاڑیوں پر کھڑے چیڑھ دیودار
اونچائیوں پہ صدیوں کے خاموش برف زار
ہیں اک نظر میں سارے نشیب و فراز حسن
وا ہے نگاہِ عشق پہ سب سوز و سازِ حُسن

اس لالہ زار اور خوش رنگ جنت ارض پر چند گھنٹے گذار کر گھوڑ سواری کا شوق بھی اندر اندر سے گدگدانے لگا۔ یہ موسم اور گھوڑ سواری کا پیشہ یہاں کے مفلوک الحال گھوڑے بانوں کے لیے آذوقہ کمانے کا ذریعہ ہے۔ دفعہ ۳۷۰ کی منسوخی اور پھر کورونا وائرس کی مارا ماری سے یہ طبقہ بھی نامساعد حالات کا شکار ہو کر اقتصادی بدحالی کا شکار ہو کر رہ گیا اور ایک سال سے ان کی معیشت بھی تباہ ہو گئی۔ دل میں کچھ سواری کا شوق لے کر اور کچھ ان کے ساتھ ہمدردی کے جذبے سے چار گھوڑے کرائے پر لیے اور افراد خانہ و بچوں کے سمیت چار گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور قدرے کچھ مسافت پر چلے گئے اور واپسی پر کرایہ ادا کر کے بادلِ نخواستہ ہم پہلگام سے رخصت ہو گئے۔

بیتاب ویلی کی جانب:

پہلگام کے دلفریب نظاروں سے محظوظ ہو کر یہی مشورہ ہوا کہ اب اس مقام سے لگ بھگ ۱۰ کلومیٹر سے کم یا زیادہ اور ایک روح پرور مقام بیتاب ویلی کی طرف چلیں۔ میں نے زندگی بھر یہاں کا نام تک بھی نہیں سنا تھا حالانکہ غیر مقامی باشندوں نے یہاں آ کر مناظر قدرت کا لطف اٹھایا ہے۔ خیر کوئی آدھ گھنٹہ کے اندر اندر ہماری گاڑی یہاں پہنچ گئی۔ بہت سارے سیاحت کے دلدادگاں نے سڑک کے دونوں کناروں پر اپنی گاڑیاں کھڑی کی تھیں اور ہم کو بھی کسی ایک جگہ پر اپنی گاڑی کو کھڑا کرنا پڑا۔ اپنے گھٹنوں کی تھکاوٹ اور کمزوری کی وجہ سے میں دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ یہاں تک کہ ہم بیتاب وادی میں وارد ہو گئے۔ تا حد نظر ایک لمبا اور وسیع و عریض باغ بہت ہی خوب صورت زمین کی سطح سبزے سے فرش مخملین لگ رہی تھی۔ بیدوں کے درخت کافی تعداد میں سایہ دار ٹہنیاں پھیلائے ہوئے دعوت نظارہ دے رہے تھے۔ چندن واڑی اور شیش ناگ سے بہنے والا پانی ایک دریا کی صورت میں بڑے بڑے پتھروں سے ٹکرا کر دیدہ زیب منظر پیش کر رہا تھا۔ جوان سال لڑکے اس پانی میں نہا کر بھرپور لطف لے رہے تھے۔ ہر طرف اونچے اونچے پہاڑ نظروں کو مسرور کر رہے تھے۔ پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیوں پر دیکھنے والوں کی نظریں جا کر ٹھہرتی تھیں۔ دیودار اور چیڑھ کے درخت ان پہاڑوں پر جنگلاتی نظارہ پیش کر رہے تھے ۔ موسم کی گرمی کے باوجود یہاں خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ہمراہ آنے والے افراد خانہ اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگے اور میں بے چارہ کپڑے کا شیٹ ڈال کر ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر ٹھنڈی ہواؤں سے روحانی سکون محسوس کر رہا تھا۔ شاعر نے اپنے محسوسات سے اس کی تصویر کشی یوں کی ہے ۔

یہ بے کراں سکوت لیے کوہ کا فراز
چھیڑا ہے خامشی نے جہاں آگہی کا ساز
ہر چند یہ کہ سلسلۂ عشق ہے دراز
شاید قریب تر ہو یہاں سے وہ بزمِ ناز
بام عروج جس کا امرناتھ نام ہے
خلوت سرائے ذات ہے مُکتی کا دھام ہے

باقی ص 194 پر

بشیر شاکرؔ کے متعلق پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب کے مختلف مواقع پر تحریر کردہ مختلف تاثرات

(1) **سائوتھ** کیمپس کشمیر یونیورسٹی اننت ناگ (اسلام آباد) کے اہتمام سے کتابوں کے عالمی دن کی تقریب میں ڈاکٹر ایم اے بابا، چیف لائبریرین (علامہ اقبال لائبریری) نے اپنے مقالے میں کتابوں کی اہمیت، ضرورت اور افادیت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ چنانچہ اپنے مقالے کو مرزا بشیر احمد شاکر کی نظم 'کتابیں ہم نشیں میری' کے چند اشعار سے اختتام پذیر کیا اور پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ادھر میرے ذہن میں شاکر صاحب کی علم دوستی، شوق کتب بینی اور اصحاب علم ودانش سے ان کے قلبی تعلق کی یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔ آج کل کے صنعتی، تکنیکی اور مادی قدروں کی چکا چوند میں شاکر صاحب جیسے لوگ غنیمت ہیں، جنہیں کتابوں سے زبردست شفقت اور صاحبانِ تصنیف و تالیف سے بے پناہ عقیدت ہے۔ راقم السطور نے گزشتہ بیس برسوں کی شناسائی کے دوران شاکر صاحب کو کتابوں کا شیدائی، مخطوطات کا گرویدہ اور علامہ اقبال کے فکر ونظر کا مداح پایا۔ چنانچہ ڈاک خانے کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کا ذوق کتب بینی دو چند ہوتا رہا اور علمی وادبی مجالس میں نہایت انہماک اور ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں درازی عمر عطا کرے تاکہ علم و ادب کی خدمت واشاعت میں اپنا بے ریا حصہ ادا کرتے رہیں۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین آباد

(2) **دنیا** کی مختلف زبانوں اور بولیوں میں گزشتہ چودہ سو برسوں سے سرورِ کائنات جناب محمد عربیؐ کی خدمت اقدس میں نعت وسلام کا سلسلہ بڑے تزک واحتشام سے جاری وساری ہے۔ نعت نویسوں نے بارگاہِ رسالت میں انداز بدل بدل کر گل ہائے عقیدت نچھاور کئے ہیں۔ چنانچہ جامیؔ نے آپ کو کونین کی کتاب کا سرنامہ قرار دیا ہے۔

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

کشمیری زبان میں بھی متعدد شاعروں اور نعت نگاروں نے محسن آدمیتؐ سے انتہائی عقیدت واحترام کا اپنی نعوت میں اظہار کیا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے معروف علم دوست اور عاشق رسول محترمؒ بشیر احمد شاکرؔ نے کشمیری زبان میں نعتوں کا ایک بیش بہا مجموعہ ترتیب دے کر رسول رحمتؐ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ اپنی عقیدت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ شاکرؔ صاحب نے حضور نبی کریمؐ کے شکل وشمائل، ظاہری وباطنی محاسن کے ساتھ ساتھ عالم انسانیت پر آپ کے احسانات کا منظوم پیرائیہ بیان پر نہایت حسن وخوبی کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ امید ہے کہ بارگاہِ رسالتؐ میں شاکرؔ صاحب کا یہ ارمغان نعت قبولیت حاصل کرے گا۔

(3) **مرزا** بشیر احمد شاکرؔ جیسے لوگ آج کل کے صنعتی، تکنیکی اور مادی قدروں کی چکا چوند میں بہت غنیمت ہیں، جنہیں کتابوں سے زبردست محبت اور صاحبانِ تصنیف وتالیف سے بے پناہ عقیدت ہے۔ راقم السطور نے گزشتہ بیس برسوں کی شناسائی کے دوران شاکر صاحب کو کتابوں کا شیدائی، مخطوطات کا گرویدہ اور علامہ اقبال کے فکر ونظر کا مداح پایا۔

چنانچہ ڈاک خانے کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کا ذوق کتب بینی دو چند ہوتا رہا اور علمی وادبی مجالس میں نہایت انہماک اور ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں درازی عمر عطا کرے تاکہ علم وادب کی خدمت و اشاعت میں اپنا بے ریا حصہ ادا کرتے رہیں۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین آباد

مرزا بشیر احمد شاکرؔ اپنے منظوم کلام کے تناظر میں

نذرِ اقبالؒ

زہے قسمت! کہ میں اقبالؔ کا اک والہ و شیدا
اُسی مردِ قلندر کا میں ادب سے ذکر کرتا ہوں

عجب اک کیفیت ہوتی ہے طاری فکر پہ میری
کلام حضرتِ اقبال جب بھی گنگناتا ہوں

بدن میں میرے تازہ روح اس دم ہونے لگتی ہے
یہ بال جبرئیل بانگ درا جس دم میں پڑھتا ہوں

دیا ہے درس اُس نے اس خودی کا خودشناسی کا
لئے ہے دل میں وہ محشر یہی محسوس کرتا ہوں

دیا پیغام اس کی شاعری نے زندہ رہنے کا......
دلوں میں اس نے پیدا کی حرارت دیکھ لیتا ہوں

غبار راہ کو اُس نے بتایا راز الوندی
نیا اک حوصلہ اس نے دیا پہچان لیتا ہوں

کہوں کیا حالِ دل اپنا وہ میری فکر پہ ہے چھایا
میں اس کی رفعتوں کا، عظمتوں کا گیت گاتا ہوں

عقیدت مند جو ہیں اقبال کے ان کو مبارک ہو
مکرم ہیں میری نظروں میں دل سے ان کو چاہتا ہوں

خودی کا وہ پیمبر کیا وہاں آرام فرما ہے؟
زیارت گاہ لحد ہے جس کی اس کو یاد کرتا ہوں

تمنا تھی میرے دل میں کہ ان کی قبر کو دیکھوں
دلِ بے تاب سے لاہور کی راہوں کو تکتا ہوں

ہے میری نظر میں یہ کیمیا جو یہ خاک یہاں کی ہے
اُٹھا کر مقبرے سے اس کی مٹی ساتھ لاتا ہوں

چمکتی ذات ہے اس کی دُرِ یکتا زمانے میں
میں روشن اس کو پاتا ہوں نظر جب بھی اٹھاتا ہوں

دل نازک کو چھوتے ہیں ان کے دل نشین اشعار
عجب تاثیر ان کی اپنے لوح دل پہ پاتا ہوں

یہ نالے نیم شب کے ہیں یہ ہیں آہ سحر گاہی
قدر ان کی میں اپنے جان و دل سے زیادہ رکھتا ہوں

یہ دُرِ بے بہا ہیں لعل و گوہر سے یہ بڑھ کر ہیں
علامہ کے دل صد پارہ کے ابیات پڑھتا ہوں

ثنا خواں ہوں ثنائیؔ اور جامیؔ کے مدح خواں کا
میں رومیؔ کے مرید باصفا کا نغمہ گاتا ہوں

ہوا تھا ہند میں پیدا یہ محسن قوم و ملت کا
نواؤں کا میں جس کی چار سو چرچا یہ سنتا ہوں

کبھی پرواز اس کے فکر کی تھی آسمانوں میں
تخیل کس قدر اُونچا کہاں میں سوچ سکتا ہوں

وہی اقبالؔ اپنی جستجو جو کرتا رہا برسوں
اُسی شیریں نوا، شیریں سخن کی بات کہتا ہوں

کہوں میں یہ تفکر کا یہ بے پایاں سمندر ہے
سمندر کی ان لہروں کا بہت ہی شور سنتا ہوں

وہ ہے اک عندلیب خوش بیاں باغِ رسالت کا
یہ دَرد و سوز میں ڈوبے ہیں نغموں کو میں سنتا ہوں

تلاوت کرنے والا وہ نبیؐ کے نام کا عاشق
اشکبار اس کی اُن آنکھوں کو اکثر یاد کرتا ہوں

ہے یہ اقبال کا گلشن رنگارنگ پھول ہیں اس میں
میں بلبل کی طرح اس کے چمن میں چہچہاتا ہوں

کبھی صدیوں میں ایسا دیدہ ور ہوتا نہیں پیدا
وہ اک خورشید تاباں کی طرح نکلا یہ کہتا ہوں

میری آنکھیں ترستی ہیں وہی جیسا فقیر آئے
ٹٹولے نبض کو وہ وقت کی خواہش یہ رکھتا ہوں

سخت سردی میں بھی جس کو سحر خیزی کی عادت تھی
دل بیدار اور روشن ضمیر کی بات لکھتا ہوں

زمانے کی نگاہیں پھر اس کو ڈھونڈ لیتی ہیں
دیا سوزِ جگر اپنا میں اس کی راہ تکتا ہوں

دِگر دانائے راز آید کہ نآید کہہ کے جو نکلا
محبت کا یہ نذرانہ اُسی کو پیش کرتا ہوں

خدا کی زحمتیں اُس شاعرِ مشرق پہ ہوں **شاکرؔ**
مسلمان کے لئے اس کا تڑپنا یاد کرتا ہوں

علم کی شمع فروزاں تھا تو اکبر حیدری

گلشنِ ادب کے باغباں اے باغباں
ڈھونڈتی پھرتی ہے تجھ کو جابجا اردو زباں

محفلیں افسردہ لگتی ہیں یہاں تیرے بغیر
بلبلیں ہیں غمزدہ ماتم کناں تیرے بغیر

علم کی اس جستجو میں آبلہ پائی تیری
رات کی تاریکیاں اور تنہائی تیری

کیسے گلدستے سجائے پھول کیسے چُن لئے
پُر خار راہوں سے گذر کر گلشنِ اقبالؔ سے

تھی تیری یہ زندگانی خوب تر محبوب تر
مشغلہ علم و ادب کا زیست میں تھا ہم سفر

چند روزہ زندگی میں کارہا تو کر گیا
تحقیق اور تنقید کی اس جستجو میں کھو گیا

چلتے چلتے، راستوں میں ہاتھ تیرے لگ گئے
بے بہا علم کے دُر جھولی میں تیرے گر گئے

اے فدائے نام اقبالؔ وے نثارِ کار او
من بخشم دل ترا ویدم سراپا جستجو

شاد ماں ہونگی وہاں روحِ انیسؔ روحِ دبیرؔ
چومنے ماتھے کو تیری آئی ہوگی روحِ میرؔ

ان سبھوں کے کام کو تو نے نکھارا مرحبا
چار چاند اسمیں لگائے آفرین صد مرحبا

ناز تیری ذات پہ کرتی ہے یہ دانشوری
علم کی شمع فروزاں تھا تو اکبر حیدری

عہدِ پیری تک مسلسل تیرا قلم چلتا رہا
اردو زباں کے محسنوں کی داستاں لکھتا رہا

وہ تیری مشغولیت، ہمت تیری صبحِ مسا
یہ تیرے تحقیق کی گہرائیاں، فکرِ رسا

کتابیں ہم نشیں میری

کتابوں کی یہ دنیا بھی دیکھو کیا نرالی ہے
عجائب اور غرائب کی یہ دنیا لا مثالی ہے
نبیؐ رحمت کو پہلی وحی میں ہی مِل گئی شاہراہ
کرو آغاز پڑھنے کا بنام حضرتِ اللہ
شکر پیارے نبیؐ کے فیض سے ہوں میں نہ بیگانہ
شکر شمع علم کا میں ہوں اِک ادنیٰ سا پروانہ
کتابیں میری دولت ہیں یہی میرا ہے سرمایہ
کتابوں کا ہی میرے ذہن ودِل پر ہے گھنا سایہ
کتابوں سے مجھے اپنی کہوں کیا؟ کیسی اُلفت ہے
یہ میرا وہ اثاثہ ہے جو سچ مچ بیش قیمت ہے
علم دولت ہے جو آ کے کبھی واپس نہیں جاتی
بڑھاوا اِس کی فطرت ہے کمی اس میں نہیں آتی
کتابیں رہنما ہوتی ہیں جو راستہ دِکھاتی ہیں
کہاں جانا ہے کیا کرنا ہے یہ ہم کو سکھاتی ہیں
کتابوں سے محبت ہونے کے ناطے میں شاداں ہوں
مجھے ہے دوستی ان سے بہت اس پر میں نازاں ہوں
کتابوں کے مطالعہ سے میرا دِل شاد رہتا ہے
اور اِک گونہ طراوت اور فرحت یہ بخشتا ہے
شگوفے دِل کے کھلتے ہیں مطالعہ جب بھی کرتا ہوں
بیاضِ دِل میں اپنے خاص باتیں لِکھ کے رکھتا ہوں
کہانی یہ سُناتی ہیں ہمارے اپنے آباء کی
کہانی کُچھ تو گزرے اور آئندہ زمانے کی
کتابوں پر یہ دِل میرا ہوا ہے والہ و شیدا
خدا کا شکر ہے میرے لئے یہ نعمتِ عظمیٰ

میں اِک بھنور کی مانند پھول کا رس چوس لیتا ہوں
کتابوں کے چمن میں شوق سے میں گھوم پھرتا ہوں
عنایاتِ الٰہی سے یہ ذوق و شوق میرا ہے
اُجالا ہی اُجالا ہر طرف روشن نظارا ہے
کتابیں ہم نشیں میری وجو میرے ساتھ رہتی ہیں
یہ علم و حکمت و عقل و خرد کی بات کہتی ہیں
کتابیں اپنے اندر اِک نرالی شان رکھتی ہیں
حقیقی علم ہو اِن میں تو دِل کو یہ بدلتی ہیں
کتابیں مونس ہوتی ہیں یہ ساتھی ساتھ نبھاتی ہیں
دِکھا کر کرشمہ اپنا بات اگر بگڑی تو بناتی ہیں
کبھی مجھ کو ہنساتی ہیں کبھی مجھ کو رُلاتی ہیں
کبھی بیدار رکھ کر نیند میری ہی اُڑاتی ہیں
کتابوں کی الماری میرے کمرے کی زینت ہے
نظر رہتی ہے اس پر اور اس میں جو بصیرت ہے
کتابوں کا یہ کمرہ اِک مہکتا میرا گلشن ہے
خوشی سے چہچہاتا ہوں میں بُلبل یہ میرا گلبن ہے
رسالوں کے شمارے یہ مجلّے یادگاری ہیں
یہ گُل دستے ہیں اور اِن کی ادائیں مجھ کو پیاری ہیں

تفاسیر کا بیان

کتابیں اُتری ہیں پیغمبروں پر آسمانوں سے
درج قرآن میں ہے یہ یقین کے واسطے پڑھ لے
بہت اعلیٰ بہت افضل کتابوں میں صحیفوں میں
فقط قرآن اپنا ہے زمینوں آسمانوں میں
یہ تفسیریں قرآن کی عظمتوں کا ہے بیان اِن میں
مُفسر اِن کی قبروں میں شامل رحمتیں جن میں
یہ تفسیر حضرتِ ابنِ کثیر کی دِل نشین تفسیر
فصاحت اور بلاغت کی یہ ہے اِک مستند تفسیر
کتابوں کے خزینوں میں میری، تفسیر رازیؔ ہے
عظیم المرتبت عالم کی یہ خارہ شگافی ہے
لگی میری کتابوں میں ہے یہ تفسیر عثمانیؔ
جو کرتی ہے میرے دین اور ایمان کی نگہبانی
لکھی تفسیر قرآن کاندھلہ کے اِس مفسر نے
علامہ شیخ التفسیر حضرتِ ادریسؔ صاحب نے
ہے مدفن جن کا لاہور شہر پاکستان میں دیکھو
یہ عالیشان کتاب حضرتؒ کی سیرت پر ذرا دیکھو
پڑھو یہ معارف القرآن یہ بھی کارنامہ ہے
یہ اُس مفتی شفیع صاحب کا تفسیری خزانہ ہے
یہ تفہیم القرآن بھی بار بار پڑھنے کے لائق ہے
یہ تفسیر بالیقین شاہکار ہے اور کیا ہی فائق ہے
یہ تفسیر حضرت ماجدؔ کی پڑھ کر دل بہلتا ہے
جنونِ عشق میرا ہے اُچھلتا ہے مچلتا ہے
میں ہند کے بو الکلام آزاد کو جب یاد کرتا ہوں
قلم کے جس سے نکلا الہلال وہ یاد کرتا ہوں
فصاحت اور بلاغت کا مرقع ترجمہ اُسکا
کلام اللہ کی یہ دلنشین تفسیر، بیان اُسکا
کیا ہے ترجمۂ قرآن مہاجر میر واعظ نے
وطن سے دور رہ کر عالمِ ذیشان مفسر نے

احادیث کا بیان

احادیثِ مبارک ہیں جو فرموداتِ پیغمبرؐ
بخاری، ترمزی، مسلم یہ موطأ سب ہیں روح پرور
ابوداؤد، مشکوٰۃ، ابنِ ماجہ ہے بہت افضل
جو پڑھتا ہوں تو ہوتی ہے دِل زنگ خُوردہ کو صقیل
بزرگوں نے کہا ہے گفتۂ اُو گفتۂ اللہ
نہیں ہے ریب اس میں کچھ ہے از حلقوم عبداللہ

حدیثوں کے معارف لکھ گئے منظور نعمانی
وہ راسخ فی العلم تھے اور عالم تھے وہ ربانی

سیرت مبارکہ

ہے سیرت سرور عالم کی نور ہر اک اندھیرے میں
یہ خوشبو علم وعرفان کی ہے اس سے میرے کمرے میں
پڑھو طبقات ابنِ سعد کی یہ مستند سیرت
یہ ہے صدیوں سے جس میں ہے مکمل ذکرِ آنحضرتؐ
کتابیں ہیں بہت اپنے نبیؐ کی پاک سیرت پر
ہیں گلہائے عقیدت اُن کی عظمت پر نبوت پر
وہ اِک عالی مقام سیرت نگار قاضی سلیمان بھی
وہی یہ "رحمۃ للعالمین" تحریر جس نے کی
نبیؐ کا تذکرہ ہے رحمۃ للعالمین اُن کی
کرے حق مغفرت سیرت نگار منصور پوری کی
قصیدہ بُردہ ہے اِک معجزہ حضرت محمدؐ کا
ہوئے تھے جلوہ گر بوصیری کو اور اپنا ردا بخشا
زبانِ کاشمیری میں ہوا ہے ترجمہ اس کا
رشید نازکی ہے نام بلند پایہ مترجم کا
کتابیں اپنے محسن بوالحسن ندوی کی پڑھتا ہوں
دماغ و دِل کی بے چینی سکون سے میں بدلتا ہوں
ہے یہ المرتضیٰ حضرت علی کی پاک سیرت پر
ہیں اس تصنیف میں علمی دلائل اُن کی عظمت پر
عظیم المرتبت عالم، مفکر، بوالحسن ندوی
وہ لکھنو میں جو ہوتے تھے قلم سے اپنے یہ لکھی
کتابوں میں بہت عُمدہ ہے الفاروق شبلیؔ کی
یہ ہے سیرت جناب حضرت فاروق اعظم کی

نعوت ومنقبت

نعوت و منقبت کی یہ کتابیں کیا ہیں لاثانی
پڑھیں جو شوق سے ان کو تو دل ہوتا ہے نورانی
ہے یہ سرمایہ میرا اور زادِ سفر میرا
نبیؐ کی شان میں جامیؔ کے یہ نعتوں کا مجموعہ
یہی پڑھ پڑھ کے میری مشکلیں آسان ہوتی ہیں
نبیؐ کا نام لے لے کر دُبالا شان ہوتی ہیں
نرالا رنگ ہے ڈھنگ ہے عجب جامیؔ کے نعتوں کا
مبارک ساعتوں کا ذکر دنوں کا اور راتوں کا
مجھے یاد آرہے ہیں اہلِ دل اہلِ قلم واللہ
کتابیں اُن کی شاہد ہیں ہوئے تھے علم پر شیدا
معارف مثنوی کے جب میں وقتِ شام پڑھتا ہوں
میں اپنی روحِ ایمان کو اُسی دم تازہ کرتا ہوں
وہ داتا گنج بخش لاہور والے کی طرف دیکھو
تصوف پر کتاب ان کی بہت مشہور ہے دیکھو
ہے اس کا نام دِل کو چھونے والا کشف المحجوب
مصنف اس کے عاشق محبوبوں میں کیا محبوب
امام سرہندی کے جب بھی مکتوبات پڑھتا ہوں
عجب اک لذّت روحانیت محسوس کرتا ہوں
غزالی کی یہ احیاء العلوم اک کارنامہ ہے
اسی سے عالمِ اسلام اکثر فیض پاتا ہے
گلستان ، بوستان ہیں دو کتابیں شیخ سعدیؔ کی
اور یہ دیوانِ حافظؔ گویا صہبا عشق ومستی کی
رباعیاتِ عمر خیامؔ بے خود و مست کرتی ہیں
اثر پُر کیف ہے ان کا یہ مستی میں ڈبوتی ہیں
ہوا مشہورِ فردوسیؔ بھی اپنے کارنامے سے
زبانِ فارسی میں شاہنامہ کے وہ لکھنے سے
لکھی ہے نخشبی نے داستانِ عشق اثر انگیز
کیا مقبول شاہ نے ترجمہ اسکا جو ہے گُریز

پڑھی جاتی تھی یاں راتوں کو یہ پرانے زمانے میں
کہاں وہ لوگ ہیں مٹی میں ماضی کے فسانے میں
نہیں دِل چاہتا تھا یہ لمبی رات ڈھل جائے
یہ قصہ گو ہمارا خوش گلو ہم سے نہ ٹل جائے
سنائی جاتی تھی وہ گُل بکاول ، گُل صنوبر بھی
وہ رستم، سام نامہ قصہ یوسف زلیخا بھی
دیہاتوں میں وہ رہنے والے جب بھی یاد آتے ہیں
جو یہ قصے سناتے تھے مجھے اکثر رلاتے ہیں
دیا اوراد کا نُسخہ ہمیں اُس شاہِ ہمدان نے
بشارت جس کی پائی روضہ اطہر سے سید نے
کتابیں تھانوی اشرف علی حضرت کی پڑھتا ہوں
ان ہی کو نظر میں رکھ کر میں باطل سے نہ ڈرتا ہوں
علامہ سید انور شاہ لولابی وہ کشمیری
ہیں موتی اُن کے ملفوظات لسانی ہوں کہ تحریری
کتابوں کے یہ دفتر اُس نے اپنے دل میں رکھے تھے
علم کی بات جب کرتے دُرِ عدن وہ جھڑتے تھے
یہ دیوانِ غنیؔ شیریں سخن وہ کشمیری
پڑھو یہ فارسی میں اور دیکھو اس کی شیرینی
ہیں اپنے شیخ العالم نند ریشی کی یہ تحریریں
کتاب اللہ کی لگتی ہیں دل آویز تفسیریں
ہماری لل دید کشمیر کی وہ عارفہ کامل
ہیں اس کے واکھ گویا دُر اور تھی اور بحق واصل
یہ تاج العارفین کیا ہے قاسم شاہ بخاری کا
ہے یہ منظوم عربی ترجمہ ورد المریدین کا

ادبیات

ادیبوں ، محققوں نے ہیں سجائے علم کے گلشن
نکھارا شاعروں نے اپنی محنت سے یہ اپنا فن

سخن ور مرزا غالبؔ کا یہ دیوان جب بھی پڑھتا ہوں
خدا سے مغفرت اُن کے لئے میں طلب کرتا ہوں
ہیں وہ آسودہ دلی میں خدا کی رحمت ہو اُن پر
یہ اُردو ناز کرتی ہے اُس شاعر سخن ور پر
یہ حالیؔ کی مسدس دیکھ کر خوش ہوں میں حالیؔ پر
خدا کی رحمت اُسکی قبر پر اور روحِ حالیؔ پر
دیا پیغام اس میں زندہ رہنے اور جینے کا
کیا سامان روحِ سرسید کو شاد رکھنے کا
کیا ہے ترجمہ اسکا شہیدیؔ کاشمیری نے
عرق ریزی سے کشمیری میں اس ماہر سخن ور نے
کلام حضرتِ اقبالؔ روح پور کلام اُن کا
کتابوں کی بدولت عالم ہوتا ہے پیام اُن کا
کتابیں اس کو یورپ میں جو آباء کی نظر آئیں
دِل اقبال کو سیپارہ کر کے فکر پر چھائیں
یہ بالِ جبرئیل، بانگ درا، ضربِ کلیم اُن کی
جگا دیتی ہیں غفلت سے سدا ہے یہ صدا اُن کی
پڑھو جاوید نامہ اور اُڑو افلاک میں دیکھو
زیارت کر لو واں رومیؔ کی اور روحِ غنیؔ دیکھو
تخیل میں وہاں تم دیکھ لو گے شاہِ ہمدان کو
انہی کا فیض بے پایاں یہاں کشمیر میں دیکھو
یہ اسرارِ خودی کا ترجمہ اور اُس نازؔ کا انداز
کیا یہ کام کشمیری میں ، تھا کولگام کا وہ نازؔ
وطن کو چھوڑ کر نکلا چلا تھا سوئے پاکستاں
وہاں کی خاک میں یہ بے بہادُر ہوگیا پنہاں
حفیظؔ جالندھری نے بھی لکھا شاہ نامہ اسلام
بہت ہی لائقِ تحسین ہے مرحوم کا یہ کام
ندا ہاتفؔ نے دی تھی ان کو ایسا کام کرنے کی

اشارہ مل گیا تھا خدمتِ اسلام کرنے کی
کشمیر اک ولولہ انگیز کتاب تاریخ کشمیر پر
لکھی صوفی محی الدین نے ہیں اس میں علم کے دفتر
یہ تاریخ حسن بھی پڑھ ذرا بنڈ پور والے کی
یہاں کیا کیا تھا کیا گزرا ہے یہ بھی تو بتائے گی
یہ تاریخی کتابیں نیلمت پُراں ، راج ترنگنی بھی
ہیں زندہ لکھنے والے ان کتابوں کے بدولت ہی
وہ آزادؔ اِک سخن ور کاشمر کا ایک دانشور
نظم اُس کی ہے دریا شاعری میں انقلاب پرور
ہے یہ کلیاتِ مہجورؔ شاعرِ کشمیر بھی اعلیٰ
رسیلی اس کی غزلیں ہیں اور نظمیں دل پسند واہ واہ
یہ اخبارات کے اوراق ہیں پرانے زمانے کے
ہیں دستاویز یہ تاریخ کے اپنے زمانے کے
یہ شش رنگ، رنگ دوے جنابِ ٹینگ صاحب کی
یہاں کشمیر میں نکلی ہیں ادبی کیا ہی تحقیقی
قلم کار، معتبر محقق نثر کے خواجہ کہلائے
خدا خواجہ کو دے توفیق علم کو اور پھیلائے
وہ اکبر حیدری محقق جو تھے اپنے زمانے میں
کتابیں بے بہا ہیں انکی اُردو کے خزانے
عمر بھر اُس نے اس اُردو زبان کی آبیاری کی
کتابیں چھوڑ دیں اپنے پیچھے یہ خدمت گزاری کی
شبیبؔ رضوی بھی ایک کہنہ مشق اُردو کے متوالے
قلم سے اُس نے اپنی شاعری کے پھول برسائے
کتابیں اُس کی شاہد ہیں ہنرمندی یہ اُس کی ہے
تخیل اُسکا اُونچا ہے فکر کی یہ بلندی ہے
وہ دینا ناتھ نادمؔ شاعری کی آبرو وہ بھی
وہ کشمیری زبان کا اِک نظم گو اور غزل گو بھی

وہ اپنی شاعری کا اِک نیا انداز رکھتا تھا
زمانے کے تقاضوں سے بلند پرواز رکھتا تھا
محی الدین اخترؔ افسانہ نویسی میں جو یکتا تھا
ادب کے آسمان پر تارے کی مانند وہ چمکتا تھا
وہ موتی لال ساقیؔ آنجہانی ایک دانشور
قلم سے جس کی نکلی ہیں کتابیں عمدہ و بہتر
پتمبر ناتھ در فانیؔ جو کشمیری سخن ور ہے
وہ اُردو کا بھی محسن ایک کہنہ مشق شاعر ہے
یہاں گزرے ہیں عارفؔ، نازکیؔ اور حاجنیؔ مرحوم
ابھی ہیں آج راہیؔ وہ فراق مرغوبؔ ہے جنکی دھوم
جنابِ شیخ اقبالؔ برزلہ کے عالم و فاضل
تواریخ دان ، مصنف اور اسلامیات میں کامل
بہت ہیں اور یارانِ وطن احبابِ محفل میں
ہے انکی عزت وتکریم برابر میرے اس دل میں
زمانہ کتنا بدلا کیسے کیسے انقلاب آئے
یہ سب منظر کتابوں سے ہی بس ہم کو نظر آئے
میں کس کس اہلِ دل اہلِ قلم کا تذکرہ لکھوں
کہاں ممکن ہے یہ سلسلہ در سلسلہ لکھوں
ثنائے ربّ میں پڑھتا ہوں اسی پر بس میں کرتا ہوں
قلم کو روکتا ہوں اور تخیل چھوڑ دیتا ہوں
دُعا مانگوں کتابیں ہی قبر میں ہوں میرے ساتھ
وہاں فضلِ الٰہی سے رہے قرآن ہی میرے ہاتھ
خداوندا! وہاں بھی مجھ کا یہ ذوقِ مطالعہ دے
کتابیں دیکھنے کا ڈھونڈنے کو ولولہ دے دے
وہاں بھی ہوں کتابیں عالموں کی رہنما میری
کروں میں اکتسابِ فیض یہی ہے التجا میری
ڈبوئی خونِ دل میں انگلیاں بے چارہ **شاکر** نے
پھر اس نے داستان لکھ دی کتابوں کی تہہ دل سے

scholarly excellence. Known for its commitment to preserving and propagating the rich heritage of Indo-Pak luminaries, this esteemed research journal has continually contributed to the advancement of knowledge and appreciation of cultural and literary traditions. The forthcoming special edition dedicated to **Mirza Bashir Ahmad Shakir** as envisioned by the esteemed Editor **Dr Zafar Hyderi** Ph.D represents a significant milestone in this venerable tradition Mirza Bashir Ahmad Shakir, a luminous figure in the realm of Eastern literatur, has been celebrated for his profound insights and eloquent expression. His critical works and essays have not only illuminated the intricate facets of Eastern cultural values but have also bridged the gaps between tradition and modernity with an unparalleled finesse. His contributions are etched into the literary fabric of the sub-continent, and this special edition of Monthly Hakeem ul Ummat is a fitting homage to his enduring legacy.

Dr Zafar Hyderi's initiative to dedicate a special number to Shakir underscores the journal's commitment to honoring and preserving the intellectual heritage of the Indo-Pak region. This endeavor is more than a mere tribute- it is a scholarly undertaking that seeks to encapsulate and celebrate the profound impact of Shakir's work on literature, culture, and religion. By focusing on Shakir's contributions the publication aims to shed light on a figure whose writings have significantly enriched the understanding of Eastern literary traditions.

The special edition promises to be a comprehensive exploration of Shakir's oeuvr, offering readers an opportunity to delve into the depth and breadth of his intellectual pursuits. It will likely feature a collection of essays, critical analyses, and reflections on Shakir's work each crafted to highlight different aspects of his contributions. This multifaceted approach ensures that the publication will cater to both scholars and enthusiasts providing valuable insights into Shakir's literary and cultural impact.

Professor Akbar Hyderi Kashmiri: Mirza Bashir Ahmad Shakir's scholarly endeavors have played a pivotal role in expanding and interpreting the work of **Professor Akbar Hyderi** Kashmiri an eminent scholar of oriental sciences in India. Professor Hyderi's contributions to the field of oriental studies are widely recognized and respected for their depth and scholarly rigor. Shakir's work, which focuses extensively on Hyderi's research has furthered the understanding and appreciation of Professor Hyderi's scholarly legacy. Mirza Bashir Ahmad Shakir's Scholarly Engagement with Professor Hyderi's work is marked by his dedicated efforts to analyze, interpret, and disseminate Hyderi's research findings. Shakir's scholarly work serves as both a continuation and an expansion of Professor Hyderi's academic legacy. Shakir has imparted the principles and methodologies of Professor Hyderi's research to a new generation of scholars.

In conclusion the special edition of **Monthly Hakeem ul Ummat** dedicated to Mirza Bashir Ahmad Shakir is a laudable initiative that reflects the journal's unwavering commitment to preserving and celebrating the rich literary and cultural heritage of the Indo-Pak region Under the editorial guidance of **Dr Zafar Hyderi** this publication will not only pay homage to Shakir's remarkable contributions but also reaffirm the journal's role as a leading voice in the realm of scholarly research and cultural preservation.

Echoes of Elegance: The Literary and Cultural Contributions of Mirza Bashir Ahmad Shakir

Dr Syed Ali Abbas, Mandi Bahauddin, Pakistan

In the serene landscape of Kashmir, where the mountains stand as silent witnesses to centuries of cultural evolution, emerges the luminous figure of Mirza Bashir Ahmad Shakir. An eminent critic and columnist, Shakir has indelibly etched his mark upon the realm of Eastern literature and cultural discourse. His oeuvre, comprising a myriad of books which include "Allama Iqbal ke Daes Mein, Kitabain Hum Nasheen Meri, Makateeb o Safar Naame, Gulrang" etc. and dozens of essays, stands as a testament to his profound understanding and reverence for the rich tapestry of the sub-continent's literary heritage.

Shakir's literary endeavors are distinguished by their intellectual rigor and aesthetic grace. His writings, suffused with both erudition and empathy, traverse the intricate labyrinth of Eastern cultural values with a deftness that reflects his deep engagement with the subject matter. Each of his essays and books is a thoughtful exploration revealing the nuanced dimensions of literature and culture that might otherwise remain obscured.

What sets Shakir apart is not merely his vast knowledge but his capacity to communicate complex ideas with clarity and eloquence. His critical insights into literature are not confined to the mere analysis of texts but extend to a broader contemplation of their cultural and philosophical implications. In this manner, Shakir's work transcends the boundaries of conventional criticism, offering readers a window into the heart of Eastern literary traditions.

Furthermore, Shakir's interactions with intellectual dignitaries have enriched his perspectives infusing his writings with a cosmopolitan yet deeply rooted appreciation for the nuances of Eastern thought. His encounters with leading figures of the literary and cultural world have not only broadened his own intellectual horizon but have also contributed to a greater appreciation of the sub-continent's cultural legacy on the global stage.

The respect and admiration that Shakir commands in literary circles are a testament to his unwavering commitment to the preservation and promotion of Eastern cultural values. His work is not merely an academic pursuit but a passionate endeavor to illuminate the profound beauty and significance of the literary and cultural heritage of Kashmir and beyond.

In sum Mirza Bashir Ahmad Shakir's literary activities represent a confluence of intellectual depth cultural sensitivity and eloquent expression. His contributions to the field of Eastern literature are not only a reflection of his scholarly prowess but also a beacon for future generations, guiding them through the rich and varied landscape of their cultural heritage. In honoring his legacy, we celebrate a singular voice that has enriched the discourse of literature and culture with a rare and enduring grace.

A Tribute to Literary Brilliance: The Special Edition of Monthly Hakeem ul Ummat Dedicated to Mirza Bashir Ahmad Shakir.

In the vast and varied landscape of academic and literary publications, the Monthly **Hakeem ul Ummat Srinagar** has carved a distinguished niche as a beacon of intellectual rigor and

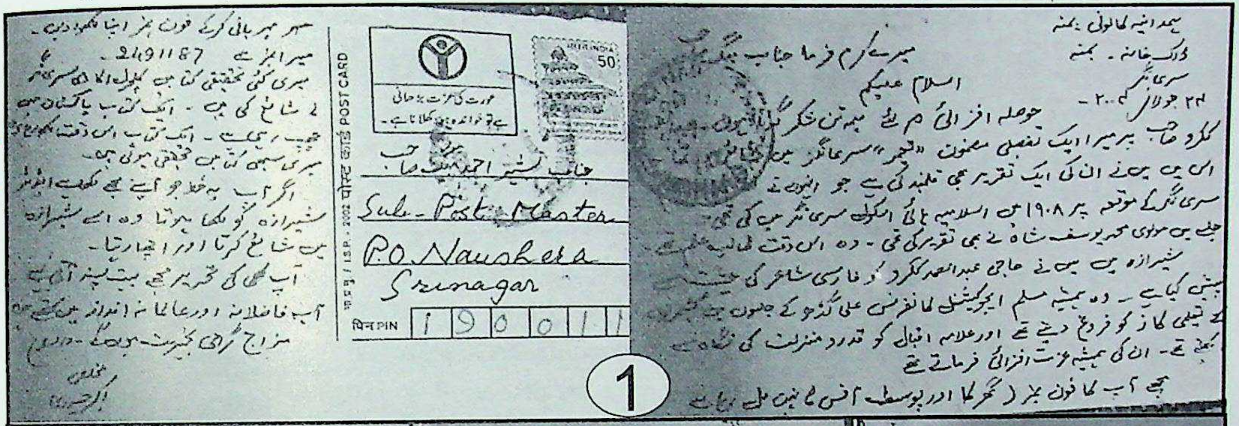

1

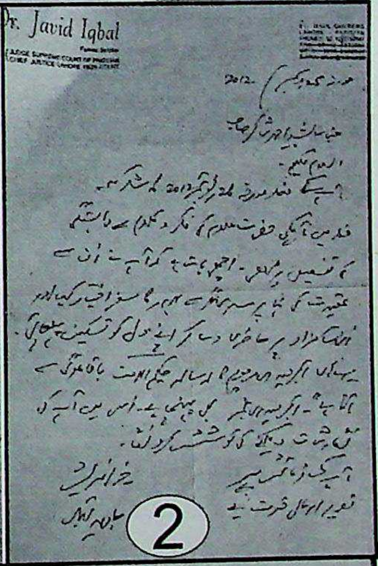

2

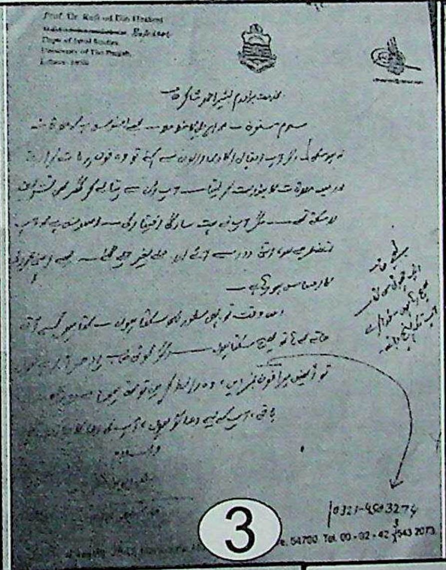

3

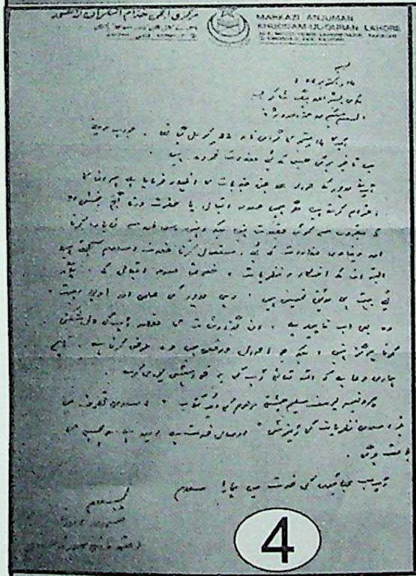

4

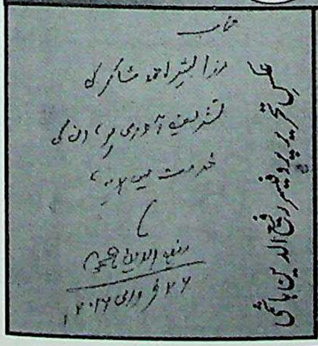

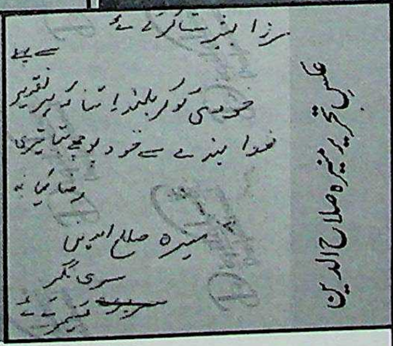

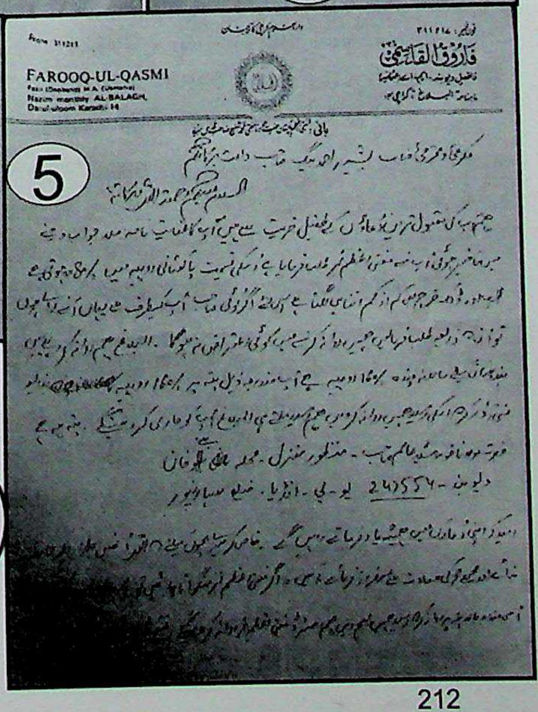

5

چند خطوط کے عکس بنام مرزا بشیر احمد شاکر

1- پروفیسر اکبر حیدری کشمیری 2- جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال

3- پروفیسر رفیع الدین ہاشمی 4- سردار اعوان 5- فاروق القاسمی

مرزا بشیر احمد شاکر تصاویر کے آئینہ میں

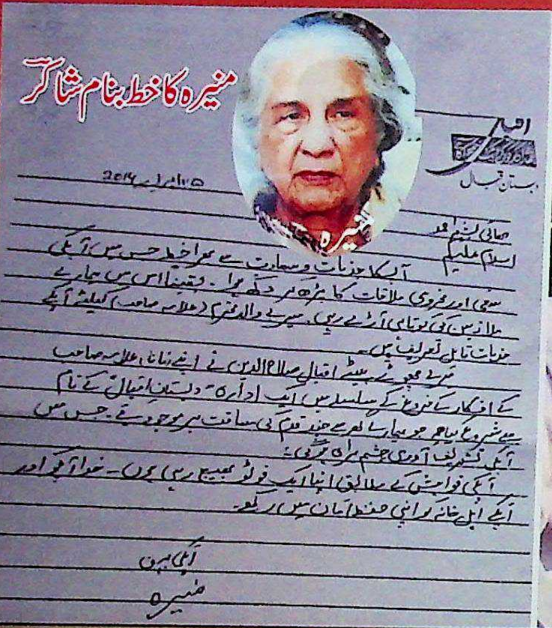

بستان اقبال

۵ اپریل ۲۰۱۶

بھائی بشیر احمد
السلام علیکم

آپ کا جذبات و عقیدت سے بھرا خط جس میں آپ کی سچی اور مخلص ملاقات کا ذکر ہے پڑھ کر دکھ ہوا۔ یقیناً اس میں ہمارے ملازمین کی کوتاہی آڑے رہی۔ میرے والد محترم (علامہ صاحب) کیلئے آپکے جذبات قابل تعریف ہیں۔

میرے محبوب بیٹے اقبال صلاح الدین نے اپنے نانا علامہ صاحب کے افکار کے فروغ کے سلسلے میں ایک ادارہ "دبستان اقبال" کے نام سے شروع کیا ہے جو ہمارے لاہور میں جدید قوم کی ثقافت پر موجود ہے۔ جس میں آپ کی تشریف آوری چشم براہ رہیگی۔

آپکی خواہش کے مطابق اپنا ایک فوٹو بھیج رہی ہوں۔ خدا آپ کو اور آپکے اہل خانہ کو اپنی حفظ امان میں رکھے۔

آپکی بہن
منیرہ

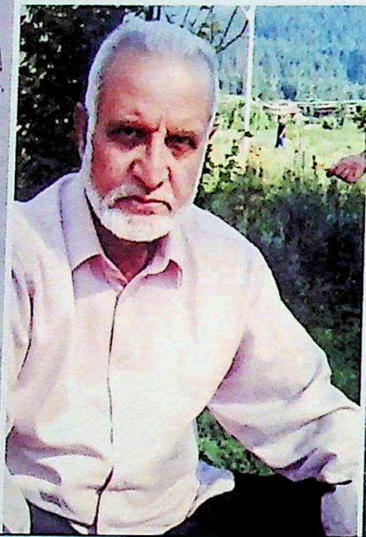

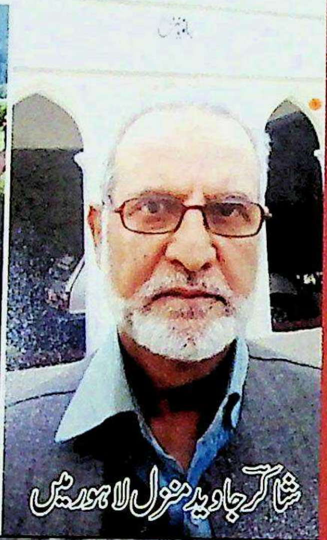

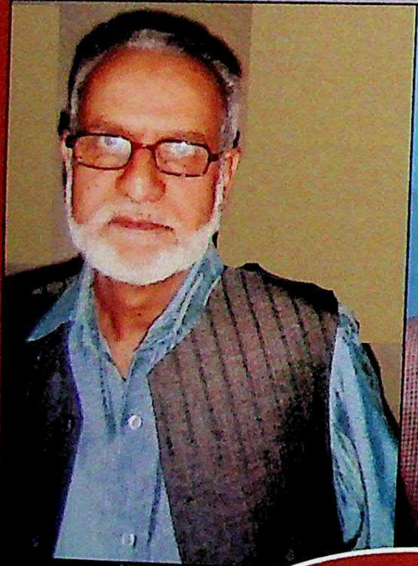

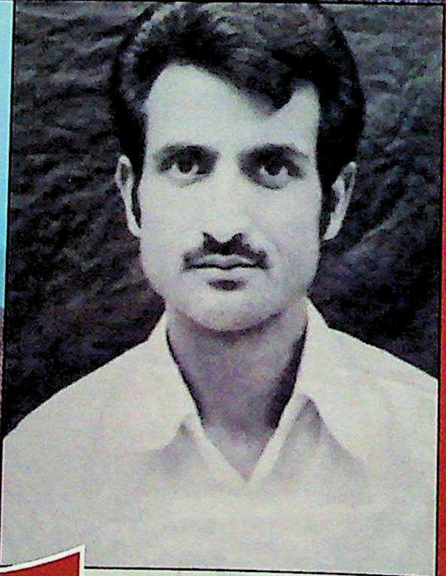

عالمِ جوانی سے عالمِ پیری تک کا سفر جاری وساری

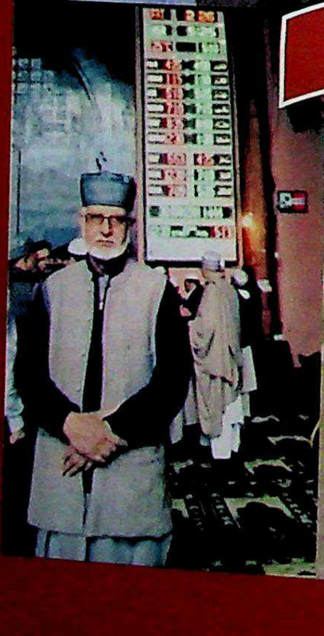

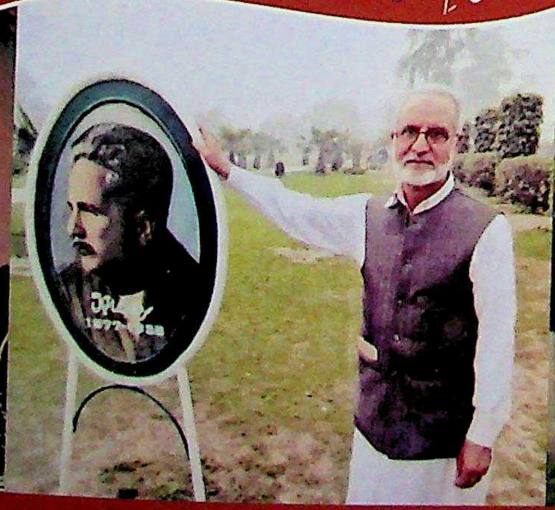

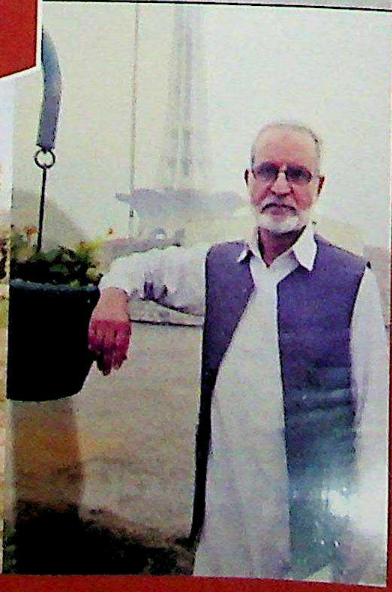

RNI No.JKURD/2006/19739 REGISTERED SK/117/2010-2012 ISSN 2395-6240

Founder: Prof. Akbar Hyderi Kashmiri

Monthly
Hakeem-Ul-Ummat

Vol:19 Issue:3,4,5 Oct.Nov.Dec.2024 Rs60/-&Rs85(Libraries)

Special Issue
Mirza Bashir Ahmad Shakir

مرزا بشیر احمد شاکر لاہور میں جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے ہمراہ ان کے دولت کدے پر

مرزا بشیر شاکر کی تصانیف وتالیفات

1۔ کتابیں ہمنشین میری
2۔ علامہ اقبالؔ کے دیس میں (سفرنامے)
3۔ مکاتیب وسفرنامے
4۔ آوازِ دل 5۔ لوہتی گلاب 6۔ پوت آلو
7۔ خط وخیریت 8۔ گلرنگ 9۔ رنگہ رویل

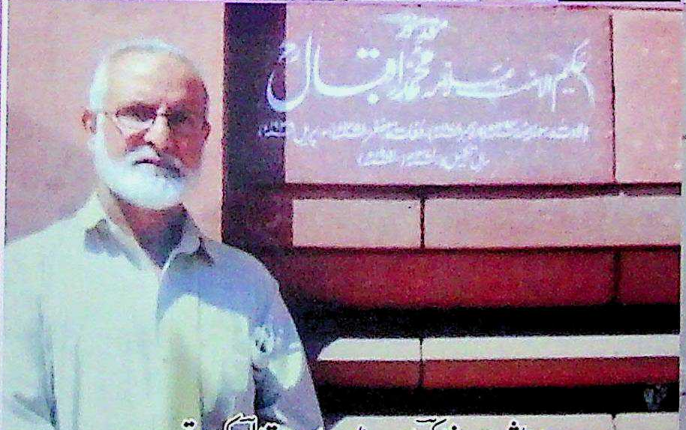
مرزا بشیر احمد شاکرؔ لاہور میں علامہ اقبالؔ کی مرقد پر

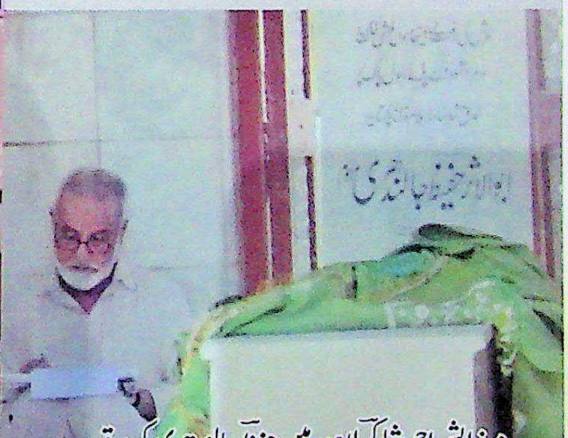
مرزا بشیر احمد شاکر لاہور میں حفیظؔ جالندھری کی مرقد پر

مرزا بشیر احمد شاکرؔ تقریر کرتے ہوئے

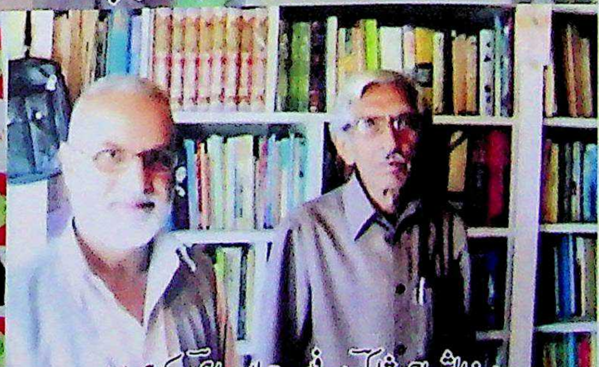
مرزا بشیر احمد شاکرؔ پروفیسر رحمان راہیؔ کے ہمراہ

Printed and Published by Dr Zafar Hyderi, on behalf of Dr Zafar Hyderi and Printed at Crown Printing Press, and Published at Hamdania Colony Bemina, Srinagar P.O.Bemina-190018,Kashmir India

Contacts: 9596267110 / 7889774940 Editor:Dr Zafar Hyderi

A/C No: Hakeem ul Ummat, J&K Bank, Br. Bemina, Srinagar: 0372010100018782